

خواجہ اور دہیز اول کیلئے ایک سوئس صدی کا مفرد نامہ

رضا دیجسٹ

JULY
2018

ماڈل: عشنا نور
میک اپ: روز بیوٹی پارلر
فونو گرافی: مہوی رضا

صيف ايدثير
صالحه محمود

ايدثير
سدى محمود جفري، بلال جفري
نأشه امير، قرار جفري
E-Mail: frazjafri@aol.com
نأشه امير، عير عيسى جفري
E-Mail: saqrchi@omiralee.net.ae
نأشه لندن، شباهه امير حان

ردان الجسط

خطواتك ما تهتم
ردان الجسط
١١٩٠ ٢٠٠٠
١٠٠٠ ١٠٠٠
١٠٠٠ ١٠٠٠

لعل ايدثير جفري



1

Medora

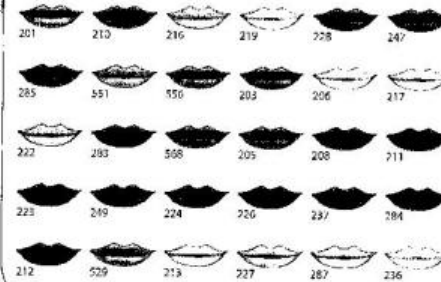
Matte Lipsticks

with matching

Nail Enamel

"MATTE
LOOK
with
LASTING
COMFORT"

AVAILABLE IN 100 SHADES,
30 Selected Shades are shown here



'Matte' never goes out of trend. Beautiful, Bold, Smooth,
Vibrant and classy lip colours. The perfect long wearing matte Formula.

MEDORA OF LONDON For all important occasions

سلسلے وار ناول

- عشق کی داستان جدا ریحانہ آفتاب ۱۵۸
زندگی پھول محبت خوشبو شازیہ مصطفیٰ ۱۸۶
بانہوں کے حصار میں قمر و شہک ۱۰

افسانے

- فرید کوٹ کا کرن نعمان ۸۰
پیار دیوانہ ہوتا ہے عائشہ مری ۸۹
ہمارے زمانے کی ایقان علی ۱۷۴
گوئی بہو سیدہ عروج ۱۸۲

مکمل ناول

- کہانی محبت کی جیا قریشی ۳۲
دل پہ محبت کی دستک قمر و شہک ۱۰۰

ناولٹ

- میری تھکن اتار دو شہلا گل سحر ۶۴
محبت زندگی ہے صنوبر شاہ ۱۴۶

جولائی ۲۰۱۸ء

جلد نمبر ۲۲ شمارہ نمبر ۷

قیمت ۷۰ روپے

www.facebook.com/rida.digest

زرد گلاب ہڈی بیکر جیسٹری

720 روپے



34535726

پبلشر وائیٹر صالہ محمود نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔
مقام اشاعت: ۱۲۹/ ڈی بلاک ۲۔ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ سوسائٹی، کراچی

انتباہ:-

ناؤ نامہ "ردا" انجسٹ میں شائع ہونے والی ہر جگہ کے حقوق بحال اور محفوظ ہیں اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل یا ڈرامہ، ڈرامائی تقاضا اور سنیے اور کسی بھی ٹی وی کی اشاعت پر ادارہ چوری کی ذمہ داری آ کر دینے کے لئے پبلشر سے اجازت لینا ضروری ہے اور "ردا" پبلشر ہے۔

مستقل سلسلے

- ردائے جنت صالہ محمود ۷
ردا کی ڈائری صدف سعد ۲۰۷
ذرا پھر سے کہنا شہلا مشائق ۲۱۷
خوشبو نورین ملک ۲۱۴
اس ماہ میں نورین ملک ۲۱۱
- شریا اقبال ۲۲۲
شہلا مشائق ۲۲۵
نورین ملک ۲۰۹
ادارہ ۲۴۰
- چکن
سنگھار
اشعار
دوستوں کے نام پیغام





قارئین! بھولی بھری یادوں کا ایک جم غفیر ہے زندگی تھا کہ دینے کا شاید ایک انداز ہے وقت کے ساتھ ساتھ درجہ نش مسائل سے گزرا نام از کم ایک مصنف کے لیے اتنا اہل نہیں ہے بس یوں جیسے پل کی کہانی ہو اور اس کو سینا صد یوں کا بیت جانا ہے۔ ہر طرف سے تھکے بارے انسان کا ایک مرکز پر سکوت ہونا ناممکن ہے۔ ممکن بنانے کے لیے جدوجہد کرنی پڑتی ہے، خود کو تھکا دینا پڑتا ہے۔ سانسیں جب ناہموار ہو جائیں تو پس دیوار کا سایہ ہی غنیمت ہوتا ہے، چاروں در میں بنا ہوا انسان کب انسان ہوا، سانس لینا بھی مشکل ہو جائے تو خیالات تتر بتر ہو جاتے ہیں، خود کو سیٹنا کھلے ہوئے در پچوں میں قفل کی تعمیر لگتی ہے۔ بات ہمارے اندرونی احساسات کی تھی جو اس وقت منتشر ہیں۔ راتوں میں بڑھتی ہوئی گرمی کا احساس ہمارے احساسات کو یکجا کر رہا ہے۔ یوں لگ رہا ہے کہ وقت پلٹ کر آ گیا ہے، کتنے چہرے جو آنکھوں میں شناسا ٹھہرے سماعت میں ان کے لفظوں کی گنگناہٹ ہے۔ رات بھی معطر معطر خوشبوؤں کا احساس ہمیں دیکھ دیکھ اپنی طرف کھینچ رہا ہے، اندھیری رات میں شمع کی روشنی میں لکھتے ہوئے تھکے ہوئے ذہن کے ساتھ:

متاع لوح قلم چھن گئی تو کیا غم
خون دل میں ڈوبی ہیں انگلیاں

تھکے ہوئے ذہن، تھکے ہوئے احساسات شاید مجروح ہو گئے ہیں ہر چند کہ موسم باد و باراں ہے، جگہ جگہ پھولوں کے میلے اور ٹھیلے لگ رہے ہیں، نظر رنگین پھولوں کو ڈھونڈتی ہوئی شب کی اس ساعت میں ہم اپنے پچھلے چہروں کو بڑھ رہے ہیں ان چہروں میں نجانے کتنے چہرے ہیں۔ سب سے قریب معتبر چہرہ میری ماں کا چہرہ ہے اور ذرا جھک کر صبح کی طرف دیکھوں تو ہادی بھائی کی مسکراتی ہوئی گہری آنکھیں شب کی تاریکی سے جھانک رہی ہوتی ہیں اور وہیں کہیں ستاروں کے جھرمٹ میں شفق کا چہرہ نمایاں ہوتا ہے۔ باپ کے ہونٹوں کا لمس اپنے بالوں میں ان کی انگلیوں کی سرسراہٹ آج بھی محسوس ہوتی ہے، یہ میرے وہ احساسات تھے جنہیں گئے دنوں میں آخری شب بند کرتی تھی۔ ماہ و سال بیت گئے دور بادلوں میں چاند بھی ڈوب رہا ہے، کرہ ارض پر پھیلتی ہوئی روشنی مدہم ستاروں کا غبار دور تک پھیلی ہوئی دھند میں زندگی کا حصار ہے اور صبح اترنے کو بے قرار ٹھہری رات کا سفر لپٹ رہا ہے دن کے اجالے کو پھیلنا زندگی کا مقدر رہے تو آپ اپنے احساسات کو ڈائری میں بند کر کے تو دیکھیں اور عمل کریں۔

سبھی لکھنے والے میری اس بات سے اتفاق کریں، لکھنے کا سفر رڈا کے ساتھ جاری رکھیں، ہم کچھ بھی نہیں پھر بھی سانس لیتے ہیں، ایمان، محبت، سچائی پر اپنی جدوجہد پر قائم رہیں۔ رڈا میں آپ کی شمولیت آپ کو ایک دن معتبر بنا دے گی۔ اس یقین کے ساتھ آپ کی پیار اور سب کے لیے دعا کہ اللہ ہماری جہتوں چاہتوں کو سلامت رکھے جہاں رہیں خوش رہیں۔ نئے لکھنے والے رابطہ رکھیں۔

آپ

رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اے آدم کے بیٹے جب تک تم مجھ سے دعا کرتے رہو گے اور مجھ سے امیدیں وابستہ رکھو گے میں تم کو معاف کرتا رہوں گا جو گناہ بھی تم نے کیے ہوں گے اور مجھے کچھ پروا نہیں (تم نے کتنے گناہ کیے) اے آدم کے بیٹے، اگر تیرے گناہ آسمان تک پہنچ جائیں پھر تم مجھ سے معافی طلب کرو تو میں تمہیں معاف کر دوں گا اور مجھے کچھ پروا نہیں۔ اے آدم کے بیٹے! اگر تم زمین کے برابر گناہوں کے ساتھ مجھ سے ملاقات کرو لیکن جب میری مجھ سے ملاقات ہو تو میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ ہو تو میری تیرے پاس ان گناہوں کے برابر بخشش کے ساتھ آؤں گا۔“ (ترمذی، عن انس)

رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ”جس آدمی نے استغفار کو لازم کر لیا اللہ تعالیٰ اس کو ہر گنہ سے نکال دیں گے اس کے ہر گنہ کو دور کر دیں گے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق عطا فرمائیں گے جہاں سے اس کو وہم و گمان بھی نہ ہوگا۔“ (ابوداؤد، ابن ماجہ، عن ابن عباس)

رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ”ایماندار آدمی جب گناہ کرتا ہے تو گناہ کا سایہ نقطہ اس کے دل پر نمودار ہو جاتا ہے اگر وہ توبہ و استغفار کرے تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر وہ مزید گناہ کرنے لگ جائے تو رنگ میں اضافہ ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ رنگ اس کے دل پر غالب آ جاتا ہے پس یہی وہ رنگ ہے جس کے بارے میں فرمان الہی ہے: ”ہرگز نہیں

بلکہ ان کے گناہوں کی وجہ سے ان کے دل رنگ آلود ہیں۔“ (ترمذی، ابن ماجہ، عن ابی ہریرہ) رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ”بلاشبہ اللہ تعالیٰ بندہ کی توبہ اس وقت تک قبول کرتے ہیں جب تک نزع کی حالت طاری نہ ہو جائے۔“ (ترمذی، ابن ماجہ، عن ابن عمر) (وضاحت: جب تک روح جسم سے نکلنے کے لیے حلق تک نہ پہنچ جائے اس وقت تک توبہ قبول ہوتی رہتی ہے اس کے بعد توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے)

رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ”بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مغرب کی سمت میں توبہ کا دروازہ بنایا ہے جس کی چوڑائی 70 سال کی مسافت کے برابر ہے وہ اس وقت تک بند نہیں ہوگا جب تک سورج مغرب سے طلوع نہ ہوگا۔“ یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی وضاحت ہے: (ترجمہ) ”جس دن تمہارے رب کی بعض نشانیاں آئیں گی تو (اس وقت) کسی نفس کو اس کا ایمان لانا فائدہ نہیں دے گا جو اس سے پہلے ایمان نہیں لایا تھا۔“ (ترمذی، ابن ماجہ، عن صفوان بن عسال)

☆ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے میرے بندو! تم سب گمراہ ہو گے جس کو میں ہدایت دوں پس تم مجھ سے ہدایت طلب کرو، میں تمہیں ہدایت عطا کروں گا۔ تم سب محتاج ہو مگر جس کو میں نواز دوں، تم مجھ سے سوال کرو میں تمہیں (نواز) دوں گا۔ تم سب گناہ گار ہو مگر جس کو میں محفوظ کروں، پس تم میں سے جو آدمی اس بات پر

Freedom®

اب مخصوص دن بھی گزاریں
خوشگوار!!!

DRY MESH TOPSHEET

Available in:
• LONG
• EXTRA LONG

Freedom
Maxi Thick

Freedom
Maxi Thick

أَسْتَغْفِرُ اللَّهَ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ
وَأَتُوبُ إِلَيْهِ

(ترجمہ) ”میں اللہ رب العزت سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہوں جس کے سوا کوئی سچا معبود نہیں وہ ہمیشہ سے زندہ اور قائم ہے اور میں اسی سے توبہ کرتا ہوں۔“ (ترمذی، ابوداؤد، عن بلال بن یسار بن یزید) رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ”اس آدمی کی (آخرت کی زندگی) نہایت عمدہ ہے جس نے اپنے اعمال میں کثرت کے ساتھ استغفار رکھا ہوا پایا۔“ (ابن ماجہ، عن عبد اللہ بن بسر)

ایک مرتبہ ہم نبی کریم ﷺ کے پاس تھے کہ ایک آدمی آیا اس پر چادر تھی اور اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی جس کو اس نے چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس نے کہا: ”اے اللہ کے رسول ﷺ میں گھنے درختوں کے پاس سے گزر رہا تھا وہاں پرندوں کے بچوں کی آوازیں سنائی دیں چنانچہ میں نے انہیں اٹھا کر اپنی چادر میں رکھ لیا۔ ان کی ماں آئی وہ میرے سر پر چکر کاٹنے لگی میں نے اس کے لیے بچوں سے کہڑا اٹھایا تو وہ آکر ان پر بیٹھ گئی پھر میں نے ان سب کو چادر میں لپیٹ لیا ابھی وہ میرے پاس ہیں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”انہیں نیچے رکھ دو۔“ چنانچہ اس نے انہیں نیچے رکھ دیا بچوں کی ماں ان سے چٹی رہی، اڑی نہیں۔ اس پر رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ”کیا تم بچوں کی والدہ کی شفقت پر جو وہ اپنے بچوں پر کر رہی ہے تجب کرتے ہو؟ اس ذات کی قسم جس نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بچوں کی والدہ سے زیادہ شفیق ہے۔“ (پھر آپ ﷺ نے فرمایا) تم ان بچوں کو ماں سمیت لے جاؤ اور انہیں وہیں رکھ دو جہاں سے تم نے ان کو اٹھایا تھا۔ چنانچہ وہ انہیں واپس لے گیا۔ (ابوداؤد، عن عامر الرازم)

یقین رکھے کہ میں گناہوں کو معاف کرنے پر قدرت رکھتا ہوں اور مجھ سے معافی طلب کرے تو میں اس کو معاف کروں گا اور مجھے کچھ پرواہ نہیں۔ اگر تمہارے اگلے پچھلے زندہ، فوت شدہ، جوان اور بوڑھے میرے بندوں میں سے سب سے زیادہ پرہیزگار ہو جائیں تو اس سے میری بادشاہت میں پھٹکے ایک پر کے برابر بھی اضافہ نہیں ہوگا اور اگر تمہارے زندہ، فوت شدہ، جوان اور بوڑھے ایک چٹل میدان میں جمع ہو جائیں اور تم میں سے ہر آدمی اپنی اپنی انتہائی آرزو کا سوال کرے اور میں تم میں سے ہر سوال کرنے والے کے سوال کو پورا کروں تو اس سے میری بادشاہت میں اتنی کمی نہیں آئے گی جس قدر کہ تم میں سے ایک آدمی سندر کے قریب سے گزرے اور اس میں سوئی ڈبوئے پھر اس کو نکال لے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں سخی ہوں۔ بزدلی اور کرم والا ہوں۔ میں جو چاہتا ہوں کرتا ہوں۔ میرا عطا کرنا کلمہ گن (ہوجا) سے ہے اور میرا عذاب بھی کلمہ گن سے ہے۔ میں جب کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرتا ہوں تو میں گن کہتا ہوں تو وہ کام ہو جاتا ہے۔“ (ترمذی، ابن ماجہ، عن ابی ذر)

ہم مجلس میں رسول کریم ﷺ کے کلمات کو شمار کرتے۔ آپ ﷺ 100 بار یہ کلمات پڑھا کرتے تھے: رَبِّ اغْفِرْ لِي وَتُبْ عَلَيَّ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُورُ (ترجمہ): ”اے میرے رب مجھے معاف فرمائیے اور میری توبہ قبول فرمائیے بلاشبہ آپ ہی توبہ قبول کرنے والے بخشنے والے ہیں۔“ (ابوداؤد، ابن ماجہ، عن ابن عمر)

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص مندرجہ ذیل کلمات کے ذریعہ اللہ رب العزت سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرے گا تو اسے ضرور معاف کر دیا جائے گا۔ اگرچہ وہ میدانِ جہاد سے بھاگا ہو ابھی کیوں نہ ہو۔“

ہاتھ لگے صابریں

”جس آرہی ہے اسی بنتے۔“ رافعہ ملک نے کافی کا ایک گہرا سپ لیتے ہوئے رانب ملک کو دیکھا جو فریش اور سچ جس بی رہا تھا ساتھ اپنے موبائل پر کچھ دیکھ رہا تھا۔ رافعہ ملک پر ایک نظر ڈال کر موبائل سائیڈ پر رکھا اور جس کا گلاس ختم کر کے خالی گلاس ٹیبل پر رکھا۔
”اچھی بات ہے یہ تو۔“ نہایت عام انداز تھا۔



”جاننا نہیں چاہیں گے وہ کیوں آرہی ہیں یہاں۔“ رافعہ ملک نے رانب ملک کے عام انداز کو بغور نوٹ کیا تھا۔
”ظاہری بات ہے وہ پہلی بار پاکستان آرہی ہے ہو سکتا ہے پاکستان دیکھنے کا شوق ہو اور ویسے بھی عموماً باہر سے لوگ ہمارے پاکستان کھوسے اٹنے آتے رہتے ہیں۔“
”آپ انجان بننے کی کوشش کر رہے ہیں یا مجھ سے کہلوانا چاہتے ہیں۔“ رافعہ ملک نے کافی کا سپ لیے بغیر کپ واپس میز پر رکھ دیا تھا۔
”میں کچھ سمجھا نہیں۔“

فقط نمبر 4



”نہیں یہاں آپ سے شادی کرنے آرہی ہیں۔“

رابع ملک کے سکون میں ابھی بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ یہ جنگ تو دو سال سے چل رہی تھی پہلے تو وہ جواز نہیں تھا اس میدان میں کوئی جنگ لڑنے کا مگر اب ایک مضبوط جواز بھی تھا اور وہ بھی۔ اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ رافعہ ملک اس بات کو نہیں مانتیں۔

”آپ کو لگتا ہے ماما جان! کل سے شادی کر کے ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہ سکیں گے۔“

”آف کورس آخر اس میں برائی کیا ہے، بھائی جان کی اکلوتی بیٹی ہے کروڑوں کی جائیداد کی مالک، دینی میں مڈل گاڑیوں کے شور و مزہ، ایک لکڑی لائف اتنی پر اپنی آخر کو ان سب کو شادی کے بعد آپ کو تو بی تنہا رہنا ہے۔“

”تو اس کا مطلب تو یہ ہوا ماما جان کہ کل مجھے پاکستان سے دینی لیے جائے گی۔“ رابع ملک نے پرسوج انداز میں رافعہ ملک کے مسکراتے چہرے کو دیکھا تھا۔ وہ شاید یہ سمجھ رہی تھیں کہ رابع ملک نیمہ رضا مند ہو گیا ہے۔

”بالکل۔“

”تو آپ کو کوئی فرق نہیں پڑے گا میرے یہاں سے چلے جانے سے۔“

”کو مجھے کیوں فرق نہیں پڑے گا اور دینی سے ہی لگتی دوڑ کہ صدیوں میں ملے آتا ہو۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ ماما جان! آپ کو واقعی کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ آپ کا تو خود ایک لائف اسٹائل ہے آپ نے تو بچپن سے ہی مجھے اپنے آپ سے دور رکھا ہے تو میری موجودگی اور غیر موجودگی سے بھلا آپ کو کیا فرق پڑے گا۔“ رابع ملک کے لب و لہجے میں دکھ ہی دکھ تھا جو رافعہ ملک کو نظر نہیں آ رہا تھا۔

”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔“ رافعہ ملک کو کچھ ناگوار لڑا تھا۔

”یہی ماما جان کہ خوشیاں اور سکون مادی اشیاء میں نہیں ملتا۔ مجھے کچی خوشیاں چاہیے میں اکیلا نہیں رہنا چاہتا میری سوچ آپ کی سوچ سے قطعی منفرد اور الگ ہے۔“ رابع ملک نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔

”اور میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں شادی کر چکا ہوں، بھلے ہی اس کے پاس لکڑی، اسٹینس، بانڈیاد، پراپرٹی نہیں ہے مگر وہ مجھے ان سب کے بغیر قبول ہے۔“

”تو اس کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ اس لڑکی نے آپ کے پاس یہ سب دیکھ کر آپ سے شادی کی ہے۔“ رافعہ ملک کے لب و لہجے میں اس لڑکی کے لیے نہایت کئی اور ناپسندیدگی محسوس ہوتی تھی۔

”مگر وہ تو یہ بھی نہیں جانتی کہ میرے پاس یہ سب کچھ ہے اور دوسری بات کہ میں نے اس سے شادی کی ہے اس کے تو علم میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ جن پیپرز پر وہ دستخط کر رہی ہے وہ نکاح نامے کے پیپرز ہیں۔“

”رابع! آپ نے سوچ لیا ہے کہ آپ مجھے کچھ دو گے مگر میرا بھی یہی آخری فیصلہ ہے کہ آپ کو ہر صورت کل سے شادی کرنی ہے۔ وہ کون لڑتی ہے مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔ وہ یہ جانتی ہے یا وہ نہیں جانتی ہے مجھے اس سے بھی کوئی سروکار نہیں ہے۔ میری فریڈز کا سرکل بہت وسیع ہے، ان میں سے کوئی بھی معمولی طبقے کی نہیں، ہر کسی کا ایک سے بڑھ کر ایک اسٹینس ہے، آپ چاہتے ہیں کہ میں کسی مڈل کلاس لڑکی کو

بہو بنا کر لے آؤں۔ میڈیا کے سامنے آپ مجھے شرمندہ کرانا چاہتے ہیں تو یہ پامیل نہیں ہے۔“

”میری سمجھ نہیں آرہا ماما جان کہ آپ کو میری خوشیاں کیوں اچھی نہیں لگتی ہیں۔“

”ہر خوشی کا تعلق میرے سے ہے اگر پیسہ ہی نہ ہو تو کیا خوشیاں پیٹ بھریں گی، آپ جو محبت محبت کا باجی رہے ہیں وہ بھی بری لگے گی جب جیب خالی ہوگی، اس لیے میں جو سوچ رہی ہوں آپ کے بھلے آپ کے فیوچر کے لیے سوچ سمجھ کر ہی کر رہی ہوں، اس لیے کل سے شادی کے لیے خود کو تیار کر لیجیے۔“ رافعہ ملک کا موڈ بد مزہ ہو گیا تھا وہ ناشتہ کیے بغیر کھڑی ہو گئیں، اسی دوران ان کا فون بھی بج اٹھا تھا۔

”آئی ایم سوسوری ماما جان! مگر یہ میری زندگی کا معاملہ ہے اور میں اپنی زندگی کے ساتھ کوئی کمپروماز نہیں کروں گا، یہ زندگی گزرے گی تو صرف انشراح کے ہی ساتھ اور کوئی میری زندگی میری چاہت و محبت کا حصہ دار نہیں سوائے انشراح کے۔“ ان براؤن کانچ میں انشراح کا ناراض ناراض سا چہرہ جھلملانے لگا تھا۔

”میری جان! آپ چاہیں کتنا ہی کیوں نہ ناراض ہوں مگر بالآخر آنا آپ کو میری ہی پناہوں میں ہے۔“ رابع ملک خود ہی اپنے آپ سے انشراح کو تصور میں رکھے بولنے لگا تھا، لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ نے احاطہ کیا ہوا تھا۔

اس نے ناشتے میں صرف جوس ہی لیا اور رافعہ ملک کی باتوں کو کوئی بھی اہمیت دینے بغیر کھڑا ہو گیا اس کا ارادہ دائم کی طرف جانے کا تھا۔

☆.....☆

”بی بی جان!“ ناشتہ ٹیبل پر لگ گیا ہے چلیں۔“

”ہاں تم چلو میں آرہی ہوں۔“

”جی بہتر۔“ نوری جانے لگی۔

”اچھا سنو انشراح سو کر اٹھ گئی۔“

”جی بی بی جان وہ اٹھ گئی ہیں آپ کے لیے خود اپنے ہاتھوں سے شاہی ٹکڑے بنانا چاہتی ہیں۔“

”ارے اس کو کہاں کام پر لگا دیا ہے چاری کی رات طبیعت خراب تھی بہت تیز بخار تھا بلاؤ اسے۔“

”جی!“

”اچھا رکھو میں خود چلتی ہوں۔“

بی بی جان جو اپنا کام کرنے جا رہی تھیں وہ بھی چھوڑے انشراح کی فکر میں باہر آئیں۔

ڈائننگ ٹیبل پر ناشتا لگ چکا تھا۔ دائم اور انابہ دونوں چیئر پر بیٹھے ہوئے تھے اور بی بی جان کا ویٹ کر رہے تھے۔ انشراح نے شاہی ٹکڑے بنا کر ٹیبل پر رکھ دیئے تھے۔

”ارے انشراح بی بی کیسی طبیعت ہے تمہاری اور پہلے تو مجھے یہ بتاؤ جب طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو ضرورت ہی کیا تھی کچن میں جانے کی۔“ بی بی جان ڈائننگ ٹیبل کے پاس چلی آئیں انشراح جو ڈائننگ ٹیبل کے پاس کھڑی تھیں۔

”بی بی جان! اب میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے میں اپنی مرضی اور خوشی سے کچن میں گئی تھی اور میرا دل بھی چاہ تھا کہ آج آپ کے لیے اپنے ہاتھوں سے شاہی ٹکڑے بناؤں اب آپ جلدی سے کھائیے اور

بتائے کہ کیسے بنے ہیں۔“
انشریح نے مسکرا کے بی بی جان کو دونوں شانوں سے تھام کر چیئر پر بٹھا دیا۔ انا بیہ بہت خوش ہوئی تھی
انشریح سے کہ اس کے بعد کوئی تو ہے جو بی بی جان کا اتنا خیال رکھتی ہے۔

”ہاں ضرور کھاؤں گی اور تم بھی بیٹھو میرے ساتھ۔“
بی بی جان نے چیئر پر بیٹھنے کے بعد انشریح کا ہاتھ پکڑ کر سامنے والی چیئر پر بیٹھا دیا۔
”ویسے بی بی جان انشریح واقعی بہت پیاری ہے۔“

”وہ تو سے اس میں کوئی شک۔“ بی بی جان نے جائزہ نظروں سے انشریح کو دیکھا تھا۔
”السلام علیکم گاڑا!“ اسی اثناء میں رابع ملک بھی آچکا تھا۔

”جیتے رہیے جناب! آپ ہی کی تھی تشریف لائیے۔“ دائم نے پراٹھے کا نوالہ توڑ کے آملیٹ سے
کھایا۔

”آج انشریح نے شاہی کھڑے بنائے ہیں، شکل اتنی عمدہ واعلیٰ ہے ذائقہ بھی لا جواب ہی ہوگا۔“ دائم
نے ذومعنی انداز میں رابع ملک کو دیکھا تھا۔

”اچھا زبردست شاہی کھڑے تو میری فیورٹ ڈش ہے اور اتفاق سے آج میں ناشتہ بھی کر کے نہیں آیا۔“
رابع ملک بنا کسی جھجک کے انشریح کے بالکل سامنے والی چیئر پر بیٹھ گیا تھا۔

”یہ آپ کا اپنا گھر ہے جیسے انا بیہ ہے ایسے ہی آپ میرے پوتے ہو۔“ بی بی جان نے خلوص دل سے کہا
تھا۔

”تھینکس بی بی جان!“

”ویسے باوے یہ شاہی کھڑے کی ڈش واقعی تمہاری فیورٹ ڈش ہے یا اتفاق سے آج ہی فیورٹ
ہوئی ہے۔“ دائم نے بولے سے سرگوشی کی تھی۔ رابع ملک اس کو گھوڑے بنا نہیں رہ سکا۔

”نہیں اصل میں ہماری فرینڈ شپ کو اتنا عرصہ ہو گیا تھا مجھے نہیں یاد پڑتا کہ تم نے یہ کچھی بھی ہوگی۔“
رابع ملک کی گھوری کو کسی خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے چھیڑا۔

”بات تو تمہاری بالکل ٹھیک ہے دائم! کیوں رابع بتاؤ۔“ انا بیہ جس کے کان انہی دونوں کی باتوں پر
لگے ہوئے تھے۔

”تمہیں کتنی بار منع کیا ہے تاکہ مجھے ”تم“ سے مخاطب مت کیا کرو مگر مجال ہے جو کان پر جوں بھی ریگ
جائے۔“ دائم نے انا بیہ کو تپ کر دیکھا تھا۔

”چلو بھی تمہارے خان صاحب کی غیرت پھر سے جاگ اٹھی تم لوگ تو اپنا معاملہ نمٹاؤ میں جب تک
شاہی کھڑے سے انصاف کروں۔“ رابع نے چٹکلا چھوڑا اور رخ ناشتہ کرتی انشریح کی جانب موڑا۔

”انشریح! ذرا یہ شاہی کھڑے کی ڈش اٹھا کے دو۔“ نہایت ہی بے تکلفی سے اس نے انشریح کو مخاطب
کیا تھا جیسے میاں بیوی والے بہت گہرے مراسم ہوں۔

انشریح کو تو اس کا یہاں آنا ہی سخت زہر لگ رہا تھا اوپر سے یوں بے تکلفی سے پکارنا جان جلا گیا۔
انشریح نے گھور کر رابع ملک کو دیکھا تھا جو مسکرا کے اسی کو دیکھ رہا تھا۔

”انشریح بیٹی! رابع کو شاہی کھڑے کی ڈش تھماؤ۔“ بی بی جان ہر بات سے یکسر انجان رابع ملک کا
پہلیا ہوا ہاتھ دیکھنے لگی تھیں۔

”جی بی بی جان!“ انشریح نے شاہی کھڑے کی ڈش پتے ہوئے اٹھا کے رابع ملک کے خالی ہاتھ پر
رکھی۔

”تھینکس۔“ رابع ملک نے مسکراتے ہوئے انشریح کے پتے بھنے چہرے کو دیکھا اور شاہی کھڑے
سے انصاف کرنے لگا تھا۔

”انا بیہ بیٹا!“

”جی بی بی جان!“ چائے کا آخری سپ لے کر خالی کپ ٹیبل پر رکھا۔ بی بی جان کے پکارنے پر انا بیہ
نے دیکھا۔

”آج میرا ارادہ ذرا سیدہ کی طرف جانے کا ہے اگر چاہو تو چلو تم بھی۔“

”نہیں بی بی جان! میرا موڈ نہیں ہے آپ سیدہ آنٹی کو میرا سلام کہیے گا بس۔“

”چلو ٹھیک ہے، میں انشریح کو لے جاتی ہوں۔“

رابع ملک کا آج سارا دن ہمیں گزارنے کا ارادہ تھا آج ویسے ہی سنڈے تھا تو آفس نہیں جانا تھا،
اس لیے سوچ کے آیا تھا کہ وہ انا بیہ کی طرف جائے گا اور جب زندگی ہمیں ہے تو اکیلے کیوں رہے مگر انشریح

کے جانے پر اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ اس نے انشریح کے برابر میں بیٹھی انا بیہ کے پاؤں پر اپنے جوتے کی
ٹوک ماری۔ انا بیہ ”سی“ کر کے رہ گئی۔ دایم نے انا بیہ کا چہرہ دیکھا۔ وہ رابع ملک کو دیکھ رہی تھی اور جو کچھ

رابع ملک نے اشارے میں کہا وہ سمجھ گئی تھی۔
”ارے نہیں بی بی جان! آپ انشریح کو لے کر مت جائیے گا۔“

”وہ کس لیے؟“ بی بی جان نے جہاں سوالیہ نظروں سے انا بیہ کو دیکھا تھا وہیں انشریح کو بھی سمجھ میں
نہیں آیا کہ وہ کیوں منع کر رہی ہے جب کہ وہ واقعی میں بی بی جان کے ساتھ جانا چاہتی تھی وجہ سامنے بیٹھا

رابع ملک تھا جو وقفے وقفے سے عجیب نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
”اصل میں بی بی جان کینیڈا اور دبئی سے میں بہت سی شاپنگ کر کے آئی ہوں اب مجھے انشریح کے

بارے میں کچھ علم نہیں تھا لیکن میں انشریح کو وہ ساری شاپنگ دکھانا چاہتی ہوں، اس میں سے اگر انشریح
کو کچھ بھی پسند آئے گا وہ رکھ لے گی۔“ انا بیہ نے بی بی جان کو نرمی سے دیکھنے کے بعد برابر میں بیٹھی انشریح

کو پسندیدگی بھری نظروں سے دیکھا تھا۔
”یہ بھی تم ٹھیک کہہ رہی ہو، چلو پھریں کرتی ہوں میں نوری کو اپنے ساتھ لے جاتی ہوں۔“ بی بی جان

کو انا بیہ کی بات سے بہت خوشی ہوئی تھی وہ کھڑی ہو گئیں۔
”مگر بی بی جان میرے پاس تو پہلے ہی بہت کچھ ہے ابھی بچھلے ہفتے بھی آپ نے بہت ساری شاپنگ

کرائی تھی۔“ اس کی توجہ سے جان سولی پر انگ گئی تھی۔
”انشریح! وہ سب تو بی بی جان نے دلایا تھا اور یہ سب میں گفٹ کروں گی۔“
”مگر انا بیہ آئی!“

”اب کوئی سوال و جواب نہیں چلو تم میرے ساتھ چلو نوری۔“ انشراح کا ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ ساتھ ہی ملازمہ کو بھی آواز لگا لی اس دوران بی بی جان اپنے روم میں تیار ہونے جا چکی تھیں۔

”جی جی بی جی!“ نوری فوراً حاضر ہوئی۔

”تم یوں کرو جلدی سے یہ سب سیٹھو بھری بی بی جان کے ساتھ چلی جانا۔“

”جی ٹھیک ہے۔“

”کب کا بھوکا ہے۔“

دائم تو کھڑا ہو چکا تھا مگر رانب ملک شاہی کلوے کا آخری بائٹ کھا رہا تھا۔

”واقعی بہت لذیذ بنے ہیں دل چاہ رہا ہے کہ بنانے والی کے ہاتھ چوم لیے جائیں۔“ دائم نے تیزی سے رانب ملک کی بات کاٹ کر اپنی راگ الاپی تھی۔

”انا بیہ کی محبت نے بہت رگڑ دیا ہے تجھے۔“

”لو ایک تو دل کی بات کہو اور پر سے ہمیں ہی الزام۔“ وہ ہنسی بکھیرتا ڈرائنگ روم میں ساتھ آیا تھا۔

”ویسے رانب ایک بات کہوں۔“ دائم آرام دہ صوفے پر براجمان ہوا تھا اس کے سائیڈ والے صوفے پر رانب ملک بیٹھ گیا تھا۔

”ہوں..... بول.....“

”تجھے نہیں لگتا وہ ابھی بہت چھوٹی ہے۔“ دائم کا اشارہ وہ سمجھ گیا تھا۔

”سو واٹ جب دو، تین بے بی ہوں گے تو سب میٹ ہو جائے گا اور میں نے تو سوچا ہے کہ مجھے اپنا گھر

بھرا بھرا چاہیے کم از کم چھ سات تو بچے ہونے چاہئیں۔ وہ شریاب و لہجے میں کہتا ہوا ایک آنکھ دبا کر بولا۔

”تو میری جان ان چھ سات بچوں کو دنیا میں لانے کے لیے تجھے اپنی کزن بجل سے بھی شادی کرنی ہو

گی۔“

”جی نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں پڑے گی میری یہ خواہش انشراح ہی پوری کر لے گی۔“ پر مزاح

انداز تھا، عنابی گداز لبوں پر شریک مسکرا ہٹ۔

”ایک بات بتا۔“ دائم نے رخ بدلا تھا۔

”جی۔“

”گنتے ڈھیوں کی فوج اس دنیا سے گئی تھی جب تو آیا ہے۔“

”یار! یہ تو اسی اسپتال جا کر پتا کرنا پڑے گا جہاں میں پیدا ہوا تھا۔“ دائم نے جتنے طنزیہ انداز میں پوچھا

تھا رانب ملک نے بھی اسی سنجیدگی سے جواب دیا جیسے واقعی میں کوئی نہایت ہی سنجیدہ گفتگو چل رہی ہو۔

”واقعی میں بہت بے غیرت ہو گیا ہے نکاح کے بعد یہ حال ہے تو جب محترمہ مکمل طور پر تیری دسترس

میں آجائے گی تو کیا ہو گیا۔“

”فکر مت کر تیری طرح حال نہیں ہوگا جو شاید ابھی بھی انا بیہ کو آئی لو یو بولنے میں جھنجکھاتا ہے۔“ وہ

بولے سے ہنس دیا تھا۔

”اب تو کہاں چلا۔“ رانب ملک کو اٹھتا دیکھ دائم نے سوال کیا۔

”اپنی زوجہ محترمہ سے بات کرنے، سچی وہ مان جائے تو ایک لمحہ نہ لگاؤں اسے یہاں سے لے جانے۔“

”ہوں۔“

”پہل تو جب تک فی وی دیکھ میں انشراح سے مل کر آتا ہوں اور ہاں دو پہر کے لنگے میں پڑا اور انشراح

کا فیورٹ کچھ آرڈر کر لینا۔“

”اور یہ کچھ فیورٹ انشراح کا ہوگا وہ یقیناً تجھے بتائے گی۔“ دائم نے مسکراتے ہوئے دیکھا۔

”وہی تو پتا کرنے جا رہا ہوں میری جان۔“ اور وہ رکائیں انا بیہ کے بیڈ روم کی جانب بڑھ گیا۔ دائم

صرف مسکراتی نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔

”اچھا تو تم مجھے یہ بتاؤ تم نے اس رات رانب کو اپنا شوہر کہہ کر کیوں مخاطب کیا تھا۔“ انا بیہ نے انشراح

سے پوچھا تھا۔ رانب ملک جو اندر آ رہا تھا وہیں اس کے قدم رک گئے وہ بھی شاید جانا چاہتا تھا۔

”اصل میں انا بیہ آئی! ہمارے گاؤں میں جب کسی لڑکی کی شادی ہو جاتی ہے تو چھیڑنا تو دور کوئی اس

لڑکی کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ میں یہاں شہر پہلی بار آئی ہوں میں اس دن ٹرین سے اتری تو وہ آدمی

میرے پیچھے لگ گئے تھے اٹنے سیدھے الفاظ بول رہے تھے مجھے چھپر رہے تھے، میں ان سے پیچھا چھڑانے

کے لیے بھاگی تو ان سے ٹکرائی میں بھی یہاں کراچی میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے، جیسی میں نے بنا سوچے سمجھے

انہیں اپنا شوہر کہا تھا۔

رانب ملک اس کی معصومیت کو دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ پیاری سی گلابی آنکھوں والی میدے کی طرح

سفید رنگت والی پہلی ہی نظر میں اس کا سب کچھ لے لی تھی اب تو معاملہ دل کا تھا محبت و عشق کا تھا تو کیوں

ناں وہ اس کی زندگی اس کے وجود کا حصہ بنتی۔

”اوہ مائی گاڈ! تم جتنی معصوم اور سادہ ہو، یقین کرو یہ تمہاری امی کی کوئی بیٹی کا صلہ ہی ہے جو تم یہاں پر

ہو۔“ انا بیہ نے بے اختیار ہی اس کو اپنے سے لگا کر اس کے رخسار پر بوسہ لیا تھا۔ انشراح جھجک کر رہ گئی۔

گھنیری پکوں کی بازو دیکھتے عارض پر سجدہ ریز ہو گئی، اس کے یوں شرمانے پر انا بیہ بولنے سے ہنس دی۔

”انشراح! تمہیں پتا ہے اس دن تم نے جن کاغذات بردست خط کیے تھے وہ کون سے تھے۔“

”جی انہوں نے کہا تھا کہ میں اگر یہاں دستخط کروں گی تو مجھے کوئی بھی غنڈہ تنگ نہیں کرے گا چھیڑے

گا نہیں۔“

”بے وقوف لڑکی! وہ کاغذات تمہارے اور رانب کے نکاح نامے کے کاغذات تھے تمہارا اس رات

رانب سے نکاح ہوا ہے تم رانب کی منکوحہ ہو۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں اور انا بیہ آپ آئی آپ ان کا ذکر مت کریں وہ مجھے بالکل اچھے نہیں لگتے۔“

انشراح نے برا سنا منہ بنایا تھا۔

”ارے وہ کیوں؟“ انا بیہ نے حیران ہو کر دیکھا تھا، پیچھے کھڑے رانب ملک کی بھی کچھ ایسی ہی

پوچش تھی۔

انشراح خاموش رہی اور اس کی خاموشی کو انا بیہ نے بہت گہرائی سے نوٹس کیا تھا۔

”انشراح! بتاؤ نا۔“ انا بیہ نے اس کے دونوں موی ہاتھ تھام لیے تھے۔

”وہ میرا ہاتھ پکڑتے ہیں اور..... اور..... مجھے ادھر ادھر سے بھی ہاتھ لگاتے ہیں۔“

انشراح کا کہا گیا روانی میں جملہ جہاں انا بیہ کو کھلکھلانے پر مجبور کر گیا تھا، وہیں رائب ملک بھی پرسکون ہو گیا تھا۔

”ماما جان! میرا انتخاب غلط نہیں ہے یہ ہی وہ لڑکی ہے جو میری محبت کے رنگ میں ڈھل گئی، جو میری سونی و ویران زندگی میں خوشیاں بکھرے گی آپ کی ہوسکل نہیں انشراح بنے گی۔“ رائب ملک کی پرسوج نظریں اور پرسوج چہرے پر انا بیہ کی نظر اچانک ہی پڑی تھی، اس کی رگِ ظرافت پوری قوت سے جاگی تھی۔

”کہاں کہاں ہاتھ لگاتے ہیں، مجھے بتاؤ میں ڈانٹوں گی انہیں، بتاؤ۔“

”وہ.....“ اس سے پہلے کہ انشراح واقعی سچائی اگل دیتی رائب ملک نے اندر قدم دھرے تھے۔

”وہ تو ہے ہی بے وقوف مگر انا بیہ! تم سے مجھے قطعی یہ امید نہیں تھی۔“ رائب ملک نے اندر پوری طرح قدم دھرے تھے اور چلتا ہوا ان کے دونوں کے پاس آٹھرا تھا۔

”تمہارے خاں نے بہت چھوٹ دے رکھی ہے تمہیں۔“ رائب ملک نے انا بیہ کو گھورا جس کے چہرے پر زمانے بھر کی شرارت رقصاں تھیں۔

”بہت غلط نام پر انٹری ماری ہے رائب تم نے۔“ انا بیہ ہنستی ہوئی کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ انشراح بھی کھڑی ہوئی بلکہ رائب ملک کی موجودگی نے اسے جھراہٹ کا شکار کر دیا تھا۔

شہر میں آخر اتنے خراب حالات سے گزر کر اس کی ضدی، جنگجو طبیعت، بدمزاجی، چڑچڑاہٹ، بات بات پر مارنا مرنے والی فطرت تو جیسے بہت اندر جا سوئی تھی مگر رائب ملک کی وجہ سے لگتا تھا وہ ساری فطرت پوری انگڑائی سے جاگ رہی ہو، رائب ملک نے سچ معنوں میں اس کو چڑا دیا تھا۔ زچ کر دیا تھا۔

”میں نے بالکل سچ وقت پر انٹری ماری ہے ورنہ تو چھکا پھو کا سب مارنے کے موڈ میں تھیں۔“

انا بیہ ایک بار پھر زور سے تپتہ لگا کے ہنسی تھی۔

”سچی رائب! مجھے بہت مزہ آ رہا ہے، تمہاری لائف تو ہم سے زیادہ مزیدار مڑنے والی ہے۔“ ہنسی نہ روکنے کی تو جیسے انا بیہ نے قسم کھائی ہوئی تھی۔

”یہ سب تمہاری وجہ سے ہے، بے وقوف لڑکی میں نہیں آتا تو یقیناً سارے سیرٹ کا بھانڈا پھوڑنے والی تھیں۔“

انشراح کے بٹے انا بیہ کی ذومعنی باتوں کی الف ب تک سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ کیا بول رہی تھی سب اس کے سر سے گزر رہا تھا مگر رائب ملک کی بات نے جیسے اس کو ہر تپا سا کا کر رکھا دیا تھا۔

”ہونہہ۔“ وہ صرف ہونہہ کرتی وہاں سے تیزی سے نکلی تھی۔

”یا اللہ رحم!“

وہ غم اور غصے کی شدت سے وہ متنتاتی ہوئی تیزی سے کمرے سے نکلنے لگی تھی کہ سامنے سے آتا دائم یکدم سے رکھا تھا اور ہاتھ کے اشارے سے انشراح کو بھی روکنے کو کہا۔ غصے کی شدت سے اس کا سرخ انگارہ چہرہ بتا رہا تھا کہ اندر کا ماحول اچھا نہیں رہا ہوگا۔

”سب خیریت ہے۔“

مر انشراح نے کوئی جواب نہیں دیا اور سائیڈ سے نکلتی چلی گئی تھی۔ دائم نے ایک نظر اس کو جاتا دیکھا اور اندر کمرے میں انتر ہو گیا۔

”خیریت تو ہے انشراح بہت غصے میں گئی ہے۔“ دائم نے رائب ملک کا تپا تپا سا چہرہ دیکھنے کے بعد انا بیہ کا کھلکھلا تا چہرہ دیکھا۔

”یہ تو تم اپنی بیوی سے ہی پوچھو۔“ رائب ملک کا انا بیہ کو یوں گھورنا مطلب انا بیہ نے رائب ملک کی ہنستی رگ پر پیر رکھ دیا تھا۔

ہنسی کا ایک اور جاندار نوارہ پھوٹا تھا۔

”کتنی مرتبہ کہا ہے یوں بے ہودگی کی طرح مت ہنسا کرو، میں یہاں تمہاری ہنسی کی آواز سن کر ہی آیا ہوں پورے گھر میں تمہاری ہنسی کی کھنک کی گونج ہے۔“ دائم سب کچھ بھولے انا بیہ کی کلاس لینے لگا تھا۔

”او کے، او کے نہیں ہنسی رہی۔“ انا بیہ نے اپنے لبوں پر دونوں ہاتھ رکھ لیے۔ مگر ان دونوں کے چہرے دیکھ کر پھر بے ہنسی ہو گئی۔

”یہ نہیں سدھرے گی، میں ہی سٹو، میں تو چلا۔“ رائب ملک نے دائم کے شانے پر ہاتھ مارا اور وہاں سے نکلتا چلا گیا تھا۔ رائب ملک کے جانے کے بعد دائم، انا بیہ کی سمت بڑھا تھا۔

☆.....☆

”اے لڑکی ادھر آ۔“

”جی!“

اربش نے حویلی کی ساری صفائی کر لی تھی۔ کچن صاف کر دیا تھا۔ دھونے جا رہی تھی کہ بڑے سے دلان میں کرسی ڈالے زبیدہ جہاں براجمان تھیں، اربش ان کے کمرے کا تیزی سے آئی اور سر کو جھکائے کھڑی ہو گئی۔

”وہ لان میں تجھے درخت دکھائی دے رہا ہے۔“ جہاں زبیدہ کے اشارے پر اربش نے لان پر نظر ڈالی ایک لمحے کو تو اس کی آنکھیں چندھیا گئیں، اس پچھانی دھوپ میں وہ بمشکل وہ درخت دیکھ پائی تھی۔

”جی بڑی سرکار۔“

”تو جاو اس درخت پر سے وہ چھال توڑ کے لا مجھے ایک خاص جڑی بوٹی بنانی ہے۔“

زبیدہ جہاں کے پیچھے کھڑی رحمت نے حیران مگر دکھ بھری نظروں سے دیکھا تھا۔

”جی بہتر۔“

اربش کو نہ کرنے اور نہ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ لان کی طرف بڑھی تھی ہر احساس سے عاری، خود کو سخت جان بنائے وہ درخت کے پاس آ کھڑی ہوئی، آج تو بد قسمتی پوری طرح عروج پر تھی سورج کی دہکتی تپش سے جیسے اس کا روم روم جھلس گیا ہو، چلچلیاں دھوپ میں وہ کھڑی اتنے بڑے گھنے تناور درخت کو سر اٹھا کر دیکھنے لگی اس کو درخت پر چڑھنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا مگر حالات نے اس کو یہ بھی کرنے پر مجبور کر دیا تھا، چپل اتارے وہ اس سڑی دوپہر میں گرم لودیتے درخت پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

ایک بار..... دوبار.....

تیسری بار بھی اس کا پاؤں پھسلا تھا، گرمی اور دھوپ میں کھڑی وہ پوری پسینے میں شرابور ہو رہی تھی، آج تو جیسے ہوا کا نام و نشان بھی نہیں تھا، اپنی بد قسمت زندگی پر خاموش ماتم کنیاں بالآخر وہ پھر سے چڑھنے کی کوشش کرنے لگی تھی اور کامیاب بھی ہو گئی تھی، آرام آرام سے آہستگی سے سنبھل سنبھل کر وہ اوپر تک پہنچ ہی گئی۔ ہاتھ بڑھا کر چھال توڑنے لگی اس پتلی دھوپ میں اس نے بہت سارے چھال توڑ توڑ کے نیچے پھینکے تھے۔ ایک آخری چھال رہ گیا تھا وہ تھوڑا دور تھا اس نازک سی شاخ پر مگر حکم یہی تھا کہ ایک بھی چھال درخت پر رہنا نہیں چاہیے۔ اس نے ہاتھ بڑھایا مگر اس کی قسمت کی طرح اس نازک ٹہنی نے بھی دغا دے دیا تھا۔ وہ اس کمزور نازک سی شاخ کی طرح خود بھی توازن پر قائم نہیں رکھ پائی اور اس پتے جھلنے فرش پر آ رہی آخری سوچ تو یہی تھی کہ اب جو آنکھ کھلے گی تو قبر میں ہی کھلے گی۔ شاید آج ہر تکلیف سے درد سے آزاد ہو جائے گی آج اس پل زندگی سے چھٹکارا مل جائے گا۔ مگر ابھی سانسوں کو یہ گوارہ نہیں ابھی اس روح کو اس جسم کو مزید اذیت مزید تڑپ برداشت کرنی ہے۔ اس نے جب آنکھ کھولی تو وہ اس پتے جھلنے فرش پر نہیں بلکہ سالار شاہ کی مضبوط آنٹی ہانہوں کی گرفت میں تھی۔

اور شاید اتنی جلد اسے فرش پر نہیں ہوتی گرنے سے جس کی کھولن سے اس کا روم روم جھلس جاتا، جتنی تکلیف تڑپ جلن اس وقت سالار شاہ کی ہانہوں میں شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

سالار شاہ نے چہرہ اوپر درخت کی جانب اٹھایا اور پھر اپنی ہانہوں میں سے گھیرائے اس وجود کو دکھا تھا، اس چہرے پر خوف و ڈر کے واضح رنگ تھے۔ وہ سیاہ نین سبے ہوئے تھے جیسے زندگی کی بس چند ہی سانسیں باقی بچی ہوں۔ اربش کے برعکس سالار شاہ کے چہرے پر جو سکون تھا، دل میں ٹھنڈی میٹھی بارش کی چند بوندیں گری تھیں اس کا اندازہ بھلا کون کر سکتا تھا مگر سالار شاہ کو مزید سکون چاہیے تھا، ان گداز عنابی لیوں پر ایک پراسراری مسکراہٹ تھی ان براؤن کانچ میں ایک عجیب سی چمک تھی۔

دور کھڑی زبیدہ جہاں کو یہ منظر سخت ناگوار گزار رہا تھا کیا ضرورت تھی سالار شاہ کو اس کو بچانے کی گرنے دینا یہی تو وہ چاہتی تھیں جب کہ پیچھے کھڑی رحمت کو اندر ہی اندر بہت سکون ملا تھا کہ سالار شاہ کو تھوڑی سی پرواہ ہوئی اربش کی۔ سالار شاہ مضبوط قدم دھرتا ہوا اربش کو اٹھائے آگے بڑھنے لگا تھا۔

”آج بہت شدید گرمی ہے بے بے اور آپ نے اس کو جھلسی پتلی دھوپ میں ننگے پاؤں صحن میں بھیج دیا ہے چہ چہ۔“ سالار شاہ اس طرح بولا جیسے بہت تکلیف ہوئی ہو اس کو، اس کی یہ فکر مندی دیکھ کر زبیدہ جہاں کے چہرے پر غصے کی لالی سی بکھر نے لگی تھی۔

”دیکھیں تو ذرا اس کے پیر میں جلن ہو رہی ہوگی۔“ اس نے اربش کے سرخ پاؤں دیکھے تھے۔ اربش کی تو وہ حالت تھی کہ کالو تو بدن میں خون کا ایک قطرہ نہیں۔ سالار شاہ جیسے ظالم و جاہل شخص کے منہ سے ایسی باتیں قیامت کی ہی تو نشانی تھیں۔

”رحمت!“

”جی سائیں!“ رحمت تو خوشی کے مارے جلدی سے سالار شاہ کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی۔

”جا اور ایک بڑے سے ٹپ میں گرم پانی لے کر آ۔“

”جی.....!“ رحمت کی تو ہونق سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

جب کہ زبیدہ جہاں کے چہرے پر جو غصے کی لالی بکھری ہوئی تھی ان میں کی آنے لگی تھی۔

”سانہیں تو نے۔“ سالار شاہ نے بڑی بڑی سرخ آنکھوں سے رحمت کو گھورا۔

”جی سائیں۔“ رحمت پل لگائے تیزی سے اندر بھاگی اور کوئی ایک منٹ میں سالار شاہ کے حکم کی تعمیل کی تھی۔

سالار شاہ نے اس گرم پانی میں اربش کو کھڑا کر دیا تھا۔

”سی..... اللہ..... رحم.....“

شدید گرمی اوپر سے اس کا پیر جھلے ہوئے پھر اس کے اوپر اس گرم پانی میں اس کو کھڑا کر دیا گیا۔ یہ ظلم کی انتہا نہیں تو اور کیا تھی۔

اربش کی روح تک بلبلانہ تھی وہ جو سبھی تھی کہ ہر احساس سے عاری ہو گئی تھی غلط سوچتی تھی اس کا رواں رواں تڑپ اٹھا تھا۔ ان سیاہ نین سے آنسو کی ایک لڑی نکل گئی تھی۔

زبیدہ جہاں زور سے ہنسی ہوئی آگے بڑھی اور سالار شاہ کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

”تم واقعی میرے لیے ہو مجھے یقین ہے میرا بدلہ میرا انتقام رانیکاں نہیں جائے گا۔“ سالار شاہ زبیدہ جہاں کو اپنے بازو کے گھیرنے میں لے لیا۔

”بہت گرمی ہے چلیں اسے میں بیٹھتے ہیں۔“ جیت کی فتح کی مسکراہٹ اربش کے تکلیف زدہ چہرے پر ڈالتا اندر کی سمت بڑھنے لگا تھا۔

”اربش۔“

انشراح بہت گہری نیند سے جاگی تھی اور زور سے اس کے اس کا روم روم کانپ اٹھا تھا، وہ اٹھ کر بیٹھی اور ہاتھ بڑھا کر جیسے اربش کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”کیا ہوا انشراح کوئی برا خوب دیکھ لیا۔“

نہایت قریب سے آتی اس آواز پر انشراح نے پلٹ کر دیکھا تھا، جہاں راج ملک لیلی سے بیٹھا تھا، انشراح کی نیند اور خوف و ہراس کا سارا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔

”آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔“ انشراح تیزی سے بیڈ سے نیچے اتری تھی اس کی نیند سے ٹوٹی گلابی آنکھوں میں غصہ تھا ناپسندیدگی تھی۔

مگر راج ملک کو وہ نیند سے ٹوٹی گلابی آنکھوں میں اپنا سب کچھ ڈالتا محسوس ہوا تھا، اپنا دل اس کی طرف کھینچتا محسوس ہوا اور وہ بغیر کچھ کہے بیڈ سے اترا دل و قدم خود بخود اس کی جانب بڑھنے لگے تھے۔ وہ ان آنکھوں کو قریب سے دیکھنا چاہتا تھا، ان میں خود کو ہمیشہ کے لیے قید کر لینا چاہتا تھا، اپنے نام کی مہر لیوں سے ثبت کرنا چاہتا تھا۔

”دیکھیے آپ یہاں سے چلیں.....“

”دشش.....“ راج ملک نے اس کے ہلتے لیوں پر اپنی شہادت کی انگلی رکھ دی تھی۔

”بس خاموش رہو، سنو محسوس کرو ان لمحوں کو ان پل کو..... اس احساس کو جو صرف ہمارا ہے۔“ وہ بہت کچھ اس کو جلتا نا چاہتا تھا، اشاروں میں سمجھانا چاہتا تھا، اپنی محبت اپنے ساتھ کا یقین دلانا چاہتا تھا۔

مگر اٹھارہ سالہ انشراح ان باتوں، اس احساس، اس محبت سے بہت دور تھی اس کا ذہن ویسے ہی اپنے ماضی میں الجھا رہتا تھا اپنوں کی یادوں میں بھٹکتا رہتا تھا، تو بھلا کہاں محبت و احساس کی گنجائش نکلتی تھی، وہ تو انجان تھی اس نے اور اچانک بننے والے رشتے سے۔ وہ نہیں جانتی تھی نہیں مانتی تھی اس رشتے کو جس کا احساس رابع ملک اس کو دلانا تھا، اس کی اندر کی دنیا تو ویسے ہی جھٹکوں اور زلزلوں کی زد میں آچکی تھی اور پتا نہیں یہ رابع ملک مزید کیوں اس میں ہلچل مچانے آگیا تھا۔

”مجھے نہیں پتا آپ کیا کہنا چاہتے ہیں بلکہ سچ تو یہ بھی ہے کہ میں کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتی، چھوڑیں مجھے۔“ انشراح زچہ ہوئی، جیسی اس کا ہاتھ بھٹکتا آگے بڑھنے ہی لگی کہ رابع ملک نے اس کا بازو تھام کر ایک جھٹکے سے خود سے قریب تر کیا تھا، وہ نازک سی جان خود کو سنبھال نہیں سکی اور ایک جھٹکے سے اس کے سینے سے لگی تھی، رابع ملک نے اس کی ناک مرمریں مگر پر اپنے بازو کا حصار باندھ کر اس کو مزید اپنے سے قریب کر لیا تھا کہ معمولی سا بھی اچ بھر کا فاصلہ نہ رہا تھا، رابع ملک کے گرم سانسوں کے تھپڑے انشراح کا پورا وجود جھلسا گئے تھے۔

”ضروری نہیں محبت کے احساس کو محسوس کرنے کے لیے سمجھا جائے، نکاح کے تین بول نے میری پوری دنیا الٹ دی ہے دل تمہاری ہی جانب کھینچتا ہے، تم سے ہی ہمارے گزرتے رہے تمہارے ساتھ پل بل گزرا وقت امر کرنا چاہتا ہے، مگر تم یہ سب نہیں سمجھنا چاہتی ہو، لیکن کوئی بات نہیں، آج نہیں تو کل تمہیں یقین ہو جائے گا میری محبت و چاہت کا میرے عشق و جنون کا۔“

”خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑیں آپ نہیں جانتے کچھ بھی میرے بارے میں۔“ وہ کسی بھی طرح اس سے آزادی چاہتی تھی، اس سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔

”کیوں چھوڑ دوں تمہارا پیچھا تمہیں کیا لگتا ہے یہ سب اتنا آسان ہے انشراح! اسی بات کو سمجھو اور جانو بلکہ اپنے دل و دماغ میں بھی بٹھا لو کہ تم رابع ملک کی بیوی ہو، پہلے تم کیا تھیں تمہارا ماضی کیا تھا مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہم اپنی نئی زندگی کی شروعات بہت ساری خوشیوں سے کریں گے۔“

”نہیں۔“ انشراح اس کی باتوں سے ڈر گئی تھی اور خود کو اس کے بازوؤں سے چھڑانے کی بھرپور مزاحمت کر رہی تھی۔

”بھئی بھی نہیں مجھے آپ کے ساتھ زندگی نہیں گزارنی۔ چھوڑیں مجھے۔“

”اوں..... تو اس کا مطلب اتنی آسانی سے نہیں مانو گی، اوں کے تمہیں منانے کا ایک ہی طریقہ ہے تم میرے ساتھ میرے گھر چلو۔“ رابع ملک کے لب و لہجے میں بٹ دھری بول رہی تھی۔

”تم ایسے نہیں مانو گی تمہیں منانے کا پہلا طریقہ یہی ہے کہ تم میری نظروں کے سامنے ہر پل رہو۔ جب میری نظروں کے سامنے رہو گی میرے بالکل پاس رہو گی تو تمہیں میری محبت و چاہت میرے جذبوں پر یقین بھی آئے گا۔“

”قطعاً نہیں ایسا کبھی ممکن نہیں، انا بیہ آپی، انا بیہ آپی۔“ اس سے پہلے کہ رابع ملک آگے کوئی کارروائی کرتا اس نے انا بیہ کو زور زور سے پکارنا شروع کر دیا تھا۔

”پاگل ہو گئی ہو کیا؟“ رابع ملک نے جلدی سے اس کے ہونٹوں پر اپنی ہتھیلی دھری تھی۔

”بے وقوف لڑکی۔“

انشراح پوری طرح مزاحمت کر رہی تھی کہ اس کی چوڑی ہتھیلی اپنے ہونٹوں سے ہٹا دے مگر ناکام ہی رہی اور آخر کار اس نے پوری طاقت سے اس کی ہتھیلی پر اپنے موتیوں کی طرح چمکتے دانت گاڑ دیئے تھے۔

”آہ.....!“

رابع ملک کو جھپٹن ہوئی تھی اس نے اپنی ہتھیلی اس کے ہونٹوں سے ہٹائی تھی انشراح تیزی سے پیچھے ہٹی تھی، بلکہ وہ تو سائیکس سے تیزی سے باہر نکلتا چاہتی تھی کہ رابع ملک نے اس کے گرد ایک بار پھر اپنے بازو کا حصار کھینچ دیا تھا۔

”ذرا بھی کچھ نہیں سمجھتی ہو؟“ رابع ملک نے نہایت دھیمی سی سرگوشی کی تھی۔

”انشراح..... رابع.....“

باہر سے دروازہ زور سے بجایا جانے لگا تھا، رابع ملک کی گرفت ڈھیلی پڑی تو انشراح نے اس کو دھکا دیا اور تیزی سے دروازہ کھولنے بھاگی تھی۔ دروازہ کھولا جہاں انا بیہ پریشان صورت لیے کھڑی تھی انشراح سسکتی ہوئی اس کے گلے سے لگی تھی۔

انشراح کو انا بیہ نے الجھتی نظروں سے دیکھنے کے بعد رابع کو شاکی نظروں سے دیکھا تھا، وہ سمجھ گئی تھی کہ انشراح کیوں رو رہی ہے رابع ملک کے خفیف سے چہرے نے سادہ سی کہانی سمجھا دی تھی۔

☆.....☆

آج حویلی کے سارے لوگ دوپہر کے کھانے کے بعد عاکفہ کے سسرال چلے گئے تھے آج عاکفہ کی نند کی مگنی تھی، اس لیے سب کو انوائٹ کیا گیا تھا حویلی میں ملازمین اور اریش کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ اس حویلی کی بڑی بیوی ہونے کے ناتے بھی اس کا کوئی مقام کوئی حیثیت اور کوئی اوقات نہیں تھی، وہ یہاں خون بہانے کی وجہ سے آئی تھی اور خون بہا میں آنے والی لڑکی کی حیثیت اس حویلی کے پالتو جانوروں سے بھی زیادہ کمتر ہے حیثیت تھی مگر آج وہ بہت سکون میں تھی چاہے یہ سکون پل بھر کا ہی کیوں نہ ہو۔

”رحمت ہوا!“

”جی بولے۔“ رحمت ہوا جو ہفتے بھر کے منڑ چھیل رہی تھی، معصوم سے چہرے والی کو دیکھنے لگی، آج رحمت نے اریش کے چہرے پر بہت سکون سادہ دیکھا تھا اور یہی سکون رحمت کو بھی سکون میں کر گیا تھا۔

”شاہ سائیں کی شادی انجی سے ہو رہی تھی نا جن کی مگنی ہے آج۔“

”آپ کو یہ سب کس نے بتایا۔“ رحمت نے منڑ پھیلنے ترک کر دیئے۔

”وہ چھوڑیں، آپ بتائیں نا کیا ایسا ہی تھا۔“

”ہاں عاکفہ چوہدرائیں کی نند سے ہی شاہ سائیں کی شادی ہونے والی تھی۔“

اب ہر دن خوبصورت

مکمل تحفظ مکمل تازگی



Butterfly
BREATHABLES

GIRL
TALK

For more information visit GirlTalk by Butterfly

”تو انہوں نے کیوں نہیں کی۔“ اربش کا دل حسد و جلن جیسی خرافات سے پاک تھا اتنا تو رحمت سمجھ گئی تھی۔

”اگر وہ شادی کر لیں عاقلہ چوہدری کی ہند سے تو آپ کو کوئی فرق نہیں پڑے گا، کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔“ جانے وہ ان سیاہ نین میں کیا کھوجنا چاہتی تھی۔

”نہیں بھلا مجھے کیوں کوئی فرق پڑے گا اور نہ ہی شادی کے لیے کوئی اعتراض ہو گا۔“

اربش دل سے چاہتی تھی کہ سالار شاہ کی شادی ہو جائے وہ حویلی کا ہر محنت والا کام کرنے کو تیار تھی چاہے رات بھر ہی کیوں نہ کوئی کام کرنے دے دیا جائے کواہو کی تیل کی طرح لگی رہے گی مگر لیوں پر حرف شکایت تک نہیں لائے گی مگر سالار شاہ کے ساتھ گزارا بل پل لچھ لچھ وہ کس اذیت اور تکلیف سے گزارتی ہے صرف وہی جانتی تھی اور اس کا رب۔ سالار شاہ نے اس کے جسم کے ہی نہیں روح کے بھی بیچے ادھیڑ دیئے تھے کہ اگر موت بھی آئے تو ان کی تکلیف بھی اس تکلیف کے آگے پیچ لگے، جو سالار شاہ لچھ لچھ دیتا تھا اس کو۔ ہر وقت اس کا ریشہ ریشہ بکھیر دیتا کہ وہ خود کو سنبھال بھی پاتی تھی کہ نئے سرے سے وہ ایک بار پھر اس کو کالج کے باریک باریک ٹکڑوں کی طرح بکھیر دیتا، وہ اس حویلی میں ساری عمر غلامی کی زندگی گزار دے گی اپنی چھوٹی پیاری سی بہن انشراح کو بچانے کے لیے آخری حد تک درد تکلیف برداشت کر لے گی ظلم سہہ لے گی، برہنہ پا دھکتے انگاروں پر چلے گی۔ آگ کے شعلوں میں لپیٹ کے اس کی پیش کو اپنے اندر سمو لے گی مگر سالار شاہ کی بربریت، اس کا تشدد یہاں وہ ہارنے لگی تھی۔ کونٹے لگی تھی، بکھرنے لگی تھی یہاں اس کی ہر سوچ ختم ہو جاتی تھی۔

”مجھے نہیں پتا اربش بیٹی کہ شاہ سائیں نے عاقلہ چوہدری کی ہند سے شادی کیوں نہیں کی۔“ رحمت بوا، اربش کی تکلیف دہ سوچ سے انجان اپنی رو میں بولی تھیں۔

”لیکن شاہ سائیں تو پسند کرتے تھے نا ان کو۔“

”اگر پوری طرح میری جانکاری کر لی ہے تو کچھ کام کریں۔“

سالار شاہ کی بھاری اور گھمبیر آواز پر دونوں بری طرح اچھل کے رہ گئی تھیں۔

رحمت کو تو اپنی گردن سولی پر لٹکتی محسوس ہوئی تھی، جب کہ اربش کو ایسا محسوس ہوا اس کا سانس رکسنے لگا ہے۔ دل کی دھڑکنیں تھمسنے لگی ہیں، چہرے کی رنگت بالکل زردی ہو گئی تھی، سیاہ نینوں پر پہرہ دیتی لمبی خم دار گھنیر پلکیں رخسار پر سجدہ ریز تھیں، شکر فی ہونٹوں پر کپکپاہٹ سی واضح طور پر دیکھی جاسکتی تھی، نازک سا بدن ہولے ہولے لرزے لگا تھا، ڈر و خوف اس کے روم روم سے چھٹک رہا تھا، وحشت، دہشت کیا کچھ نہیں چھپا تھا ان جھکے جھکے سیاہ نین میں۔

”سائیں ایہ سارے ڈبے اسٹور میں رکھو ادوں۔“ سمندر خان مہذب سار کو جھکائے کھڑا تھا۔

”نہیں.....!“ سالار شاہ نے سختی سے منع کیا۔

”ان سارے ڈبوں کو یہیں رکھ دے۔“

”جی حکم سائیں!“

سمندر خان نے ان سارے ڈبوں کو وہیں ہال میں ملازموں سے رکھو دیا تھا۔ رحمت نے حیرت بھری

انظروں سے سالار شاہ کو دیکھنے کے بعد ان ڈیوں کو دیکھا جو پچاس ساٹھ کے قریب تھے ان سب میں بچن کے راشن کا سامان تھا مگر سالار شاہ نے یہ سارا سامان یہاں کیوں رکھوا دیا وہ تو بچن میں بنے بڑے سے اسنو ریل میں رکھوایا جاتا تھا، رحمت کو سالار شاہ کی لاجبک سمجھ میں نہیں آئی تھی۔
”جاؤ تم لوگ۔“

سارے ملازمین سر آنکھوں کو فرش پر جھکائے باہر نکلتے چلے گئے تھے۔
”اے لڑکی!“ سالار شاہ نے نہایت حقارت سے اربش کو پکارا تھا۔
”جی!“

”یہ سارے ڈبے ایک ایک کر کے اوپر والے پورشن میں رکھ کے آ۔“
”جی بہتر۔“

کوئی حیرانگی نہیں ہوئی تھی ہاتھ پر سوال نہیں، کیونکہ وہ جانتی تھی اس کا کام یہی ہے محنت مشقت۔
رحمت جلدی سے کھڑکی ہوئی تاکہ اربش کے ساتھ مل کر وہ ان بھاری ڈیوں کو اٹھوا لے۔
”تجھ سے میں نے کہا ہے کہ تو کبھی یہ کام کر؟“ رحمت کو ڈبہ اٹھاتے دیکھ کر سالار شاہ غرایا تھا۔
رحمت کے ہاتھ وہیں کے وہیں دک گئے تھے۔
”سائیں وہ.....“

”گم کر اپنی شکل ورنہ ہمیں زمین میں زندہ کاڑھ دوں گا۔“ رحمت پوری جان سے کانپ کر رہ گئی تھی،
سالار شاہ کے چہرے پر سختی غراہٹ دیکھ کر رحمت نے ذہان سے جاملنے میں ہی عافیت جانی تھی، جاتی ہوئی
رحمت کو سالار شاہ نے بری طرح گھور کے دیکھا تھا۔

رحمت جانتی تھی کہ اگر اس کو یہ تھوڑی سی رعایت ملی ہے تو حریف اس لیے کہ وہ بہت پرانی ملازمہ ہے
اس حویلی کی اگر کوئی نئی ملازمہ ہوتی تو اب تک اس کا کام تمام ہو چکا ہوتا۔ اس لیے کہ وہ بہت پرانی ملازمہ ہے
اربش نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا تھا، وہ آگے بڑھی اور ایک ایک کر کے ڈبے اٹھا کر اوپر لے
جاتی رہی تھی گو کہ ڈبے بہت زیادہ بھاری تو نہیں تھے مگر اوپر نیچے کے چکر نے جیسے اس کے دونوں پیروں کی
جان ہی نکال دی ہو، اس کا تنفس کبھی بہت تیز ہو جاتا کبھی بہت دھیمہ۔ موت سے بھی بدتر موت کیا ہوتی ہے
اس لیے اس نے شدت سے محسوس کیا تھا۔ اپنے تیز رفتار دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھے وہ آخری ڈبے کی جانب
بڑھی تھی آج کی اس محنت نے اس کا جوڑ چوڑ توڑ دیا تھا ٹھکن سے اس کا ہر ایک عضو دکھ کر رہ گیا تھا اور شاید وہ
یہ آخری چکر سیڑھی کا برداشت نہیں کر پائی تھی اس کے قدم لڑکھڑاکے رہ گئے تھے، ارادے مسار ہو گئے تھے،
وجود پورا ڈول گیا تھا، خود کو بہت سنبھالنے سنبھالتے بھی وہ ماربل کے چچھاتے فرش پر گرنے لگی تھی کہ سالار
شاہ کا لمبا چوڑا وجود سامنے آ گیا تھا۔ اس کی مضبوط ہاتھیں پھیلی تھیں اور وہ نازک سیاہ چوہ لائی مضبوط کپڑی
بانہوں میں سا گیا تھا۔ سالار شاہ نے اربش کو اپنی مضبوط کپڑی بانہوں میں اٹھا لیا تھا اور آگے بڑھنے لگا تھا۔
”نہیں۔“ بے آواز ہونٹوں سے صرف یہی ایک لفظ ادا ہوا تھا۔

پچھے رحمت بچن کے دروازے کے اوڑھ میں پچھی یہ سارے قیامت کے منظر دیکھ رہی تھی مگر اس قدر
بے بس اور لاچار تھی کہ کچھ نہیں کر سکتی تھی اربش کا ٹھکن زدہ وجود سالار شاہ کی بانہوں میں تھا۔ اب وہ جانتی

”کی کہ ایک وحشی درندے کی بربریت، تشدد اور ظلم کا نشانہ بننے جا رہی ہے۔ رحمت اپنی چادر کا کونا منہ پر
بٹے سکتے لگی تھی۔

”یامیرے مولا کسی کو بیٹی نہ دے اور دے تو کسی کا نصیب اربش جیسا نہ دے۔“ رحمت نے آسمان کی
باب سرائیٹھا کر دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر تڑپ کر دعا مانگی تھی۔

سالار شاہ نے اس کے منہ سے وجود کو بیڈ پر پٹا تھا۔

”تجھے کیا لگا آج تو میری درندگی حیوانیت سے چھٹکارا ملے گی۔“

اربش کے سیاہ نمین میں ایک جہاں کا سمندر موجزن تھا مگر اجازت نہیں تھی کہ اس سمندر کا بند توڑ کر بہہ
جانے کا راستہ دیا جائے۔

دن چسے چسے آگے بڑھیں گے میری نفرت میری حیوانیت میں کمی نہیں ہوگی بلکہ تیری سزا ہر روز دو گنا
بڑھے گی۔“ سالار شاہ نے اس کا بازو بے رحمی سے پکڑ کے اپنی جانب کھینچا تھا، سالار شاہ کا وحشیانہ پن آج
اپنے عروج پر تھا۔

کوئی ایک کھٹے بعد سالار شاہ نکھر نکھر افیش سا تیار ہوا اپنے بیڈروم سے باہر نکلا تھا۔ رحمت جو مڑوا پس
چھیلنے بیٹھی ہوئی تھی، جاتے ہوئے سالار شاہ کی مغرور چال کو دیکھنے لگی تھی، اس مغرور اور فاتح چال کا مطلب
وہ اچھی طرح سمجھتی تھی، جانتی تھی کہ ان مغرور اور فاتحانہ قدموں نے کسی معصوم جان بے بس و کمزور لاچار
وجود کو روند ڈالا ہے، گلاب کی کٹی کی طرح کٹا لایا ہے، گاڑی کی آواز پر وہ سمجھ گئی کہ وہ سمندر خان کے ہمراہ
عاکفہ کی طرف نکل چکا ہے۔ رحمت سارا کام پھورے سالار شاہ کے بیڈروم کی جانب بھاگ گئی تھی۔ وہ اندر آئی
تو جو سوجھا تھا اس سے کہیں زیادہ تکلیف دہ منظر سامنے تھا۔ اربش بے یار و مددگار، بے رحمی کے ساتھ نیچے ریڈ
دیز قالین پر اوندھی پڑی تھی۔ رحمت تیزی سے بھاگی، وہی لڑکی جس کے پاس آئی تھی۔

”اربش۔“ رحمت نے اربش کو سیدھا کیا اور اپنی گود میں اس کا سر دھک لیا تھا۔

”رحمت بوا!“ وہ ہلکتی ہوئی رحمت کی آغوش میں اپنا چہرہ چھپا گئی تھی۔

”رحمت بوا..... کیا نصیب ہے میرا..... حویلی کے کاموں کی محنت کوئی محنت نہیں ہے، میں مریوں نہیں
جاتی، مجھ سے شاہ سائیں کا یہ وحشیانہ سلوک برداشت نہیں ہوتا مگر دیکھیں میں کتنی ڈھپت ہوں موت بھی
میرے قریب نہیں پہنچتی۔“ وہ ہچکیوں سے زار و قطار رو رہی تھی۔

”بس کر میری بچی، بس کر دے ورنہ میرا کچھ حلق سے باہر آ جائے گا۔ میرا دل پھٹ جائے گا۔“ رحمت
ہوانے سکتے ہوئے اس کو مزید خود میں بھیج لیا تھا۔

☆.....☆

انابینہ آدرا دم و نون شاپنگ مال آئے تھے۔ کل انابینہ کی برتھ ڈے تھی تو انم اس کو کل کے لیے اس کی
پسند کی شاپنگ کرانے لایا تھا اور یہ بھی کہ کل شام کو جو سوٹ وہ پہنے گی وہ دائم کی پسند کا ہونا چاہیے۔

”دائم!“ جانی بچانی آواز پر دائم نے پلٹ کر دیکھا تھا۔

”تمہرے!“ حیرانگیوں کے سارے پہاڑ اوپر گرے تھے۔

تمہرے چلتا ہوا اس کے پاس آٹھ ہوا تھا۔

”بہت خوب تو یہاں یہ عیش ہو رہے ہیں۔“

تبریز کا اشارہ انابیہ کی جانب تھا، جو دائم اچھی طرح سمجھ چکا تھا اور یہ بھی کہ تبریز کو غلط فہمی بھی ہوئی ہے اور اس سے پہلے کہ وہ آگے کچھ اور بولتا اس نے انابیہ کا ہاتھ تھام لیا تھا، جو تبریز کو تو کبھی دائم کو سواویہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”تبریز شی زامانی وائف۔“

”واٹ؟“ اب حیران ہونے کی باری تبریز کی تھی، لاکھوں سوالات کے ساتھ لا تعداد ناگوار شکائیں بھی پیشانی پر موجود تھیں۔

”دائم! یہ کیوں ہیں۔“ انابیہ نے بغور تبریز کا چہرہ نوٹس کیا تھا جس کے چہرے پر ایک سوال آ رہا تھا تو ایک چار ہاتھ وہ دائم کی بات سن کر کچھ پریشان بھی ہو گیا تھا۔

”یہ میرا کزن ہے تبریز۔“

”ارے واہ زبردست۔“ انابیہ کو دل سے خوشی ہوئی تھی کہ دائم سے منسلک کوئی رشتہ ہے۔

”اپنا نمبر دوٹھکے میں تم سے فرصت سے ملنا چاہتا ہوں۔“ تبریز کا لب و لہجہ بالکل سپاٹ تھا جو صرف

دائم ہی نوٹ کر سکتا تھا اور اس اکثر بے انداز کی کہاوت بھی وہ اچھی طرح جانتا تھا۔

”تبریز آپ ہمارے گھر آئیے مجھے بہت خوشی ہوگی۔“ انابیہ نے خوشی سے کہا تھا۔

”بالکل اب تو آنا ہی پڑے گا۔ اس نے تو اپنی خوشی میں ہمیں یاد نہیں رکھا مگر اس کی شادی کا تہہ دینے ضرور آؤں گا۔“ تبریز نے انابیہ کے برابر میں کمرے سے دائم کو گھورا تھا، جس نے فوراً ہی اپنی نظریں چرائی تھیں۔

”ابھی مجھے ضروری میٹنگ اینڈ کرنے کی ہے، کل میں آپ کو لوگوں کی طرف آتا ہوں۔“ تبریز نے ایک بھر پور شکایتی نگاہ دائم پر ڈالی تھی اور آگے نکل گیا تھا۔

”دائم! تم نے بتایا نہیں کہ تمہارا کزن یہیں رہتا ہے۔“ انابیہ کے ذہن میں کھلبلا نا سوال زبان پر آیا تھا۔

”تم یہ سب چھوڑو یہ بعد کی باتیں ہیں پہلے یہ بتاؤ کوئی سوٹ پسند کیا اپنے لیے۔“ دائم فی الحال اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”اس ناٹ فیئر دائم! کل میری برتھ ڈے ہے تمہیں تبریز کو انوائٹ کرنا چاہیے تھا۔“ انابیہ نے ناراضی ظاہر کی تھی۔

”اچھا بابا گھر جا کر فون کروں گا اور دوسری بات تبریز کے سامنے اس ”تم“ سے بات کرنے سے پرہیز کرنا۔“

”جو حکم میرے آقا!“ انابیہ ہنستے ہوئے گورنش بجالائی تھی۔

”اب چلیں۔“ دائم اس وقت اس کے ساتھ تو ضرور تھا مگر سوچوں کے سارے تانے بانے تبریز میں ہی الجھے ہوئے تھے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ تبریز اپنی میٹنگ سے فراغت پاتے ہی سب سے پہلے اسی کی طرف رخ کرے گا۔ اسے اب شاپنگ کرنے کرانے میں کوئی انٹرس نہیں تھا، تبریز سے مل کر اس کی ذہن کی اسکرین پر

ایک ایک کر کے سارے اپنوں کے چہرے جھلملانے لگے تھے جنہیں وہ کچھ نام کے لیے بھول گیا تھا۔

”دائم یہ والا دیکھو کیسا لگ رہا ہے۔“ اس کی سوچوں سے بے خبر انجان انابیہ اپنے لیے کل پہننے کے لیے سوٹ سلیکٹ کر رہی تھی۔

”اوں۔“ دائم نے نہایت چونک کر انابیہ کو دیکھا تھا۔

”دائم آریو آل رائٹ؟ مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔“ انابیہ نے اس کا چہرہ بغور دیکھا۔

”شاید تم تھک گئے ہو، دیر بھی تو کافی ہوگی۔ چلو چھوڑو گھر چلتے ہیں بعد میں لے لیں گے کوئی اتنا ضروری بھی نہیں ہے۔“ اس کے لب و لہجے میں دائم کے لیے فکر بول رہی تھی۔

”ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔“ دائم کو احساس ہوا، ٹھیک ہے وہ ساری محبتیں اپنی جگہ مگر اس محبت کا بھی اپنا الگ مقام ہے جسے اس نے پایا ہے۔

”چلو آؤ ایک سوٹ تمہارے لیے خرید لیتے ہیں پھر گھر چلتے ہیں۔“ وہ اپنی ٹینشن میں اس کی خوشی کو کیونکر

فراموش کر سکتا تھا جو اس کی محبت کی اس کی اولین چاہت اس کی تمام سوچوں کا مرکز۔

وہ لوگ شام کے سات بجے گھر بھی آ گئے تھے۔ ساری شاپنگ لی بی جان کو دکھائی دائم تو کچھ دیر میں ہی

اپنے پیڈروم میں آ گیا تھا۔ آج اس کو جسمانی ٹھن سے زیادہ ذہنی تھکن تھی، تھکاوٹ اس کے اندر تک اتری

ہوئی تھی۔ آج تبریز کو دیکھا تو اپنا گھر اپنے جیسے کرنے والے لوگ شدت سے یاد آ گئے۔ دل

شدت سے چاہا کہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی وہ امان جان کے قدموں میں بیٹھ جائے اپنا سران کی آغوش میں

چھپالے جہاں دنیا جہاں کا سکون تھا جس نرم و گرم ملائم آغوش میں چہرہ چھپائے وہ اپنی ہر ضد منوا لیتا تھا۔

”یہ لوگ مگر عام چائے۔“ انابیہ کی قریب سے آئی آواز نے اس کو چہرے سے اس کی سوچوں سے کھینچ لیا تھا۔

”تھینکس۔“ اس نے مسکراتے ہوئے اپنا بھاپ اڑاتا کپ اٹھالیا تھا۔

”مجھے پتا ہے تم بہت تھک گئے ہو، تمہارے چہرے سے زمانے بھر کی تھکن ایک سی ہے۔“ اس نے گرم

سپ اپنے اندر اتارا وہ آگے کچھ اور بولتی کہ اس کا فون جیج اٹھا۔

”راعب کی کال اس نام!“ انابیہ نے بڑبڑاتے ہوئے اپنا موبائل دیکھا اور فون ریسیو کر لیا۔

”ہاں رابع کہو کیا بات ہے؟“ انابیہ نے سیل فون کان سے لگایا تھا۔

”سب سے پہلے تو مجھے یہ بتاؤ دائم کہاں ہے؟“ وہاں سے ناراضی بھر انداز تھا۔

”دائم میرے سامنے، کیوں سب حیریت تو ہے نا؟“

”میں کوئی کچھلے ایک گھنٹے سے فون کر رہا ہوں وہ اٹھا کیوں نہیں رہا، ابھی گھڑی میں صرف نو بجے ہیں

اور مجھے نہیں لگتا کہ تم لوگ اتنی جلدی سوچی جاؤ گے۔“

”بات کیا ہے اتنا غصہ کیوں کر رہے ہو اصل موقف کی طرف آؤ۔“ انابیہ سمجھ گئی تھی کہ اس نے فون کیوں

کیا ہے مگر چھیڑنا مقصود تھا۔

”اب یہی مجھے بتانا پڑے گا۔“ وہ تپ گیا تھا۔

”بالکل بتانا پڑے گا۔“ وہ کھٹکھٹائی تھی۔

”سخت زہر لگ رہی ہو یوں ہنستی ہوئی، اب ہنسنا بند کرو اور فون انشراح کو دے کر آؤ۔“



”اوتے ہوئے تو جناب کی بے تابی کا یہ عالم ہے۔“
 ”اگر اوندان تم پر تو یہ وقت پڑائیں۔“ وہ اس کے جلے بھنے جواب پر زور سے ہنسی تھی۔ دائم نے اس کے ہاتھ سے فون لے لیا تھا۔

”ہاں رانب خیریت۔“
 ”اب تجھے بھی پوری رام کھانسانی ہوگی۔“ دائم نے ابرو اچکا کر اشارے سے انا بیہ سے پوچھا، انا بیہ نے مسکراتے ہوئے دونوں کندھے اچکا دیئے تھے۔

”یارتہم دونوں میاں بیوی نے اپنی تو نیا پار لگالی میرا کچھ خیال ہے۔“
 ”تو میری جان اپنا خیال رکھنے والی کو یہاں سے لے جا کس نے منع کیا ہے۔“ دائم کو اس کی حالت مزہ دینے لگی تھی۔

”ایک سوا یک طریقے آتے ہیں مجھے انشراح کو یہاں سے لے جانے کے لیے بشرطیکہ وہ راضی تو ہو، چلو نیم رضا مندی ہی ظاہر کرو گے۔“

”جی درست فرمایا، ایک سوا یک طریقے ہیں تیرے پاس بلکہ میرے حساب سے تو یہ گنتی بھی کم ہے۔ ایک سوا یک طریقے کے بجائے ایک ہزار ایک طریقے ہیں جس کا اندازہ اسی دن لگایا تھا میں نے۔“ دائم کا اشارہ اس کے نکاح سے تھا۔

”ابھی فی الحال میرا موڈ نہیں ہے تجھ سے بحث کرنے کا، اس لیے مہربانی ہوگی میری نصف بہتر سے میری بات کرا دی جائے۔“

”اوہو..... اتنی بے قراری..... جب کہ وہاں سے تو گھاس بھی نہیں ڈالی جاتی۔“
 ”میری جان یہ گھاس پھوس تو تمہاری غذا ہے، ہم تو ڈائنٹ کے قائل ہیں۔“

”ٹھیک کہتا ہوں میں ڈھٹائی میں ریکارڈ قائم کیا ہوا ہے تو نے بے غیرتی کے سارے جھنڈے زمین کے اندر تنک گاڑھے ہوئے ہیں۔“ دائم کا چہرہ خفت سے سرخ پڑ گیا تھا۔ انا بیہ نے اس کی سرخ رنگت دیکھی تو سمجھ گئی کہ وہاں فون کے اس بارے سے کچھ تو ایسا جملہ کسا ہوگا جس نے دائم کو خفیف سا کر دیا تھا۔ وہ دائم کے ہر رنگ کو پہچانتی تھی اندر تنک اس کو جانتی تھی۔

”مجھے دونوں۔“ اس نے دائم کے ہاتھ سے فون اچک لیا تھا۔
 ”یہ تم نے میرے مننے کو ایسا کیا کہہ دیا کہ وہ جھینپا جھینپا جا رہا ہے۔“

”یہ تو تم اپنے مننے سے ہی پوچھنا فی الحال جلدی سے میری انشراح سے بات کراؤ۔“
 ”اوکے دیتی ہوں ویٹ کرو۔“ انا بیہ باہر نکلی اور اوپر کی جانب قدم بڑھا دیئے تھے، دھیرے سے دروازہ بجایا۔

”کون؟“ ہلکی سی آواز آئی۔
 ”انشراح! کھولو میں انا بیہ۔“

”جی انا بیہ آپ کی ہے۔“ اس نے انا بیہ کی آواز سن کر دروازہ کھول دیا تھا۔

(جاری ہے)

جیا قریشی

کہانی ہر جیت لگی

کاشن کے معمولی ہلکی ایمبر انڈری کے سوٹ میں ملبوس جس کا دوپٹہ سر پر جما تھا ہونا حیران کن تھا اگر اس کے باپ کو شک لگا تھا تو ایک شک اسے بھی اپنے Millionaire باپ کو اس چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں دیکھ کر



نا تھا قسمت شاید اسے ہی کہتے ہیں اور اس کی بیوی ماضی کی مشہور فلمی پری کو (بلکہ اب جوان کا جم تھا برا کہنا) یادہ مناسب ہوگا) اپنے سامنے پا کر منہ بند کرنا بھول گئی تھی اس نے خاصی ناگواری سے اپنی بیوی کے کھلے منہ پر ہاتھ رکھا جس میں رکھا نوالہ وہ چنانا بھول گئی تھی اپنی پلیٹ میں رکھا کاشن بجا کر اس نے متوجہ کیا وہ ہوش میں آئی اور منہ بند کر لیا تو اس نے انٹروڈکشن کرنا مناسب سمجھا۔

”یہ میرے فادر ہیں اور یہ ان کی واکف“۔ اس نے نوالہ بمشکل نگلتے سر ہلایا۔

”مطلب آپ کی مدر“۔

”نہیں میری ماں چودہ سال پہلے میرے باپ کو چھوڑ کر چلی گئی تھی یہ ان کی دوسری بیوی ہیں“۔ وہ اتنی ناک حد تک منہ پھٹ ہوگا فارحہ کو اندازہ نہ تھا اس نے گڑبڑا کر ان دونوں کو دیکھا اس کے فادر کا چہرہ سرخ

(آخری حصہ)



ہو گیا تھا اس کی بات کا اثر ذہل کرنے کو اس نے جھٹ مسکرا کر انہیں سلام کیا تھا اور انہیں سیٹ آفر کی تھی جسے نظر انداز کرتے وہ دوبارہ شرم سے مخاطب ہوئے۔

”ہمارا تعارف تو کر دیا اس لڑکی کا نہیں کروا گئے۔“ انداز کے برعکس ان کا لہجہ شہنشاہی تھا۔
 ”اوہ ایس شی زامانی وانف“ نہایت اطمینان و بے نیازی سے اس نے تعارف کرایا تھا کبھی نہ کبھی تو کرنا تھا پر جن سے کرایا تھا ان کے سر پر وہ تعارف کسی ہم کی طرح چھٹا تھا۔

”تم تم نے شادی کر لی تھی؟“ وہ بے یقین ہوئے۔
 ”Its not a big deal“ تا حیران ہونے والی بات تو نہیں آپ نے بھی تو کی تھی دودو دفعہ کی ہے۔
 اس کی بے نیازی عروج پر تھی فارحہ نے مچرمانہ انداز میں سر جھکا لیا۔

”تم اتنے خود مختار کب سے ہو گئے شکر کے سارے فیصلے خود کرتے پھر؟“ بظاہر لہجہ بڑا سخت تھا مگر فارحہ کو یوں محسوس ہوا کہ بڑے بڑے دل سے یہ جملے کہے گئے ہیں اس نے اپنا سر مزید جھکا لیا۔
 ”میں تو پیشہ میں مختار تھا“ اس کا لہجہ استہزاء سے تھا فارحہ کو اس کا انداز برا لگا تھا۔
 ”محبت ہوئی؟“ اس سے؟

”ہاں بہت شدید“۔ اس کی بات پر فارحہ نے جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
 ”تو داؤد تمہارے بیٹے کے ایک بڑے بھائی سے شادی کر لی۔“ جاتے ہوئے سیز داؤد نے وار کیا تھا۔
 ”ہاں بالکل ایسے ہی جیسے میرے بچے“ اس کی لڑکی بھی اولاد اپنے پیرئش پر ہی تو جاتی ہے نامسز داؤد۔“ ان کا جملہ شرم نے لوٹا یا تھا وہ تملکا کر داؤد صاحب نے اسے دیکھا۔
 ”اور وہ جوان کے سامنے کیپوزڈ اور بے نیاز تھا اب مضطرب نظر آنے لگا تھا پاسلسلیڈ کا پیچ بھر کر اس نے منہ میں رکھا خوش ذائقہ منہ میں گھل جانے والا پاسلسلیڈ اب اچانک بد ذائقہ لگنے لگا تھا پیچ پلٹ میں پھینک دیا۔
 ”کس نے پیچ کھسکا کی فارحہ پر نظر پڑی وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی اسے احساس ہوا کہ وہ اکیلا نہیں ہے لمحے سے بھی کم وقت میں اس نے خود کو دوبارہ کمپوز کیا تھا عادت جو ہو گئی تھی اپنے شگاف خود بھرنے کی ٹوٹ پھوٹ کر خود بڑنے کی وہ اپنی نگاہوں کو اس کے ساتھ سلیمیریٹ کرتا تھا اور دکھ اپنے اندر دفن کر دیتا تھا اسی لئے تو لوگوں میں زندہ دل اور خوش باش مشہور تھا۔

☆☆☆☆

وہ اس وقت لائبریری میں کتابوں میں سر دیئے بیٹھا تھا جب سارہ بہت خاموشی اس کی برابر والی چیئر پر بیٹھی تھی اس نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اس کی آنکھوں میں جیسے کسی ٹوٹے خواب کی سی کرچیاں تھیں شرم نے نظریں چرائیں تو رات سے صبح بھر میں اس کی شادی کی خبر عام ہو گئی تھی (واہ کیا تیز سروس ہے ڈیڈ آپ کی بیوی کی) اس نے دل میں سوچا۔

”پلیز سارہ مجھے کسی کنبہ میں کھڑا مت کر دینا کہ کب کیوں اور کیسے کی شادی ایک شادی ہی تو کی ہے سب کرتے ہیں کوئی جرم تو نہیں کیا جس کو لے کر سوالات کئے جائیں۔“ ہاتھ اٹھا کر تیز لہجے میں اس نے پہلے ہی سے پیش بندی کی تھی مگر فارحہ نے بالکل مختلف سوال کیا تھا۔

”تم انجان تو نہیں تھے شرم؟“ اور شرم واقعی انجان نہیں تھا اس کے لب بھینچ گئے وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔
 ”ہاں میں نہیں تھا انجان۔“ اس نے دھیمے سے اعتراف کیا شاید سارہ کی جگہ کوئی اور ہوئی تو وہ ہٹ دھرمی سے جھوٹ بول جاتا مگر وہ سارہ بھی جو اس کی زندگی سے قریب تھی اس کے سب رنگوں سے تو نہیں پرکھ سے

آسانی رکھتی تھی۔

”اور اگر میں زندگی میں کبھی اپنی شادی پلان کرنا تو تم سر فہرست ہوتیں۔“ اس کا لہجہ نرم تھا وہ سچ کہہ رہا تھا مارہ کے چہرے سے ملال جاتا رہا تھا۔

”کنکٹوں کی فہرست میں۔“ دل کا درد با کر اس نے پوچھا تھا۔
 ”یونوات شرم میں انسان ہوں اور انسانوں کو درد جوں میں نہیں رکھا کرتے کہ اس کا نمبر پہلا اور اس کا دوسرا

”جس خوش ہوں کہ میں تمہاری زندگی میں شامل نہیں ہوئی جان کر انجان بن جانا اور اپنا کر چھوڑ دینا تمہاری عادت بن چکی ہے شرم مجھے اس بے چاری لڑکی پر ترس آ رہا ہے جتنی اچانک تم نے اپنی زندگی میں شامل کیا ہے تم ایسے ہی اسے نکال دو گے اور میں دعا کروں گی کہ اس بے چاری پر وہ وقت کبھی نہ آئے۔“ سارہ دکھی تھی اور انسان کی دل سے بہت کچھ کہہ جاتا ہے شرم نے سب سرسری سنا تھا۔

”اپنی وزیر“ میں واپس امریکا جا رہی ہوں۔“ اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔
 ”ایسے مت دیکھ تمہارے لئے جوگ نہیں لوں گی میں کچھ بریک لوں گی پھر اپنی اسٹڈیز جاری کروں گی یہ بے خیال میں بیٹھ کر اسٹڈیز کر رہی ہے۔“ سر پر گلے سن گلاسز آنکھوں پر لگاتے بیگ کی اسٹریپ کندھے پر ہلاتے وہ کھڑی ہو گئی۔

☆☆☆☆

”تم تھک نہیں جاتی ہو؟“ ڈانکنگ ٹیبل پر بیٹھا وہ اس وقت کتابوں لیپ ٹاپ اور اپنی کسی فائل پر بیک وقت مصروف تھا تین اس کے ہاتھوں میں خلاورٹل ٹیبل ٹیپ ہندھے مالوں میں اٹکی ہوئی تھی جبکہ وہ اس وقت بیانی کا مصالحو بھوننے میں مصروف تھی ہر سیکنڈ وہ ٹیبل ٹیپ میں کفگیر زور سے دو تین بار بجاتی جس کی آواز شرم کے کانوں میں بری طرح جھپتی پر وہ برداشت کرتا تھا اس کے بیچ تھا صبح وہ جلدی اٹھ جاتی اس کا پھیلا یا ہوا واسیٹ گھر گھر کی صفائی کر کے اس کا ناشتہ بنا کر رکھ کر وہ اسے بہت سارے جگا کر اپنے جانے کا ہتائی ناشتہ کھانے کی تنبیہ کرتی اس کی آنکھیں چوم کر اسے خدا حافظ کہتی اس کو پلٹ جاتی شروع میں کچھ دن شرم نے واہی پر اسے بک کر لیا تھا مگر اس کا لاسٹ سیمسٹر تھا وہ پڑھائی اور انٹرن شپ میں بہت زیادہ بڑی تھا فارحہ نے اسے شمع کر دیا یوں اس کا آنا جانا بس میں ہی ہوتا تھا اکثر تو وہ عشاء کے فرائض میں بیٹھتی تھی اس کو اسکول اور ان کے بعد دو ٹیوشنز گھر بھی بالکل اپوزٹ وے میں تھا وہ ایسی میں وہ تھک کر چور ہو چکی ہوتی پھر پکانے میں بات جاتی اکثر تو اس کا پکانا رازیاں ہی جاتا شرم اکثر ہی واہی پر فاسٹ فوڈ لے کر آ جاتا فارحہ کے پکائے دیسی امانے اس کے حلق میں اکتاتے بقول اس کے اس کی زندگی کا بڑا حصہ یہی فاسٹ فوڈ کھاتے گزرا ہے وہ اتنی بلدی ان کھانوں کا عادی نہیں ہو سکتا ایک دودو دفعہ فارحہ نے پیڑ اور برگ وغیرہ اس کے لئے بنادئے تھے اور وہ اس پر بری طرح فدا ہوتا ہوا بولا تھا تم روز یہی کیوں نہیں بنائیں جواب میں فارحہ نے اسے فاسٹ فوڈ کے انسانیات پر سیر حاصل لکچر دیا تھا جو اس نے پیڑا کے بائٹ لیتے بالکل نہیں سنا تھا۔

”تھک جاتی ہوں بہت زیادہ تھک جاتی ہوں۔“ مصالحو میں چکن ڈال کر بھوننے کے بعد اس نے چولہا ہلکا یا اور اس کے سامنے آ بیٹھی۔

”تو تم جاب چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟“ وہ اس کے تھکان زدہ وجود کو دیکھتے بولا۔

”میں جاب کیسے چھوڑ سکتی ہوں؟“ اس نے رसान سے اسے دیکھا۔

”آئی اس دن بتا رہی تھیں کہ دکان کا اچھا خاصا کرایہ آتا ہے۔“ وہ اب اپنے موبائل پر بڑی ہو گیا تھا وہ ہمیشہ کسی نہ کسی چیز کے ساتھ مصروف ہوتا درمیان میں اس سے سرسری انداز میں بات کر لیتا اور فارحہ اس کی سرسری بات سننے کے لئے بھی ہمت نہ کر سکتی تھی حالانکہ دل چاہ رہا تھا کہ جلدی کام ختم کر کے بستر پر پڑ جائے فارحہ کا دل چاہتا کہ وہ اسے مکمل توجہ سے نوازے اس سے ہر موضوع پر بات کرے اس کی سننے اپنی سنائے اور وہ اپنی چیزوں کے ساتھ مصروف رہتے فارحہ کی توسل لیتا تھا مگر اپنی وہ خود کو ہی سنا تا تھا اسے خود سے مکالمے کی عادت تھی سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے کی وی دیکھتے وہ اکثر ہی بڑا ربا ہوتا تھا شروع میں فارحہ کو عجیب لگتا وہ اسے ٹوک دیتی تو جیسے وہ چونک کر ہوش میں آ جاتا وہ کئی پر توں میں مقید شخص تھا وہ مسکراتا تھا بلند بانگ قہقہہ لگاتا تھا فارحہ کو مزہ کرنے میں اسے بڑا مزہ آتا تھا رات کو وہ اپنے خود میں سمیٹ کر سوتا تھا مگر اس کے باوجود فارحہ کو نال کر وہ ایک کر رہا تھا اگر ایسا تھا تو بلاشبہ وہ ایوارڈ کا مستحق تھا فطری تجسس کے ہاتھوں فارحہ نے اس کا ماضی کھگانے کی کئی بار کوشش کی تھی وہ اپنے فادر کے ساتھ کیوں نہیں رہتا اس کے اپنے فادر سے کیا فکس میں وغیرہ اور جواباً وہ صاف مکر گیا تھا کہ ان سے ان کا کوئی کلیش نہیں وہ اکیلے پن کا شکار ہے فارحہ اس کے بارے میں یہی اندازہ کر پائی تھی وہ ابھا ہوا تھا اور فارحہ اسے سب کچھ مان کر پوری تن دی سے اس کی شخصیت کو سلجھا رہی تھی۔

”آتا تھا اب وہ ماموں کے پاس جاتا ہے۔“

”بھئی۔“ وہ کراہ اٹھا۔

”اب بھی تم لوگوں نے انہیں ہوا بنا رکھا ہے۔“ وہ بولی نہیں بس خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

”جب تک تم لوگوں کو اپنے حواسوں پر سوار کرنا نہیں چھوڑو گے لوگ یونہی بھوت بن کر ڈراتے رہیں گے اس لئے ڈرنا چھوڑو اور ڈرانے کی عادت ڈالو۔“ اس کے چہرے پر ڈر چلا جانے والی مسکراہٹ تھی۔

”ہم ڈرنے والے نہیں ہیں۔“ فارحہ سے سچ ہضم نہیں ہوا تھا۔

”اچھا“ تو ثابت کرو پھر آج تو کئی نائن ہے برسوں فرسٹ رینٹ کے جاؤ اور ملے کر آؤ۔“ وہ ایک ایک لفظ جما کر بولا تھا انداز چلیبیک تھا اور ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ۔

☆☆☆☆

بس سے اتر کر اس نے بیگ کا اسٹریپ شانے پر مضبوطی سے جما یا سر پر دوپٹے پہنچ کر آگے تک کیا اور چال میں توازن و وقار پیدا کرتی چند قدم چل کر شاپ کا گلاس ڈور دھکیلتی اندر آ گئی اس کے بیگ میں لاسٹ ایگریمنٹ کی کاپی تھی وہ شمر کے پہنچ پر یہاں آ تو کئی تھی مگر حال یہ تھا کہ دل کا بپ رہا تھا اور ٹانگیں لرز رہی تھیں چند گہرے گہرے سانس لے کر اس نے خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کی سیکڑ میں اس کی طرف لپکا جس پر ایک بے نیاز سی نظر ڈالتی وہ آگے بڑھ گئی الیکٹرونکس کے مختلف سامان پر نظریں دوڑاتے اس نے پوری شاپ کا چکر لگایا تھا سیکڑ میں اس کے پیچھے تھا اسے کچھ خود خریدنا تو تھا نہیں وہ صرف خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کر رہی تھی ایک کونے میں بنے چھوٹے سے آفس کے دروازے پر اس نے دستک دی سیکڑ میں نے اس سے پوچھا کہ اسے کیا چاہئے اسے چپ رہنے کا اشارہ کرتی وہ اجازت ملنے پر اندر داخل ہو گئی تھی۔

”میں فارحہ ہوں ابراہیم احمد کی بیٹی۔“ سلام کے بعد پیئر پہنچ کر بیٹھتے ہوئے بولی سامنے بیٹھے شخص نے بغور اسے دیکھا تھا۔

”ابراہیم احمد جن کی یہ دکان آپ نے کرائے پر لی ہوئی ہے ان کی وفات کے بعد میری والدہ اس کی اور ہیں یہ ایگریمنٹ ان کے نام پر ہی بنا ہوا ہے۔“ اس نے ایگریمنٹ کی کاپی ان کے سامنے رکھی تھی۔

”اس سے پہلے غیاث صاحب جو کہ میرے ماموں ہیں کرایہ وصول کرنے آتے تھے مگر اب سے میں آیا کروں گی۔“ لہجہ مضبوط بنا کر اور دل قابو میں رکھ کر وہ بولی وہ شخص بغور اسے دیکھ رہا تھا اس کی بات سن کر فیمل پر لکھے پیئر زانٹھا کر معائنہ کرنے لگا۔

”ٹھیک ہے ہمیں کوئی اعتراض نہیں مگر میرے خیال میں مجھے ایک بار غیاث صاحب سے بات کر لینی چاہئے۔“ اس نے اپنا موبائل اٹھایا تھا۔

”ٹھیک ہے آپ انہیں فون کر لیجئے چاہیں تو یہاں پر بلا لیں مگر اس صورت میں وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہیں گے اور میں کرایہ لئے بغیر تو کبھی نہیں جاؤں گی ہو سکتا ہے مجھے اپنی مدد کے لئے پولیس بھی بلانی پڑ جائے ہمارا گھر بلو جھٹڑا آپ کی دکان پر شروع ہو جائے میں ایسا نہیں چاہتی یقیناً آپ بھی نہیں چاہیں گے سمجھ تو گئے ہوں گے آپ کہ میں کیا کہنا چاہتی ہوں۔“ وہ ایک کاروباری شخص تھا فوراً ہی معاملے کی تہ تک پہنچ گیا تھا چند منٹوں میں سوجا اور دروازے سے چیک نکال کر مائونٹ لکھ کر اس نے چیک سائن کیا تھا اسے سائن کرتے دیکھ کر اس پر شادی مرگ طاری ہو گیا تھا۔ کچھ منٹوں سے بھی کم وقت میں اس نے چیک اس کے ہاتھ سے چھینا جیسے اس کے ارادہ بدل جانے کا ڈر ہوئے تھے کہ عالم میں چیک کو چند لمحے دیکھا اور پھر پیئر زانٹھا کر بیگ میں ڈالے چہرے پر دوبارہ سے سنجیدگی طاری اور لہجہ خشک بنانے ہوئے بولی۔

”دو مہینے بعد یہ ایگریمنٹ ختم ہو جائے گی اس کے ساتھ ہزار کا ہوگا آپ سوچ لیجئے گا۔“ تو فیض بدیر نے جیمز کی پشت سے ٹیک لگاتے اس لڑکی کو دیکھا تھا یقیناً اتنی جرأت منہ نہیں تھی جتنی بننے کی کوشش کر رہی تھی انہوں نے اسے رکھی سے انداز میں کولڈ ڈرنک آفر کی تھی مگر وہ شائستگی سے انکار کرتے باہر آ گئی۔ شاپ سے باہر آ کر اس نے بیگ سے چیک نکال کر دیکھا اس کا ڈیٹا دل اب تک یقین کرنے کو تیار نہ تھا بیگ کی زپ بند کر کے اس نے اپنی شاندار کارکردگی پر شانے کو پہلی کے نواں اب کدو کا خود کا تالیاں جانے کو چاہ رہا تھا۔

”تو ٹھیک کہتا ہے اچھی زندگی گزارنے کے لئے تھوڑی ہمت درکار ہوتی ہے اور ضرور کوشش کرنی پڑے گی۔“ اس نے رکشے میں بیٹھتے اس نے سوچا تھا۔ جب الفت کے ہاتھ میں اس نے چیک دیا تو وہ بھی ایسے ہی یقین ہو گئی تھیں الفت کو دیکھ لے جا کر اس نے چیک ڈپازٹ کر لیا ان کا اکاؤنٹ کھلایا اور پھر انہیں لئے مارکیٹ چلی آئی خوب شاپنگ کر کے دونوں گھر واپس آئیں تو شام ڈھل چکی تھی ان کے گھر میں آج خوشیوں کی بارات اتر آئی تھی سمن بار بار اپنے نئے سونوں پر ہاتھ پھیرتی تو کبھی سعد اپنے ویڈیو گیمز دیکھنے لگ جاتا پورے گھر میں وہ اپنے نئے اسکول شوز پہنے گیوم رہا تھا اس کے شوز جو پرانے ہو چکے تھے پھٹ چکے تھے اور الفت ہر مہینے اسے اپنے مہینے کا کہہ کر نکال جاتی تھیں پیسہ زندگی کا حاصل نہیں مگر زندگی کا حصہ ضرور ہے چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے ان کے بچوں کے چہرے آج خوشی سے چمک رہے تھے الفت آسودہ سی بچن کے سامان کے شاپر زانٹھا کر بن میں چلی گئیں صبا ان کی مدد کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی جبکہ وہ فون اٹھا کر شمر کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

☆☆☆☆

پہلی فرصت میں اس نے جاب چھوڑی تھی نیو شمر بھی چھوڑ دی تھیں وہ فراغت کا لطف اٹھانا چاہتی تھی مگر

مہینہ بھر میں ہی گھبراہٹ مچنے لگی تھی اس نے اسے پرائیویٹ ایم کام کا مشورہ دیا تھا اس نے مان لیا اس کے ساتھ جا کر بکس بھی لے آئی اب رجسٹریشن ہوئی تھی تب ہی ہونی تھی الحال وہ خود ہی ورق گردانی کرتی اور ٹاپکس سمجھنے کی کوشش کرتی مگر اس کے ایجنڈے شروع ہو چکے تھے وہ اس میں بڑی تھلا اور وہ بھی اس کے ساتھ مصروف تھی کبھی کبھی اس کے دوست آ جاتے تھے وہ کہیں چلا جاتا۔ ان ہی دنوں اسے وہ خوشخبری ملی جو تقریباً ہر شادی شدہ عورت چاہتی ہے کہ اسے جلد از جلد مل جائے رب کا اس پر اتنی جلدی کرم ہو گیا ہے اسے یقین نہ آیا اپنی حالت پر شک تو اسے کئی دنوں سے ہو رہا تھا ٹیسٹ نے شے پر یقین کی مہر لگا دی اس نے فوراً شکرانے کے کئی نکل ادا کر ڈالے فی الحال اس نے شکر کو چھوڑ دیا تاکہ اس کے لاسٹ پیروالے دن اسے یہ گڈ نیوز سنائے گی وہ پوزیشن ہو لڈر تھا اور وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی پوزیشن میں فرق آئے اسے شدت سے اس دن کا انتظار تھا اتنی بڑی خبر اپنے اندر چھپائے رکھنا اس کے لئے مشکل ہو رہا تھا اور بلا خروہ دن بھی آن پہنچا تھا اس دن وہ خوش تھی بہت صبح سے بچن میں گھسے اس نے شکر کی کئی پسندیدہ ڈشز تیار کی تھیں خوب دل لگا کر تیار ہوئی تھی خود کو پریشوں کی بوچھاڑ میں بھگایا ہے۔ بالکل بکرا کر کے یونی کھلا چھوڑ دیا مگر اس کے بال بہت پسند تھے وہ جانتی تھی آئینے میں اپنا عکس دیکھتی وہ کھلکھلا کر ہنس رہی وقت کاٹنے نہیں کٹ رہا تھا وہ لاؤنج میں آ کر چمچل سرچ کرنے لگی لاک میں چابی گھومنے کی آواز پر وہ سرعت سے رکت چلی گئی تھی اس کے قریب سے گزرتا مگر ٹھیک کر رکاوٹ کر دیکھا خوشبویں لٹائی بلکہ پھلکے میک اپ اور ایڈورٹسنگ کلر کے جگہ بدتراش کے سوٹ میں میو اپنے لمبے بالوں کو سبک کر ایک شو لڈر پر رکھے لیوں پر ایک شوٹنگ مسکراہٹ سجائے ہوئے تھے اس کی بیوی بھی جو عموماً روز عام سے محلے میں بالوں کو جوڑے میں لپیٹے رہتی تھی اسے دیکھ کر شکر کا موڈ ایک دم خوشگوار ہو گیا اس کی آنکھیں پل بھر میں ہوا ہوئی تھی۔

”تم کہیں سے آئی ہو یا تمہارا ابھی کہیں جانے کا ارادہ ہے؟“ نے پوچھا۔
”گرفت میں لئے پوچھا اس کی بیوی کی مسکراہٹ ذرا غصے سے بھری تھی۔
”کیوں کیا میں یونہی آپ کے لئے تیار نہیں ہو سکتی؟“

”ہو سکتی ہو بالکل ہو سکتی ہو مگر ہونی نہیں ہوتاں۔“ شوڑاٹھا وہ دوڑا۔
”اس کے چہرے پر چھوٹی لٹ کوہولے سے کھینچا وہ بیدروم کی سمت بڑھ گیا۔

”ہونہہ“ تعریف کا ایک لفظ تو بول نہیں سکتے طعنوں اور طنز کی دکان ایسے کھول دیتے ہیں کہ کیا ساس نندیں دیتی ہوں گی؟“ کس کس سوچتی وہ چکن کی طرف بڑھ گئی۔

”یہ اہتمام کیا تم نے میرے پیچھے زخم ہونے کی خوشی میں کیا ہے؟“ اس کا اشارہ اہتمام سے کئی ٹیبل اور فارحہ دونوں جانب تھا۔

”ہاں ایک وجہ یہ بھی ہے۔“

”ایک وجہ اور دوسری؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا وہ مسکراتی ہوئی بنا جواب دیئے اٹھ گئی اس کا خیال تھا وہ دوسری وجہ جاننے اس کے پیچھے آئے گا اس سے اصرار کرے گا اور وہ اسے تھوڑا انگ کر کے بتا دے گی مگر وہ شرمناک تھا تو کثر اس کی امیدوں کے خلاف ہی کرتا تھا اب بھی وہ اس کے جواب نہ دینے پر شائے اچکا تا کھانے کی سمت متوجہ ہو گیا تھا کچھ دیر وہ فروغ کا دروازہ کھولے چیزیں ادھر ادھر کرتی پھر گہری سانس بھرتی پانی کی بوتل لے کر ٹیبل پر چلی آئی۔

”تم نے اسٹیک بہت مزے کا بنایا ہے۔“ اسے دیکھتا وہ مسکرایا فارحہ بھی مسکرا دی اسے یہ شخص دل و جان

”وہ لیا تھا چاہے وہ اسے کتنا ہی زنج کرتا کبھی اس کی تعریف نہ کرتا جان بوجھ کر گھر بکھیرتا اور فارحہ کے لئے بہت معصومیت سے کہتا مجھے اتنی ترتیب اور صفائی سے کچھ کچھ ہوتا ہے وہ صرف اس کے پکائے۔
”انسانے کی ہی کبھی تعریف کر دیا کرتا تھا لیکن کبھی کچھ پسند نہ آئے پر پلٹ کھٹک کر اعلان بھی کر لیتا۔

”لیا بکواس ہے یہ فارحہ ڈھنگ سے کھانا پکا تا کب سیکھو گی ایف کوئی اسٹوڈنٹ ہی ہوگا جو تمہارے ہاتھ کا ہمارے گا۔“ اور فارحہ اس اسٹوڈنٹ کی گزشتہ دن کی جانے والی تعریف سوچ کر اپنا اشتعال دہانی اس نے کبھی فارحہ کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اس سے اس کی ویران زندگی میں بہار آگئی ہے یا اس کے دم سے اس کا گھر آباد ہو گیا۔

”یا پھر یہ کہ وہ جو پہلے گھر سے باہر رہنے کے لئے بہانے سوچا کرتا تھا ہمیشہ کسی نہ کسی فریڈ کے گھر ڈیرہ ڈالے لٹا پٹا ہے وہ فریڈ کتنا ہی بے زار کیوں نہ ہو جاتا اب گھر آنے کے بہانے ڈھونڈتا ہے کہ کب کام اس کی جان پہنچا۔“ اور وہ گھر کی طرف دوڑ لگا لگا وہ کچھ تو فارحہ اس کے عام سے جملوں کو اپنی مرضی کے رنگ پسند دیا کرتی تھی خود وہ اس معاملے میں کوئی کنجی نہیں کرتی تھی یوں تو وہ اسے ہر دم ڈشنگ و اسمارٹ لگا کرتا تھا مگر کبھی

”یا یہ لگتا تو فوراً ہی ایک آدھ چھبی کے ساتھ اظہار کر دیا کرتی اور اس وقت لارڈ شمر کے تاثرات ایسے ہوتے تھے بادشاہ سلامت نے شکر کی تعریف قبول کی شمر کے وجود پر اسے ایک ہی چیز بری لگا کرتی تھی اس کے ہاتھوں تک آتے بال پشیمانی وہ کئی بار شمر کو سولجر کٹ میں دیکھ چکی تھی اور وہ اتنا اسمارٹ نظر آتا کہ وہ اس

لے سر ہو جاتی اور وہ بھڑک جاتا۔
”خبردار میرے بالوں پر بری نظر لگتا ہے تو یہ میری اولاد ہیں۔“ وہ پیار سے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتا اور وہ جل بھن کر رہ جاتی کئی بار اسے پیار سے ہاتھ لگاتے شکر کی گزشتہ دن کی گزشتہ دن کے نہ دیا اب بھی اسے دیکھتے اس کی

دل گرفت بھڑکی تھی ہاتھ بڑھا کر اس کے بالوں سے پکڑتا۔
”اپنی اس اولاد کو کتنا ایں کیونکہ آپ کی اصل اولاد اسے نہ دے گی۔“ کا ٹانہ تک لے جاتے شمر کا ہاتھ رکنا بھی سے اسے دیکھا اس کے چہرے پر شرمیلیں مسکراہٹ تھی۔

”آپ پاپا بننے والے ہیں۔“ اس نے وضاحت دی شمر ساکت ہو گیا۔
”اس نے اسے اسٹینچو کر دیا ہو فارحہ کو ابھن ہونے لگی شمر حیران ہوگا خوش ہوگا ہو سکتا ہے خوشی کے مارے اسے جگہ سے ڈالے اس نے یہ سب سوچا تھا مگر وہ منہ کھولے یوں ساکت ہو جائے گا جیسے اسے کوئی شاک لگا ہوا یا اس نے کچھ بھی سوچا تھا۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ ہلکے سے بڑبڑایا۔
”ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا“ فارحہ ابھی ایسا کچھ نہیں ہونا چاہئے۔“ وہ شاک سے باہر آ کر فارحہ کو شاک

لگا گیا اسے لگا اس کی روح بچ گئی ہے۔
”شمر۔“ اس کے کلب پھڑ پھڑائے آنکھوں میں بے یقینی تھی۔
”فارحہ۔“ اس نے ٹیبل پر پردے فارحہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ جمایا۔

”یہ سب بہت جلدی ہو گیا۔“ اس کے نیچے سے اپنا ہاتھ پھینکتی اپنی سسکیاں دہاتی فارحہ بھاگتی ہوئی بیڈ روم میں چلی گئی اس نے سردنوں ہاتھوں میں گرایا۔ وہ کافی دیر بعد اٹھ کر اس کے پیچھے آیا تھا وہ بیڈ پر اوندھی لیٹی سردنوں ہاتھوں میں چھپائے رو رہی تھی اس نے نرمی سے اسے سیدھا کیا۔

”فارحہ پلیر یا مجھے سمجھنے کی کوشش کرو ابھی میں اتنا شامیلیش نہیں ہوں کون باپ بننا نہیں چاہتا میں بھی بننا چاہوں گا مگر ابھی نہیں چار پانچ سال بعد۔“

”تو مسٹر مرادو آپ کو مجھ سے تعلق بھی چار پانچ سال بعد بنانا چاہئے تھا“۔ آنسو صاف کرتی وہ تیزی سے بولی۔
 ”ہاں یہ میری غلطی ہے“۔ اس نے اعتراف کیا اور فارحہ پھر بھی وہ اس کے اور اپنے تعلق کو غلطی قرار دے رہا تھا اور غالباً اسے بھی احساس ہوا تھا جیسا اپنی بات کا اثر زائل کرنے کو جلدی سے بولا۔

”ٹرائے ٹوانڈرا اسٹینڈ فارحہ میری لائف میں بہت گولڑ ہیں جو مجھے اچھو کرنے ہیں۔“
 ”ہم آپ کے گولڑے کے آڑے نہیں آئیں گے“۔ اس نے بات کاٹی۔

”ہم“۔ ٹرائے سہاکتا ہوا نظریں اس کے چہرے سے سفر کرتی ذرا نیچے سرکیں تو گویا اتنی جلدی ہم پر نوبت آگئی تھی۔
 ”شمر پلیز یہ اللہ کا تحفہ ہے ہم اس سے منہ نہیں موڑ سکتے“۔ اس نے حتی الامکان نرم لہجہ رکھ کر اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی اتنے دنوں میں وہ اسے اتنا تو جان گئی تھی کہ اپنی بات کی نفی کرنے پر وہ ضد میں آ جاتا تھا۔

”اور اللہ اسے دینا میں بھیجے گا تو اس کے ساتھ وسائل بھی بھیجے گا آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں پیپر ز آپ نے دیئے ہیں جلدی رزلٹ بھی آ جائے گا پھر اچھی جا ب بھی مل جائے گی تب تک آپ کے پاس انٹرن شپ تو ہے ہی۔“

”تم کیا خوابوں کا دنیہ میں رہتی ہو فارحہ میرے پاس لاکھوں کی انٹرن شپ نہیں محض چند ہزار کی ہے ڈیوری کا خرچہ پاتا ہے نہیں ملتا ہوتا ہے مگر نہیں تم یہ کہو گی ٹرائے اس میں بہت مہینے ہیں کچھ نہ کچھ ہو جائے گا تو اس دوران تمہاری ڈاکٹر فیس میں جن نمائندگیوں کو ڈیوڑیہ سب؟“ نوآئی کانٹ انورڈ میں کل ہی بات کرتا ہوں کسی سے کوئی ڈاکٹر ڈھونڈتا ہوں اور تمہیں میری بات ماننا پڑے گی فارحہ میں ابھی باپ بننا انورڈ نہیں کر سکتا۔“ وہ جتنی لہجے میں کہتا کھڑا ہو گیا فارحہ کو اس وقت وہ کوئی ظالم دیول کا کس کے چہرے پر چھائی تھی ساری زماہٹ نکل گئی تھی۔

”اتنے نامشکرے مت بنیں شمر کروڑوں کے گھر میں رہتے ہیں لاکھوں کی گاڑی میں سفر کرتے ہیں اور ایک بچہ انورڈ نہیں کر سکتے“۔ اس کی آنکھوں میں ایک بار یہ چھائی تھی جو منہ لگا تھا۔

”تو کروڑوں کا گھر چھوڑ کر فٹ پاتھ پر رہ لیتے ہیں لاکھوں کی گاڑی چھوڑ کر پیدل یا بس میں دیکے کھالیں گے“۔ اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

”لوگ اولاد کے لئے یہ بھی کر لیتے ہیں“۔ اس کی ہچکیاں بندھنے لگیں شمر چند لمحے اسے دیکھ کر اس کے پاس بیٹھا۔
 ”پلیز فارحہ خدمت کرو یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے اور ابھی میں خود کو اس کے قابل نہیں پاتا ہم اچانک

ایک دوسرے کی زندگی میں شامل ہوئے ہیں اور ابھی تو ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کے فیض سے گزر رہے ہیں ایسے میں یہ بہت جلدی ہے میں ابھی اس کے لئے تیار نہیں ہوں“۔ اس کے آنسو صاف کرتے وہ نرم لہجے میں بولا۔

”سمجھنے کا سلسلہ تو ساری عمر جاری رہتا ہے شمر میں مانتی ہوں شادی سے پہلے ہم ایک دوسرے کے لئے مکمل اجنبی تھے بالکل اچانک میں آپ کی زندگی میں شامل ہوئی مگر میں آپ کے ساتھ خوش ہوں شمر رہی ذمہ داری کی بات تو ہم مل کر اٹھالیں گے میں دوبارہ جا ب کر لوں گی پلیز شمر میں نے ان چند دنوں میں بہت سے خواب دیکھ لئے ہیں“۔ وہ جتنی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”تم سوچ لو فارحہ میں مزید اس بارے میں کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا“۔ وہ کہتا کمرے سے نکل گیا تھا۔

☆☆☆☆

ہفتہ گزر گیا ان دونوں کے درمیان عجیب سا کھینچاؤ پیدا ہو گیا تھا وہ بہت کم ایک دوسرے کو مخاطب کرتے تھے شمر زیادہ وقت گھر سے باہر گزارنے لگا تھا حالانکہ اب تو یونیورسٹی بھی ختم ہو چکی تھی فارحہ دونوں گھر رہ گئی تھی بار

و جا الفت سے معاملہ شیر کرے تاکہ وہ شمر کو سمجھا نہیں مگر بہت نہ بڑی شمر جو چاہتا تھا اس نے اس پر سوچنے کی کوشش کی تھی مگر جیسے سانس لگنے لگی تھیں وہ ایسا کیسے کر سکتی تھی وہ کہہ نہیں سکتی تھی۔

”تم نے کیا سوچا فارحہ؟“ ہفتے بعد وہ پھر اس کے سامنے تھا۔
 ”جتنا زیادہ وقت گزرے گا بارش کا پروسیس مشکل ہو جائے گا میں نے ڈاکٹر کا معلوم کر لیا ہے“۔ وہ ان

پاندنوں میں کتنا اسے رحم لگنے لگا تھا فارحہ نے آنکھیں میچ لیں اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔
 ”میں نہیں کر سکتی“۔ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

”تو ٹھیک ہے فارحہ تم اسے چنا چاہو گی یا مجھے دو آپشن ہیں تمہارے پاس غور کر لینا“۔ وہ سرد سپاٹ لہجے میں کہتا چلا گیا پیچھے وہ سیاتکت بیٹھی رہ گئی وہ ایسا کیسے کہہ سکتا تھا وہ اس کی بیوی تھی ابھی تو وہ اسے سمجھانے کے لئے دلائل اکٹھے کر رہی تھی اور وہ کیا کہہ گیا تھا اسے یقین نہیں آ رہا تھا کوئی اتنا ظالم بھی ہو سکتا تھا اس کا جی چاہا وہ

نہیں مار مار کر روئے اور خوب ماتم کرے اس کا دل پھٹ رہا تھا روح کھینچ رہی تھی اس نے اپنی خواہش پر عمل کرنا انکار اس کی چٹخیں ملنے والے جان دور دو دیوار اور ساز و سامان کے علاوہ کوئی بھی نہ تھا بہت دیر بعد وہ منڈھا ہاں اپنے وجود کو ہیشٹ لگائی اور بیڑ برگر لگی۔ محبت قربانی مانگتی ہے شمر داؤد نے بھی مانگ کی ممتا کی قربانی

محبت تکلیف دیتی ہے تو یہ تکلیف اس کے حصے میں ہی آتی تھی چاہے متا قربان کرنی یا محبت وہ کیسے ایک ڈائن مان جاتی جو اپنے ہی بچے کو کھانا جاتی ہے اگر مانتا قربان کرنی تو اپنے ہی رو پر کیسے پیش ہوئی انسان دنیا کا سامنا کر سکتا ہے پر اپنا نہیں دنیا سے منہ چھپا سکتا ہے خود سے؟ وہ ڈرنے لگی تھی اسے ڈراؤنے خواب آنے لگے

تھے وہ وقت سے گزارش کرتی کہ وہ اس سے ملے کوئی مہینہ لئے گزر جائے۔ وہ مٹی کی ایک گرم تھی شمر اس کا فیصلہ جانا چاہتا تھا اس کی آنکھیں بریقین انداز میں لگی تھیں وہ اس کی محبت سے آگاہ تھا جانتا تھا وہ اسے

پنے کی وہ مقلدین تھا اس نے سب کچھ بیان کر رکھا تھا وہ اس کے بعد وہ اسے مری ایبٹ آباد وغیرہ لے جائے گا زیادہ نہیں تو وہ اسے دو ایک شہر تو چھوڑے گا وہ اسے سکتا تھا وہ اس کے ساتھ بہت سارے حسین وقت گزارنا چاہتا تھا باپ بننے کے لئے تو ساری عمر بڑی ہے وہ جانتا تھا یہ فیصلہ اس کے لئے آسان نہیں ہے وہ محبت سے اس

لے مہم رکھے گا کہ وہ اس تکلیف کو بھول جائے گی وہ اسے بتائے گا کہ وہ بھی ایسا ہی بنی محبت کرتا ہے جتنی کہ وہ اسے سنبھال لے گا سمجھا لے گا اتنی محبت دے گا کہ چند دنوں میں وہ سب جھوٹ چلے گی وہ کا فیڈ بک تھا ان کے بیچ پھیلی اس سرد مہر کی کا ب خاتمہ ہو جانا چاہئے اس نے مسکرا کر اسے دیکھا وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی

اللہ سے تکلیف سے شکوے سے اور جھپٹی نظروں سے پھر پلٹ کر بنا جواب دیئے کمرے میں چلی گئی شمر نے اس لے پیچھے جانے کا قصد کیا مگر پھر مزید گفتگو کو شام تک ملتوی کرنا گھر سے نکل گیا۔

شام کو وہ گھر میں داخل ہوا تو وہ کہیں نہیں تھی پورے گھر کا چکر لگا کر وہ صوفے پر نیم دراز ہو گیا قریب آدھا گھنٹہ اس کا انتظار کرنے کے بعد وہ پاٹ سے موبائل نکالتا سیدھا ہوا تھی نظر سینٹرل ٹیبل پر رکھے شوپنس کے

بیٹے دے کاغذ پر بڑی تھی اس نے بیچ کر کاغذ نکالا کاغذ پر صرف ایک ہی سطر درج تھی اور اس سطر نے شمر کو ہلا ڈالا تھا اسے لگا لاؤنج کی چھت اس پر آن بڑی ہوا اس نے بے یقینی سے دوبارہ کاغذ پر نظر دوڑائی۔

”میں بارش نہیں کروا سکتی اس لئے آپ کی زندگی سے جا رہی ہوں“۔ اس کی ساکت نظریں اس سطر پر

نی تھیں اس کی آنکھوں میں فی الجہری تو سطر دھندلا گئی اس نے کاغذ کو ٹٹھی میں سمجھ لیا اشتعال کی ایک تیز لہر اس لے اندر ابھری تھی کاغذ کے گوشے کو دیوار پر مارتے وہ چیخا تھا۔

”ٹھیک ہے جاؤ تم بھی جاؤ مجھ کسی کی ضرورت نہیں ہے گوہیل۔“ پھر سینٹرل ٹیبل پر رکھا کرشل کا وہ خوبصورت شوپیس بھی دیوار پر دے مارا شوپیس لمبے میں کرچیوں کی صورت میں بکھرا تھا بالکل اس کی ذات کی طرح کاری چابی اٹھاتے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا نکل گیا۔

☆☆☆☆

”اور پھر شہزادے نے شہزادی کا آخری کیل بھی نکال لیا شہزادی نیند کی قید سے آزاد ہو گئی شہزادہ اسے اپنے ملک لے گیا اور پھر دونوں کی شادی ہو گئی اور سب ہسی خوشی رہنے لگے۔“ کہانی ختم کر کے کتاب بند کرتے اس نے اپنے تین سالہ بیٹے کو دیکھا جو نیند کی وادیوں میں اتر چکا تھا، جھک کر اس کے اوپری ہونٹ کے اوپر موجود تل کو چومتے وہ سیدھی ہوئی اس پر بلیکٹ درست کیا اور کہنی کے بل نیم دراز ہو کر اس کے سنہری ریشمی بالوں میں انگلیاں چلانے لگی نظریں اس کے خدو خال میں اٹھی ہوئی تھیں وہ شکر کی کاربن کا پی تھا ویسی ہی پیشانی ویسی ہی ناک وہی آنکھیں ویسی ہی ہونٹ اور اوپر کے ہونٹ کے اوپر دائیں طرف تل فارحہ کی اس نے صرف ایک چیز لی تھی اس کی مٹی اور تھوڑا سا مٹی پلکیں میں سال آٹھ مہینے دس دن وہ انگلیوں پر گئے بغیر حساب بنا سکتی تھی کس گھڑی اور کس تاریخ پر اس نے شکر کا گھر چھوڑا وہ بھی بھول نہیں پاتی تھی وہ اس کی زندگی سے نکل آئی مگر اس کو اپنی زندگی سے کبھی نکال ہی نہیں تھی نکال بھی کیسے سکتی تھی اس کی جتنی جاگتی نشانی اس کے سامنے جو موجود تھی اس نے ایک بار پھر اس کے تل کو چومنا شکر کے ہونٹ کے اوپر تل اسے بہت پسند تھا وہ اسے اکثر کہا کرتی تھی۔

”بھئی موچیں مت رکھے گا شکر ورنہ تیرا دل چھب جائے گا۔“ یاد آتے ہی ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر جمی تھی وہ اس سے بھی نفرت نہیں کر پاتی تھی نہ اس کے ہاتھ کو سنانے کسی کو کوٹنے دبا لوگوں کو ساری عمر ایک دوسرے کے ساتھ گزار کر ویسی محبت نہیں ہو پاتی جیسے اسے شکر سے جسے اس نے اپنی زندگی میں ہونے کی وجہ سے اس کے دل میں اسی طرح موجود تھی بس اب یہ تھا کہ اسے صبر آ گیا تھا اس نے شکر کے قریب آ گیا تھا وہ کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی کتنا کچھ بدل گیا تھا ان سالوں میں سلائیڈنگ ونڈو بند کر کے چلنے لگے اس نے برابر (تایا ابو) گھر کے لان میں چھانکا صبا اور عاشر ساتھ واک کر رہے تھے چھ ماہ قبل ہی تو ان کی شادی ہوئی تھی مسکرا کر ونڈو بند کر کے وہ بیڈ پر آ گئی سائیڈ لیب چلا کر اس نے آفس فائل کھول لی تھی عالیاں کی پیدائش کے تین ماہ بعد پیدائش انکل کے توسط سے اسے جاب مل گئی تھی جاب اور عالیاں میں وہ اتنی بڑی ہو گئی تھی کہ ماسٹر کا خواب اسے اس سے نکالنا پڑا مگر وہ اپنی زندگی میں مطمئن تھی اس کی توجہ کا مرکز عالیاں تھا تو محرومی سن اور سعد تھے سعد اچانک ہی بڑا لگنے لگا تھا اسے دیکھ کر ہی چھاؤں کا احساس پیدا ہوتا تھا۔

شکر کے گھر سے جب وہ لٹی پٹی آئی تھی تو ہونٹوں پر قفل تھے وہ ایک لفظ بول کر نہ دی تھی الفت اس سے پوچھ پوچھ کے ہار گئیں شکر کو فون کر کے وہ لوگ تھک گئے اس کا موبائل منسلک آف آتا تھا الفت کئی بار اس کے فلیٹ ہو آ میں گروہ ہمیشہ بندی ملا تھا پھر جب وہ بوجھ اٹھائے ہار گئی تو اپنا سارا بوجھ ان سب کے سامنے اتار بیچا کہ وہ سب دنگ رہ گئے صبا اور سن کو یقین نہ آتا تھا وہ توجہ جان سے اسے اپنا بڑا بھائی مان چکی تھیں الفت کچھ دن خاموش رہیں پھر فارحہ کو بھی سمجھانے کی کوشش کی کیا کرتیں وہ بھی مجبور تھیں ابھی تک فارحہ کی شادی کا چٹ پٹا قصہ لوگوں کی زبانوں پر موجود تھا نہیں چاہتی تھیں کہ ایک اور کہانی ان کے گھر سے منسلک ہو جائے فارحہ تھتھے سے اکھڑ گئی دھمکی دی کہ گھر چھوڑ دوں گی الفت خاموش ہو گئیں فیضان صاحب کو بیچ میں ڈال کر شکر سے بات کرنے کی کوشش کی اس نے ان سے ملنے سے انکار کر دیا اقراء نے بھی اپنی سی کوششیں کی تھیں مگر بے سود اور وہ سب کی

کوششوں کو خاموش بیٹھے دیکھا کرتی تھی محلے والوں نے ان دنوں جینا حرام کر دیا تھا ارسل لوگوں کو اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کا اچھا موقع مل گیا تھا۔

فارحہ کو آج بھی وہ دن یاد تھا جب ارسل نے سر راہ اس کا بازو پکڑ کر دکا تھا اور اس کے کردار پر جیلے کے تھے فارحہ کا ہاتھ پوری قوت سے اٹھا تھا اور ارسل کے نشان چھوڑ گیا تھا وہ ایسی بھری شیرنی کی طرح ارسل پر غرائی تھی کہ ارسل تو ارسل کئی محلے والے بھی دم بخود رہ گئے تھے اس کے کچھ روز بعد ہی جب وہ کرایہ وصول کرنے گئی تو ماموں بھی اس کے پیچھے پہنچے تھے خیال تھا کہ ڈرا دھمکا کے دبا ہی لیں گے شراب ان کی پشت پر نہ تھا مگر یہ ان کی خام خیالی تھی اس نے اپنی عزت سائیڈ پر رکھ کر بیچ بازار میں وہ ہنگامہ کیا تھا۔ انہیں تیبوں کا حق کھانے والا اور غاصب نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالا کہ انہیں کان دیا کہ بھاگنا پڑا ساتھ ہی توفیق حیدر کو الفت کا اکاؤنٹ نمبر دے آئی کہ اب وہ ہر مہینہ آنے کی زحمت نہیں کرے گی اس اکاؤنٹ میں ہر ماہ رقم ڈلوادیں جس زمین پر بیگا جاتا ہے اسی پر سر اٹھا کر پوری شان سے کیسے چلا جاتا ہے اور کیسے اپنے حق کے لئے لڑا جاتا ہے یہ شکر نے ہی تو سکھا تھا اسے مگر شکر کی ستم ظریفی تھی کہ جس نے یہ سکھایا تھا وہ اسی سے اپنے حق کے لئے نہیں لڑ پاتی تھی۔

اقراء کی شادی ہوئی اب اس کی جاب شارجہ میں تھی سودہ بیاہ کے شارجہ چلی گئی وہ آج بھی اس کی اکلوتی اور مخلص دوست تھی اس کا کپڑا برقی تھا انہیں کرنا دونوں کا معمول تھا اوہیں نے فارحہ کو بتایا تھا کہ کس طرح اقراء نے اسے فارحہ سے شادی کر کے لئے راضی کرنے کی کوشش کی تھی اور اقراء کو آج بھی اس بات کا قلق تھا کہ اگر اب اس مان جاتا تو آج فارحہ کی زندگی مختلف ہوتی، تقریباً ڈیڑھ سال پہلے تائی اماں سے اچانک ہی شائنگ مال میں ملاقات ہوئی تھی وہ انہیں دیکھ کر کہہ نہیں پاتی تھی یہ ہے جا کر ان کے سینے سے لگ گئی تائی اماں شہر میں سیدھی سادی مشفق خاتون وہ زبردستی انہیں گھر لے آئیں حالانکہ وہ اتنے بڑے تھے تو تائی اماں کے متوقع غصے سے گھبرا رہی تھیں مگر اس کے اصرار پر چلی آئیں فارحہ کی شادی کا سن کر وہ کتنی خوش ہوئی تھی تائی اماں میں پولیس تو بس اتنا۔

”عاشر کے ساتھ ہم نے ہمیشہ فارحہ کو سوجا تھا الفت ابراہیم کی اتنی کتنی خواہش تھی۔“ اور الفت نے شرمساری سے سر جھکا لیا کچھ کہہ ہی نہیں پائیں یہ بھی نہیں کہ ان کی نادانیاں تھیں تو انہیں اور ان کی بیٹی کو آج یہ دن دکھائے ہیں عالیاں کو خوب پیار کر کے انہوں نے اس کے ہاتھ میں کئی نوٹس سجا دیے اور فارحہ سے اس کے شوہر کے بارے میں پوچھنے لگیں۔

”ٹھیک ہیں تائی اماں امریکا میں ہوتے ہیں جاب ہے ناں وہاں ان کی۔“ چہرے پر غمناک باش ہونے کا ماسک چڑھا کر وہ پھر پور مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی۔

”تمہیں نہیں بلایا اس نے اب تک؟“ انہوں نے سوال کیا۔

”کوشش تو کر رہے ہیں تائی اماں اب دیزہ اتنی آسانی سے تھوڑی مل جاتا ہے۔“ اس کی بات پر وہ سر ہلا کر رہ گئیں اور پھر تائی اماں تو چلی گئیں انہیں شریک دے گئیں اس کا عہد تھا کہ کبھی ضرورتوں کے لئے تایا ابو کے سامنے نہ جائے گی اب ایسی کوئی ضرورت نہ تھی وہ بڑے تھے اور ان کا حق تھا کہ اپنی غلطیوں کی ان سے معافی مانگی جاتی انہیں اگر غصہ تھا تو ایسا ناجائز بھی نہ تھا آخر ان کے خلوص پر شک کیا گیا تھا وہ دن بعد ہی وہ الفت کے ہمراہ حسین احمد کے دو بھائی اور حسین احمد بظاہر جتنے سخت تھے سنگ دل ہرگز نہ تھے کہ کبھی ہاتھ جوڑے کھڑی تھی اور بھابھ کی آنکھوں میں شرمساری کے آئسو تھے اور وہ پھر بھی معاف نہ کرتے فارحہ کے بندھے ہاتھ کھول کر انہوں نے اس کا سر کا ندھے سے لگا لیا تھا۔

”تمہارا کوئی قصور نہیں بیٹا ہاں تمہاری ماں نے بڑا دل دکھایا تھا یوں غصے میں تعلق توڑ بیٹھا تھا۔“ انہوں نے کہا تھا اور پھر عاشر کو باقی سب کو لینے بیچ دیا تھا اس رات تو وہ کھانے کے بعد تاپا ابو کے گھر سے واپس آ گئے تھے مگر پھر جلد ہی تاپا ابو کی کوششوں سے ان کا پرانا گھر واپس مل گیا تھا کچھ الفت کی سینگڑھی کچھ اس نے اپنے دونوں سیٹ جو الفت نے وقت رخصت اسے پہنائے تھے الفت کے لاکھ منگ کرنے کے باوجود بیچ ڈالے تھے یوں اس گھر کو بیچنے کے بعد وہ اس قابل ہو گئے تھے کہ اپنا پرانا گھر خرید سکتے اس گھر میں واپس آنے کے بعد سب کو یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ اپنی جگہ واپس پہنچ گئے ہیں صرف وہی ہی جوانی جگہ سے ہٹ چکی تھی۔ تاپا ابو اور باقی سب اکثر اس کے شوہر کے متعلق پوچھا کرتے تھے اور وہ سب کو جھوٹی چٹی کہانیاں سنا کر مطمئن کر دیا کرتی تھی الفت اور باقی سب کو بھی اس نے سختی سے تاکید کر رکھی تھی وہ جانتی تھی کہ وہ ہمیشہ بیچ چھپا سکتی مگر جب تک چھپا سکتی چھپانا چاہتی تھی۔ تاپا ابو نے صبا کے لئے عاشر کا ہاتھ مانگا تھا ان سب کے لئے یہ خوشی کا مقام تھا صبا بیاہ کر تاپا ابو کے پورن میں چلی گئی شادی کے تمام اخراجات تاپا ابو نے اٹھائے تھے جیز کے نام پر الفت نے صبا کو بس اپنے زیور دیئے تھے اور چند جوڑے بانی اپنا کراہ عاشر نے خود فرشتہ کیا تھا صبا خوش تھی الفت اس کی طرف سے مطمئن تھیں فارحہ کو دیکھ کر ان کے دل میں جھنجھلاہٹیں تکلف دینے لگتی تھی وہ اس کے مستقبل کا سوچ سوچ کے ہول جاتی تھیں۔

صبا کی شادی کے دنوں میں سب اس کے شوہر کا پوچھتے تھے اور وہ یہ کہہ کر باقی رہی کہ آ رہے ہیں عین شادی کے دنوں میں اس نے کہہ دیا کہ انہیں کوئی ضروری کام آن پڑا ہے جس کی وجہ سے نہیں آ سکتے تاپا ابو مطمئن ہو گئے کئی باتیں اسے سنا ڈالیں وہ خاموشی سے الفت نے سمجھنا چاہا کہ جو حقیقت ہے وہ بتا دیں مگر وہ شادی کے دوران کوئی بد مزگی نہیں پیدا کرنا چاہتی تھی وہ جانتی تھی کہ لوگوں میں اس کی ذات مشکوک ہو گئی ہے خاندان میں اس کے بارے میں چگونیاں ہونے لگی ہیں اس کا انعام اور انہی شوہر لوگوں کے بیچ مسٹری بن گیا تھا جس کے بارے میں لوگ تجسس میں مبتلا تھے۔

”فارحہ یہ شرم تمہیں بھی فون بھی کرتا ہے یا نہیں۔“

”کرتے ہیں تاپا ابو۔“

”تو بیٹا کبھی میری بات بھی کرادو۔“

”جی تاپا ابو ضرور۔“ وہ سعادت مندی سے سر ملاتی۔

”بیٹا شرم کیا تمہیں تمہاری ضرورتوں کے لئے رقم نہیں بھیجتا؟“ وہ پوچھتے۔

”بھیجتے ہیں تاپا ابو کیوں نہیں بھیجیں گے۔“ وہ ہنس کے جواب دیتی۔

”تو پھر تم جاب کیوں کرتی ہو مجھے پسند نہیں تمہارا جاب کرنا۔“

”وہ تو میں ویسے ہی خود کو مصروف رکھنے کے لئے کرتی ہوں تاپا ابو آپ کو نہیں پسند تو کچھ مہینوں بعد چھوڑ دوں گی ابھی نہیں چھوڑ سکتی کچھ پراجیکٹ چل رہے ہیں۔“ وہ سعادت مندی سے ایک اور جھوٹ بولتی۔

”پتا نہیں کیوں مجھے وہم ہوتا ہے کہ کہیں اس نے امریکا میں دوسرا گھر تو نہیں بسا رکھا جو تم سے اتنا لا تعلق ہے۔“ وہ اپنے خدشے ظاہر کرتے (کیا پتا تاپا ابو بسا بھی لیا ہو تو) دل میں بیس اٹھتی۔

”نہیں تاپا ابو آپ بھی کن وائٹوں میں پڑ گئے ہیں وہ مجھ سے لا تعلق نہیں ہیں۔“ وہ بری طرح ہنس دیتی۔ اور اب وہ جھوٹ پر جھوٹ بولنے لگے تھکنے لگی تھی چاہتی تھی کوئی موقع ملے اور انہیں بیچ ہٹا دے۔ وہ آس سے آئی تو تاپا ابو ڈرائنگ روم میں براجمان تھے ساتھ تانی اماں اور صبا اور عاشر بھی تھے وہ سلام کرتی واپس مڑنے لگی

تا کہ فریش ہو سکے جب تاپا ابو کی کڑک دار آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

”وہاں کہاں جا رہی ہو یہاں آ کر تک کر بیٹھو اور جو میں پوچھوں اس کا بالکل سچ جواب دو۔“ وہ خاموشی سے ان کے سامنے صوفے پر تنک گئی۔

”امریکا کی کوئی اسٹیٹ میں ہے تمہارا شوہر؟ کہاں کام کرتا ہے؟ اس کا مکمل نام پتہ اور فون نمبر لکھو اور عاشر کو میں خود اس کو ڈھونڈ لوں گا۔“ وہ چونکی تھی تو گویا قدرت نے خود اسے یہ موقع فراہم کر دیا تھا وہ چند لمحے سر جھکا کر بیٹھی رہی پھر سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

”میں خود بھی بہت دنوں سے آپ کو سب کچھ بتانا چاہ رہی تھی تاپا ابو اچھا ہوا آپ نے خود بات چھیڑ دی۔“

”شرم داؤد میرے شوہر امریکا میں نہیں رہتے ہیں آپ سے جھوٹ کہا تھا ہمارا کسی بات پر اختلاف ہو گیا تھا اور میں نے ان کا گھر چھوڑ دیا وہ یہی رہتے ہیں اسی شہر میں آپ سب سے غلط بیانی اس لئے کی کہ نہیں چاہتی تھی کہ میری ذات سے کوئی پردہ اٹھے اور میرا اپنا آپ عیاں ہو مگر بھول گئی تھی کہ جھوٹ کب تک بھج سکتا ہے آخر خیر کو سامنے لانا پڑتا ہے۔“

”شرم داؤد دادا ایشی ایشی والے داؤد فاروقی کا بیٹا۔“ عاشر ایکسا پینڈ ہو کر اچھلا فارحہ نے آنکھیں رگڑتے ہوئے اثبات میں سر ملایا۔

”طلاق دے دی اس نے؟“ تاپا ابو کا لہجہ سرد اور سپاٹ تھا۔

”نہیں تاپا ابو۔“ وہ تڑپ گئی۔

”کس بات پر اختلاف ہوا تھا۔“ ان کا لہجہ اب بھی سرد تھا انہیں وجہ بتانا اگرچہ اس کے لئے مشکل تھا مگر ضروری تھا بتانا۔

”وہ وہ اولاد نہیں چاہتے تھے۔“ سر جھکا کر دھیمے لہجے میں جواب دیا آنسو اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے اپنا آپ عیاں کرنا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے اور تکلیف دہ بھی خصوصاً اپنے ذات کے پوشیدہ حصے کو دکھانا۔

”کیسے ہوا تھا پرشت؟“ یہ سوال الفت سے کیا تھا وہ جانتا چاہتے تھے کہ شرم کی اس سے تعلق رکھنے والے شخص کا رشتہ ان کی بیٹی سے کیسے ہوا تھا۔

”فیضان انکل اقراء میری دوست کے فادر کو تو آپ جانتے ہیں تاپا ابو ان کے شوہر پرانے لگا تھا۔“ اس نے جلدی سے جواب دیا پرشتہ جڑنے کی کہانی اسے سلیقے سے ایسے سنائی تھی کہ تاپا ابو کو کم سے کم چکا لگے۔

”تم اور کتنی بار شرم مندی سے میرا سر جھکواؤ گی الفت اپنی نادانیوں اور بے وفائیوں کی لسٹ ایک بار ہی تیار کر کے دے دو تاکہ میں ایک ہی بار جی بھر کے شرمندہ ہوں۔“ وہ قہر یار لہجے میں الفت سے مخاطب تھے الفت شرم مندی سے رو دیں وہ خاندان کے بڑے تھے اور اس حوالے سے ان سے سوال بھی ہوئے تھے فارحہ کو لے کر جو مشکوک سرگوشیاں ہو رہی تھیں اس نے انہیں مجبور کر دیا تھا کہ وہ معاملے کو جڑ سے کریدیں فارحہ ان کے قدموں میں آ بیٹھی اور سر ان کے زانوں پر رکھ دیا تھا۔

”بھتناجی جاے باتیں سنالیں تاپا ابو ڈانٹ لیں آپ حق پر ہیں مگر خدا را پھر سے ناراض مت ہوئے گا یہ ہم برداشت نہیں کر سکتے۔“ وہ بری طرح رو رہی تھی اس کے آنسو سے وہ کچھ نرم پڑے وہ روئی رہی اور وہ اس کا سر پھٹکتے رہے پیشانی پر ٹھکرکا حال بن گیا تھا یہ معاملہ انہیں آریا پار تو کرنا ہی تھا۔

☆☆☆☆

”میں شہزادہ ہوں“ آپ لوگ مجھے جانتے ہیں؟ نہیں آپ مجھے نہیں جانتے اب تک آپ کے سامنے میری شخصیت بڑی کی طرح ہے تو میں بڑی کے ان ٹکڑوں کو جوڑتا ہوں تاکہ آپ مجھے جان سکیں اس کہانی کے اہم کردار کو کیونکہ مجھے جانے بغیر یہ کہانی مکمل نہیں ہوگی اور ادھوری کہانی ادھوری تصویر کو بھی پسند نہیں کرتا۔ میرا نام شمر ہے، شمر یعنی انعام پھل، مگر کس چیز کا اور کس کے لئے؟ میں بھی نہیں جان پایا اس شمر کی کسی کو ضرورت نہ تھی نہ میری مام کو نہ ڈیڈے کو مجھے تو بھی اپنے ہونے کی وجہ سمجھ نہ آئی کہ میں تھا کیوں جب میری ضرورت ہی نہیں تھی میری ماں بے انتہا حسین عورت اتنی حسین کہ میرے ڈیڈے جیسے پندرم اسارت اور ڈیڈے شگ شخص حسن و نزاکت کے اس سورج کے آگے ٹھنڈے دینے کی مانند لگتے میری ماں ڈیڈے کی تانیا زادہ تھیں میں اپنی ماں کا فین تھا بلکہ یوں کہنا زیادہ درست ہوگا کہ اپنی ماں کی خوبصورتی کا فین تھا جب میرے دوست آپس میں باتیں کرتے شمر کی مام کو دیکھا ”اوہ واڈ“ شمر کی لکس ویری پر پٹیا ہوا ہوتی فل شمر ازیسے چلے میرا سر فر سے تان دیتے میری مام ایک خوبصورت عورت ہے میں اسی بات پر مطمئن تھا پھر مجھے خیال نہ آتا کہ دوسروں کی کمی کی طرح میری مام مجھے پیار کیوں نہیں کرتیں وہ میرا خیال کیوں نہیں رکھتیں اور اگر بھی آتا بھی تو میں خود کو جھوک دیتا ”نو شمر یار mom is different from other“ اگر وہ میں ہمارا کریں گی تو ان کی لب اسٹک خراب ہو جائے گی پھر وہ کیسی لگیں گی میں تصور میں پھیلی لب اسٹک کے ساتھ اچھا کچھ دیکھتا پھر اپنا سر جھٹکتا تو وہ مجھے ایسے ہی پیاری لگتی ہیں پھر کچھ دنوں میں میں ایک اور مسئلہ پر غور کر رہا ہوں کہ مام مجھے گود میں کیوں نہیں بٹھاتیں اور تھوڑی دیر بعد اس خیال کے آنے پر میں خود کو ملامت کر رہا ہوتا۔

”اف شمر تم کتنے بڑے ہو گئے ہو کیا مام کی گود میں مجھے لگو گئے مام کے ڈیڈے اندر دیر ز خراب ہو جائیں گے۔“ بھار ہو جانے پر مجھے ہڑک اٹھی کاش مام بھی میری خاطر باتیں کرنا لگتی ہو جاتیں تو میں خود کو لٹ بچ رہا ہوتا۔

”اف تمہارے لئے جاگنا اتنی سیلی کی ڈیوٹی ہے مام کی مام کے لئے نہیں ہے کرتی ہیں اگر وہ خود جاگیں گی تو ڈارک سیرکلو بڑ جائیں گے رنگڑ آ جائیں گے پھر کیا وہ نہیں لگیں گی؟“ میں تصور میں مام کی ماند بڑی خوبصورتی دیکھ کر کانپ جاتا تو خود کلا کی عادت ایسے مجھے بچپن میں ہی ڈیڈے مجھے بہت کم نظر آتے وہ اکثر مختلف دوروں پر ہی رہا کرتے تھے میرے نزدیک ان کی حیثیت ایک سا رہا تھا ان کی طرح بھی جنہیں دیکھ کر سرسری لہجے میں ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ وہ ش کرنا ہے پہلو ڈیڈے بھی اتنی سیلی کی تھائی تھی تھذیب بھی مجھے تو اپنے مام ڈیڈے میں بھی کپڑوں کی گرجوشی نظر نہ آتی تھی وہ ہتھوں بعد ملے مہمانوں کی طرح بہت کم ٹوڈی پوائنٹ لنگتو ہوتی جیسے دو کلائٹ بات کرتے ہیں اب آپ کہیں گے میں تو بچہ تھا مجھے ان باتوں کی کیا سمجھ؟ جی نہیں میں ذہن تھا مجھے خاموش رہ کر مشاہدے کی عادت تھی میری آبرویشن تھی مگر ایسا کیوں تھا یہ بات سمجھنے سے میرا ذہن قاصر تھا ”کبھی کبھی مجھے لگتا کہ ہم ایک ٹکون کے تین پوائنٹ ہیں جو ایک دوسرے سے جوائنٹ تو ہوتے ہیں مگر ہوتے دور ہیں اور بھی ملنے کی کوشش بھی نہیں کرتے پھر اچانک ایک دن یہ ٹکون بھی ٹوٹ گیا“ میری سالگرہ قریب تھی اور میں اپنے ذہن میں کئی دنوں سے اس کی پلاننگ کر رہا تھا کہ یہ پارٹی چھپلی پارٹیز سے شاندار کیسے بنائی جائے اسکول سے واپس آیا تو مام اپنے ہمراہ کئی سوٹ کیمز لئے لاڈ میں گھڑی تھیں۔

”آپ کہیں جاری ہیں؟“ میں نے ڈوبتے دل سے سوٹ کیمز کی تعداد پر نظر رکھتے پوچھا تھا (تو کیا مام میری برتھ ڈے پر نہیں ہوں گی)

”یس مائے ڈارلنگ تمہارے ڈیڈے نے مجھے ڈرائیورس کر دیا ہے۔“ میرے قریب آنے پر میرا گل

تھپتھپاتے ہوئے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ عام سے لہجے میں انہوں نے دھماکا کیا تھا میری آنکھیں پھٹ گئیں اور آواز گم ہو گئی دس سالہ لڑکے کو ڈرائیورس کا مطلب اچھی طرح پتا تھا وہ آگے بڑھ گئیں تو مجھے ہوش آیا میں بیگ چھین کر ان کے پیچھے بھاگا۔

”مام پلیز رک جائیں۔“ اور وہ کار کا دروازہ کھولے لمحے بھر کے لئے رکیں میرے قریب پہنچنے پر گاڑی میں بیٹھ گئیں میرا سانس پھولا ہوا تھا آنسو بہہ رہے تھے میری دنیا بکھر رہی تھی اور وہ مطمئن تھیں۔

”ڈیڈے ڈیڈے ایسا کیوں کیا؟ آپ لوگوں کا تو کوئی جھگڑا بھی نہیں تھا“ میری بات پر انہوں نے دندو سے ہاتھ باہر نکالا میرے آنسو صاف کرنے کے لئے نہیں گال تھپتھانے کے لئے ایک بار چہرہ مسکرائیں اور بولیں۔

”ویک اینڈ پر ناٹو کے گھر آ جانا“ وہ چلی گئیں میں وہیں کھڑا رہ گیا اپنے آنسو کے ساتھ اکیلا تھا ”آئی سلی میرا ہاتھ پکڑ کر اندر کمرے لے آئیں میں خاموشی سے مام کے کمرے کی طرف بڑھ گیا میں وہاں کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا انہیں محسوس کرنا چاہتا تھا دروازہ کھلا تھا اور ڈیڈے رانگ چیز پر بیٹھے تھے میں دروازے میں ہی کھڑا ہو گیا ان کی پردہ زنی کی طرف پشت تھی سو میں ان کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ پایا کہ کیا وہ بھی مام کی طرح مطمئن تھے ہاں وہ مجھے دیکھ پائے تھے میں کچھ دیر وہیں کھڑا رہا پھر دروازے میں ہی سے پلٹ گیا مجھے ڈیڈے کے لئے کچھ بھی ملی نہیں ہوا تھا نہ میری نہ ترجم مام انہیں چھوڑ گئیں انہوں نے مام کو ڈرائیورس دی ہے۔

اپنے کمرے میں آ کر میں صورت چھوٹ کر رو دیا میری خوبصورت ماں مجھے چھوڑ گئی تھی مجھے ماتم تو کرنا تھا بہت دیر تک رونے کے بعد میں ڈرائیورس کی وجہات پر غور کرنے لگا بے شک وہ عام شادی شدہ جوڑوں کی طرح نہیں تھے مگر ان میں کوئی جھگڑا بھی نہیں تھا تو انہیں ڈرائیورس کی وجہ؟ بہت دیر تک سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جنگلیوں کی طرح لڑنے کے بجائے انہیں ایک فائدہ تو لوگوں کی طرح پراسن طریقے سے الگ ہو گئے ہاں وہ ایسی زندگی کب تک گزار سکتے تھے اور مجھے اس کا کیا فائدہ؟ تصور وار نظر آئے اگر انہوں نے بھی ہم لوگوں کو وقت دیا ہوتا تو آج ایسا نہ ہوتا میں ہر ویک اینڈ ناٹو کے ہاں گزارنے لگا کہ میں وہاں جا کر خوش نہ ہوتا تھا مام کی جھلک اب بھی ویسے ہی دھتی جیسے گھر میں نظر آتی تھی وہ ہر گز اچھی تھیں کروش کرتیں اور آگے بڑھ جاتیں ڈیڈے مصروفیات پہلے سے بھی بڑھ گئی تھیں میں نے فیصلہ کیا کہ میں اب ہر ویک اینڈ ناٹو کے گھر نہیں گزاروں گا ویسے بھی میں بڑا ہو رہا تھا مام کے فوہیا سے باہر نکل رہا تھا ان لوگوں کو یہ پتا نہ تھا کہ میں تو مجھے بھی ان کی ضرورت نہیں ہے میں یہ سوچتا اور بار بار خود کو باور کراتا ویک اینڈ پر دوستوں کو گھر بلا لیتا ان دوست کے گھر چلا جاتا تاہم خوب بلا لگتا مومج مستی کرتے شرارتوں میں میرا دمغ خوب چلتا بلکہ دوڑتا تھا کوئی بھی مشن امپائل ہوتا شمر کو دے دیا جاتا میں اپنے دوستوں میں مقبول ہونے لگا تھا چپ چاپ کونے میں بیٹھ کر ہر چیز کو غور سے دیکھنے والا شمر اب اپنے دوستوں کا لیڈر بن چکا تھا مجھے یہ سب بہت قیمتی نیٹ گر رہا تھا زندگی کمرے میں دیکھی ہو کر بیٹھنے یا ایک کونے میں ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ گرائے بیٹھ کر سوچنے کا نام نہیں ہے زندگی تو ہر شے کو چنگیوں میں اڑانے کا نام ہے تاکہ اسے ذہن پر سوار کر لینے کا نام زندگی شرارتوں اور مسرتوں کا نام ہے جب تک میں پس منظر میں تھا چاہے ہر کلاس میں ٹاپ کرنے والا ذہن لڑا تھا کوئی مجھے اتنا نہ جانتا تھا مگر اب مجھے ہر منظر میں رہنا بلکہ بھر پور طریقے سے اپنی موجودگی کا احساس دلانا اچھا لگتا تھا میں نے نیا سبق سیکھا تھا دنیا انہی کی ہوتی ہے اور انہیں ہی پسند کرتی ہے جو اپنا دکھ چھپا کر ہنستے ہیں اس دنیا میں رونے والوں کے لئے کوئی جگہ نہیں آنسو گر گئیں بھی تو انہیں اپنے اندر ہی دن کر لینا چاہئے ایسے ہی ایک اتوار کی شام جب میں

کرنے پر ایک ایک ڈنیل جاننے کے بعد کہ مجھے کس لئے پیسے چاہئیں دے دیا کرتی تھیں غرض یہ تین سال میں نے ان بدتمیز بد بھائی کے ساتھ دب کر گزارے تھے مگر پھر ہائی اسکول پہنچنے کے بعد میں نے ان سے دہنا چھوڑ دیا مجھے سیم کو ہرانا تھا کیونکہ میں اس سے تنگ آ چکا تھا اور اس سے ہار ہار کر مندہ بھی ہوتا رہتا تھا اس کے لئے مجھے طاقت چاہئے تھی اور اس کے حصول کے لئے میں نے اسکول کا جم جو ان کر لیا صرف چھ ماہ میں ایک خوبصورت ورزشی جسم کا مالک بن چکا تھا میں فخر تو تھے ہی ابھی لڑکیاں مجھے دیکھنے کے لئے رک جاتیں مجھے کئی لیٹر موصول ہونے لگے تھے اور جس دن میں نے سیم کو اٹھا کر چار فٹ دور پھینکا میں لوگوں کے لئے بالکل ہی ہیرو بن گیا سیم نے اس دن کے بعد مجھ سے براہ راست الجھنا چھوڑ دیا۔

سارہ کو مجھ پر کرش ہے مجھے وہم ہونے لگا تھا وہ اپنی دوستوں کے ساتھ کھڑی ہوتی تیرنی طرف اشارے کر کے کھسک پھرتی ان لوگوں کو لگتا کہ میں انہیں نہیں دیکھ رہا مگر میں ان کی ہر حرکت نوٹس کر رہا ہوتا تھا یہ شک یقین میں تب بدل جب ایک رات روحا آئی نے میرے اور سیم کے جھگڑے کے باعث ہم دونوں کا کھانا بند کر کے ٹیبل سے اٹھا لیا ویسے یہ کوئی پہلی بار نہ تھا وہ اکثر ایسا کیا کرتی تھیں اور سیم کے ساتھ میں خواہ مخواہ پست تھا جبکہ میری کوئی غلطی نہیں ہوتی تھی میں کبھی جھگڑے میں پہل نہیں کرتا تھا اور پھر سیم تو کچھ دیر بعد ان کے سامنے ہی سے فریج سے کچھ کھانے کو لے جاتا تھا مجھے بھوکا سونا پڑتا تھا اس رات مجھے حد سے زیادہ انسلیٹ فیمل ہوئی تھی کیونکہ روحا آئی کا پی پی ہو پیر کھانا اسلٹنگ تھا میں نے صبح کا بریک فاسٹ کیا ہوا تھا دوپہر کو گھر نہ آنے کے باعث میں نے صبح بھی نہیں کھانا کھانے والے لے لے میں نے سیم کو دہاتے سونے کی کوشش کرتے میں سوچ رہا تھا مجھے انڈیپنڈنٹ ہو جانا چاہئے اور جلد سے جلد جگہ چل کر ڈیڑھ گھنٹہ ڈورناک ہونے پر میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تھا سارہ نے لے لے کھڑی تھی ایک باؤل میں کھڑے تھے ڈرائیگ سب اور دو دھکا کھلاں۔

”کیا ہے؟“ میں نے پھاڑ کھانے والے لے لے میں پوچھا تھا انڈیڈ میں تھا کہ وہ مجھے یہ سب دکھا کر میرے زخموں پر نمک پاشی کرنے آئی ہے مگر اس نے فرے میری طرف بڑھا دی تھی سارہ اور روحا آئی نے عین اسی لمحے میں جیران رہ گیا۔

”کیوں لائی ہو یہ کیا تمہیں نہیں پتا تمہاری مام نے میرا کھانا بند کیا ہے۔“ میں نے لے لے میں کہتا دروازے سے پلٹ گیا حالانکہ میرا پیٹ تو کہہ رہا تھا کہ فوراً ٹرے پر جھپٹ پڑوں مگر نہیں ہو سکتا یہ ان دونوں بہن بھائیوں کی کوئی چال ہوتی میں ہاتھ بڑھاتا اور وہ منہ چڑاتی ٹرے لئے واپس بھاگ جاتی مگر وہ کمرے میں آگئی ٹرے بے پڑ کر رکھ کر وہ ہیں بیٹھ گئی۔

”پلیز ٹمر یہ کھا لو تم نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔“ اس کی آواز لرز رہی تھی میں نے سر اٹھا کر دیکھا اس کی آنکھوں میں پانی تیر رہا تھا اور میں نے اس پر احسان عظیم کرتے ہوئے ٹرے اپنی جانب کھکالی اس کی عنایتوں کا دائرہ محدود نہیں رہا بڑھتا چلا گیا جس کے نتیجے میں میرے اس سے تعلقات کچھ بہتر ہو گئے اس رات ہونے والی بے عزتی کے بعد میں سجدگی سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے بارے میں غور کرنے لگا مگر اس کے لئے مجھے جاب چاہئے تھی اور جاب مجھ ل نہیں کئی تھی میں ڈین تھا کلاس کے بہت سے اسٹوڈنٹس مجھ سے ہیلپ لیا کرتے تھے میں نے ہیلپ کے لئے باقاعدہ معاوضہ مقرر کر دیا اسائنمنٹ اور نوٹس بنانے میں ہیلپ اولٹی ٹو ڈائریکٹ اسائنمنٹ بنانے کی فیس 8 ڈالرز نوٹس بنانے کی فیس 5 ڈالرز اور چونکہ دنیا میں نکلنے کی کمی نہیں اس لئے میرا بزنس خوب چل نکلا گھر میں اس بارے میں کسی کو خبر نہیں تھی میں اپنی آمدنی خفیہ مقام پر سیو کر رہا تھا اس دوران ڈیڈ آئے تو میں نے ان سے

اکاؤنٹ کھلوانے کی فرمائش کر دی وجوہات کے طور پر جو کچھ میرے ساتھ ماضی میں ہوتا رہا تھا سنا دیا وہ میرے ساتھ گئے اور اکاؤنٹ کھلوا دیا اور جب میں نے اس میں اپنی آمدنی جمع کرانی تو ان کی آنکھیں کھل گئیں۔

”اتنے پیسے کہاں سے آئے تمہارے پاس؟“ ان کا لہجہ سخت تھا۔

”میں جاب کرتا ہوں۔“ میں نے شانے اچکائے اور واقعی وہ میری جاب ہی تو تھی۔

”پیسہ انسان کو بہت سی اخلاقی برائیوں میں مبتلا کر دیتا ہے مجھے یقین ہے تم ایسا کچھ نہیں کرو گے اور وہی بھی میری ہی تم پر ہمیشہ نظر ہے۔“ بینک سے نکلتے انہوں نے کہا تھا اور میرے خیال میں یہ بس دھمکی تھی اگر ان کی مجھ پر نظر ہوتی تو میں یہاں نہ ہوتا خیر ہائی اسکول کے چار سالوں میں میں نے خوب ڈالرز کمائے پاکستان سے بھی کئی میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہوتی تھی بہت کچھ میں پارٹیز اور ہلاکے میں اڑاتا تھا مگر اس کے باوجود میں مجبور نہیں پایا وجہ روحا آئی کے گھر کے سخت اصول تھے میں نے وہاں سے شفٹ ہونے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہو پایا ایک بار شفٹ ہوا ڈیڑھ ایسٹ پیچ گئے اور مجھے واپس لے آئے ایک بار بے انگ گیسٹ کے طور پر رہنے لگا وہ دن بعد ہی لینڈ لیڈی نے میرا سامان اٹھا کر باہر پھینک دیا اور مجھے کسی بدصورتی طرح گھر لوٹنا پڑا تو مجھے بہت افسوس ہوا کہ روحا آئی نے مجھے اپنے گھر میں رکھ کر کوئی احسان نہیں کیا تھا ڈیڈ انہیں باقاعدگی سے پے کیا کرتے تھے (مگر کئی کسی پر احسان کر ہی نہیں)

میں نے شاندار گریڈز کے ساتھ ہائی اسکول میں ٹاپ کیا تھا ڈیڈ بہت خوش اور پر جوش تھے میں مانیٹر اسکرین پر خاموشی سے ان کے خوشی کے لمحے دیکھ رہا تھا وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ میں کس یونیورسٹی میں یا کالج میں جانا پسند کروں گا ٹاپ پوزیشن پر آسانی اور خوشی سے مجھے ویلکم کر سکی اور کوئی بھی یونیورسٹی مجھے لینے پر فخر کرے گی مگر میں کچھ اور سوچ رہا تھا کہ میں نے خاموشی سے اپنی پینلنگ کی کسی ٹکٹ کیا اور فلائٹ سے صرف دو گھنٹے پہلے بہت اطمینان سے روحا آئی کی اطلاع دی وہ سب ہکا بکارہ گئے انہیں یقین نہ آیا کہ میں اپنا شاندار کیریئر چھوڑ کر جا رہا ہوں سارہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اس نے مجھے روکنے کی کوشش کی تھی مگر مجھے جانا تھا میں چلا آیا۔

ڈیڈ میرے آنے پر خوش نہ تھے انہوں نے مجھے کافی کچھ سنایا حیرت کی بات یہ تھی کہ میں جن کے پاس مجھ سے بات کرنے کا وقت نہ ہوتا تھا آج میرے کیریئر کے لئے فکر مند تھے وہ مجھ کو برقرار رکھنے کے لئے میری سکون سے بیٹھا سوچتا رہا کیا واقعی گیند اب میرے کورٹ میں ہے میرا ارادہ تو یہ تھا کہ کچھ وقت یا کم از کم میں گزرا کر واپس جا کر ایڈمیشن لوں گا جس کی میں نے کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی مگر اب ڈیڈ کی حالت اور غصہ مجھے کافی مزہ دے رہا تھا اگر وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ میں مستقل آ گیا ہوں تو اب مجھے اس پر عمل کرنا تھا انہیں رنج کرنے میں مجھے کافی مزہ آ رہا تھا۔

”پاکستان میں کئی اچھی یونیورسٹیز ہیں۔“ میں نے کہا تھا۔

”ان کا بارہ کی یونیورسٹی سے کیا مقابلہ؟“ وہ غصے سے بولے میں نے شانے اچکا دیے اور وہ اپنا غصہ نفلز کرنے لگے اور جب انہیں یقین ہو گیا کہ میں کسی صورت واپس نہیں جاسے والا تو انہوں نے پھر اپنی اس بوئیس میں ایڈمیشن لینا چاہا اور میں جو نام لینے لگا تھا ان کی شکل دیکھنے لگا۔

”ابھی تو میں نے کہا تھا کہ ایک انٹرویو لی۔“

”ابھی میں کہیں گئی لیکن میں نے لکھا چاہتا تھا کہ پھر ریٹ کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

نہیں تھا کہ میں اپنی بڑھائی کے بارے میں سیریس نہیں تھا یا صرف انہیں زچ کرنے کے لئے اپنا کیریئر داؤ پر لگا تا بس جس یونیورسٹی کے بی بی اے پروگرام میں، میں ایڈمیشن چاہتا تھا اس کا نیویشن شروع ہونے میں چھ سات مہینے تھے مگر یہ بات میں انہیں کیوں پتا تو؟ ایک بار پھر میں ان کا پارہ ہانی کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا وہ بولتے رہے اور میں بے زاری سے کان سے کبھی اڑاتا اپنے کمرے میں آ گیا۔

اپنے بینک بینکس سے میں نے کار خریدی اور جس دن اسے سڑکوں پر دوڑا تھا گھر آیا مجھے لگا میں کسی حد تک انڈیپنڈنٹ ہو گیا ہوں ڈیڈ نے کار دیکھ کر کوئی رد عمل ظاہر نہ کیا بس اتنا کہا کہ وہ میری سالگرہ پر مجھے کار گفٹ کرنے والے تھے میں نے شانے اچکا دیئے امریکیوں سے سیکھا تھا بات پر شانے اچکانا اس کے بعد اپنے کلب کے دوستوں کے ساتھ ایک ٹور پلان کیا اور پاکستان کے ٹور پر نکل گیا، صبح معنوں میں آزادی کے مزے لوٹ رہا تھا ڈیڈ نے میرے جانے کا ساتھ تو خاموشی سے ایک چپک میری طرف بڑھا دیا حالانکہ میں نے ان سے پیسے نہیں مانگے تھے میرا اکاؤنٹ کافی تھا مگر ہاتھ آئی نعمت کون ٹھکراتا ہے میں نے چپک لے لیا اپنی سالگرہ پر میں اپنے دوستوں کے ساتھ تھا جب بے فکری اور آزادی کے چاہہ ماہ گزار کے میں گھر آیا تو بہت تروتازہ تھا اگلے دن ناشتے کی ٹیبل پر ایک فائل انہوں نے میری طرف بڑھائی کار میں خود لے چکا تھا سو ایک نیو ریڈیسی میں ایک لکڑی فلیٹ انہوں نے میرے نام سے خرید کر مجھے گفٹ کیا تھا اب اسے برتھ ڈے گفٹ ڈیڈ کو معلوم نہ تھا انہوں نے مجھے خود سے الگ ہونے کا شکیبائیت تھا یا ہے اور جب تو مجھے بھی علم نہ تھا۔ وہ میرے ساتھ وقت اسپنڈ کرنا چاہتے تھے چاہتے تھے میں بریک فاسٹ اور ڈنر ان کے ساتھ کیا کروں پر اب میری دنیا ان کے گرد نہیں گھومتی تھی میری دنیا وسیع ہو گئی تھی اب مجھے ضرورت نہ تھی پر جب بھی موقع ملتا وہ میری فوج پر پلاننگ ڈسکس کرتے میرے ساتھ فریک ہونے کی کوشش کرتے تھے میری پوزیشن چاہتے تھے میں نے ایڈمیشن لے لیا تو وہ پرسکون ہو گئے مگر اب بھی اپنی حرکتوں سے میں نے انہیں زچ کرنا چاہتا تھا۔

”تمہاری ماں تم سے ملنا چاہتی ہیں۔“ میں لیٹ نائٹ گھر پہنچا تھا اور ملازمین میں ٹہلتے میرا ہی انتظار کر رہے تھے انہیں نظر انداز کرتے میں نے کمرے میں جانے کے لئے سیڑھیوں پر کودا تھا مجھ سے بولتے میرے قریب آئے میں چونکا تھا مگر میرے تاثرات سے کچھ ظاہر نہ ہوا مجھے کچھ نہ بولنا پکا کر وہ سر ہلے۔

”اگر تم جانا چاہو تو میں۔“ میں لیٹ نائٹ گھر پہنچا تھا اور ملازمین میں ٹہلتے میرا ہی انتظار کر رہے تھے انہیں نظر انداز کرتے میں نے کمرے میں جانے کے لئے سیڑھیوں پر کودا تھا مجھ سے بولتے میرے قریب آئے میں چونکا تھا مگر میرے تاثرات سے کچھ ظاہر نہ ہوا مجھے کچھ نہ بولنا پکا کر وہ سر ہلے۔

”تمہاری ماں بات کرنا چاہتی ہیں۔“ انہوں نے لیپ ٹاپ میرے سامنے کیا وہ کسی ہاسٹل کے کمرے کا منظر تھا بڈ پر لیٹا خیف وجود میری خوبصورت فیشن ایبل مام کا تھا میں شاکدہ گیا اور جب اس اثر سے باہر آیا تو لیپ ٹاپ بند کر کے ڈیڈ کے ہاتھ میں تھا دیا مجھے سوائے شاک کے ان کے لئے کچھ فیمل نہ ہو رہا تھا اور احساس سے عاری انسان ان لوگوں نے ہی مجھے بنایا تھا۔

”وہ بہت بیمار ہیں تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔“ وہ تاسف سے دیکھ رہے تھے میں نے شانے اچکا دیئے پھر بہت بار ان کے اصرار پر میں نے ان سے ہیلو ہائے کیا طبیعت پوچھی اور گیٹ ویل سوئیں کہہ کر لائن کاٹ کر اسٹڈی سے باہر نکل آیا پیچھے سے ڈیڈ مجھے کہہ رہے تھے مجھے ڈھنگ سے بات کرنی چاہئے تھی۔ میرا بی بی اے کا

ایسٹ ایئر تھا کہ سارہ اپنا ہائی اسکول ختم کر کے پاکستان چلی آئی سارہ کی دوھیال یہیں مقیم تھی سو وہ وہیں ٹھہری تھی بہت جلد مجھے اندازہ ہوا کہ بچپن کا کرش اب تک موجود تھا اس نے میری یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا بہت جلد نئے دوست بناتے اور اپنے گروپ میں مجھ سے انٹرویو کر لیا اس کے دوست مجھ سے مرعوب تھے سو میری بھی ان سے اچھی خاصی دوستی ہو گئی میری دوستی کا دائرہ کار تو ویسے ہی بڑا تھا بی بی اے فٹش کر کے میں نے ایم بی اے میں ایڈمیشن لیا ڈیڈ چاہتے تھے کہ میں اب بزنس بھی جو ان کر لوں مگر میں نے انٹرن شپ آفر قبول کر لی وہ ہانتے تھے کہ وہ مجھے قائل نہیں کر سکتے سو خاموش ہو گئے اسی دوران ڈیڈ نے دھماکہ کیا انہوں نے شادی کر لی تھی ایک سابقہ فلم ایکٹریس سے مجھے واقعی دھچکا لگا تھا اور یہ دھچکا اس عورت کو اپنی ماں کی جگہ دیکھنے پر ہرگز نہ تھا بلکہ یہ تو وہ حصار توڑنے پر تھا جو اپنے تئیں میں نے ڈیڈ کے گرد قائم کیا تھا وہ کسی مدار کی طرح میرے گرد چکر لاتے رہیں اور میں نظر انداز کرتا رہوں بالکل ایسے ہی جیسے وہ لوگ کیا کرتے تھے میرے بچپن کی محرومیوں کو تسکین دہانی یہ سب کر کے ڈیڈ کی شادی ایک ہاٹ نیوز تھی جس پر سب بات کرنا چاہتے تھے خاندان والے میڈیا والے میرے یونیورسٹی اور بھتیجیوں کو کریدتے میری بے زاری بڑھتی جاتی، مجھے لگتا ڈیڈ نے مجھے شکست دی ہے میں نا اہمیت ملنے پر دل ہی دل میں پھولا نہ سنا تھا اب مجھ گیا پر یہ سب کچھ میں نے ظاہر نہ ہونے دیا اور بہت جلد وہ کوکھ سنبھال لیا ایک بات تھی جس نے اسے تاثرات پر قابو پانے میں کمال رکھتا میرے دل کی بات میرے چہرے سے ظاہر نہ ہوتی تھی میرا چہرہ وہی کچھ ظاہر کرتا جو میں ظاہر کرنا چاہتا اور میں نے وہی ظاہر کیا کہ مجھے ان کی شادی سے فرق نہیں پڑا۔

اس عورت کو دیکھ کر نا گواری اور بے زاری میرے اندر اٹھتی تھی عجیب مصنوعی اور پلاسٹک سی عورت تھی وہ بہت گلیمرس تھی بلکہ دیگر کبوں تو زیادہ بہتر ہے آدھاروں وہ شب خوالی کے نا کافی لباس میں گھوما کرتی تھی اور بقیہ آدھار کسی بے ہودہ ساڑھی یا گاؤں میں پلیس نظر آتی سالانہ میل جول سال امریکا میں گزار کر آتا تھا خود سے سرکل میں ایک سے ایک طرح دار لڑکی تھی مگر اسے دیکھ کر یہ دمار چھٹنا اٹھتا تھا اسے مردوں کو رجمانے لے سارے گراتے تھے جی تو ڈیڈ نے اتنے سال سنکل رہنے کے بعد اس سے شادی کر لی تھی جب وہ لگاؤ میں اپنے ہاتھ کی تین انگلیاں میرے گال پر پھیر کر بھنی ڈار لنگ کہہ کر مخاطب کرتا تھا میرا چہرہ ضبط کے باوجود سرخ پڑتا اور وہ بہت محظوظ نظروں سے مجھے دیکھا کرتی تھی میں نے اپنی آکسائیٹ کا اظہار ڈیڈ کے سامنے بھی کرنا شروع کر دیا میں برملا اس کے سامنے ڈیڈ سے کہا کرتا اگر انہیں شادی کرنی تھی تو ڈھنگ کی عورت سے کرتے اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑتے۔ اس نے جس خواہش کا اظہار مجھ سے کیا تھا اس نے میرے قدموں تلے سے بین کھینچ لی تھی میری پیشانی پر پسینے کے بے شمار قطرے نمودار ہو گئے تھے ناخنیں کا پٹنے لگی تھیں پیشانی سے پسینہ پچھتے میں نے اسے دیکھا جو سامنے صوفے پر ناگ پر ناگ چڑھائے بیٹھی میری حالت سے خطا اٹھا رہی تھی۔ ”تم ایک گھٹیا عورت ہو۔“ نفرت سے اسے دیکھتا اپنے قدموں کی کرش پر قابو پاتا میں اپنے کمرے میں آیا بہت سوچنے کے بعد میں نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور سامان پیک کرنے لگا وہ بہت عمار اور گھٹیا عورت تھی وہ مجھے اپنی نظروں میں گرانی یا ڈیڈ کی نظروں میں مجھے دونوں ہی صورتوں میں منظور نہیں چاہے مجھے ڈیڈ کی اتنی واہ نہیں تھی مگر یہ سچ تھا وہ میرے باپ تھے اور میں ان کی نظروں میں گر کر زندگی نہیں گزار سکتا تھا اس رات ڈیڈ نے بہت ہنگامہ کیا اور میں نے اس سے زیادہ میں کسی بھی صورت یہ گھر چھوڑنا چاہتا تھا اور وہ کسی صورت یہ نہیں چاہتے تھے اور وہ فساد کی جڑ اس وقت کسی پارٹی میں گئی تھی۔

”آخر تم چاہتے کیا ہو؟“ وہ چیخ رہے تھے۔
 ”اس عورت کو طلاق دے دیں مجھے اس گھر میں رکھ لیں یا اسے۔“ میں نے بمشکل خود کو اسے گھسیا اور غلیظ کہنے سے باز رکھا تھا۔

”کیا تکلیف ہے تمہیں اس سے؟“

”وجہ بتانی میں ضروری نہیں سمجھتا۔“ شانے اچکا کر بولتا میں نے قدم بڑھا دیا۔

”باد رکھنا شرمیرے بغیر تم کچھ نہیں ہو۔“ وہ پیچھے سے چلائے اور وہ ٹھیک کہہ رہے تھے میں واقعی کچھ نہ تھا اپنی تعلیم مکمل ہونے تک مجھے ان کے پیسے کی ضرورت تھی میری انٹرن شپ بہت ہی قلیل تھی جو میرے اخراجات پورے کرنے کے لئے ناکافی تھی گھر کے پوٹیلٹی بلز، گاڑی کے اخراجات میرے تعلیمی اخراجات میری گروسری چند مہینوں میں میرا اکاؤنٹ تینس زریو ہو چکا تھا میرے پاس سمسٹر فیس بھرنے کے لئے بھی پیسے نہ تھے امریکا والا حربہ یہاں کام نہ آیا تھا امیروں کے بچوں کو بڑھانے کے لئے کوچنگ سینٹرز تھے انہیں کیا ضرورت تھی مجھ سے ہیلپ لینے، ملک کے انہوں نے ڈیڈ کو کال کر کے انہیں اکاؤنٹ میں پیسے ڈالوانے کو کہا وہ خاموشی سے میری بات سنتے رہے آخر میں انہوں نے ہٹا دیا۔

”مجھے پیسے دے کر اپنے گھر کوئی احسان نہیں کریں گے آخر کو یہ سب کچھ میرا ہی ہے میں آپ کا قانونی وارث ہوں۔“ انہوں نے محل سے میری نگاہیں برداشت کرنے کے بعد پوچھا۔

”تم گھر کب آ رہے ہو؟“

”کیا آپ نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی؟“ انہوں نے ٹھیکھا تھا انہوں نے فون رکھ دیا۔

اگلی صبح تک میرا اکاؤنٹ ری فل ہو چکا تھا مجھے سیدھی گئی میرا اس امادٹ سے کم تھی جو مجھے ہر ماہ ملا کرتی تھی مگر میرے لئے تو یہ بھی غنیمت تھا میں نے سمسٹر فیس بھر لی اور اپنے اخراجات محدود کر دیئے میرے دوستوں کو میرے کسی کلیش کا علم نہ تھا وہ تو بول اکیلے رہنے کو میرا ایڈوکیٹ تھا انہیں آگاہ کیا جاتا تھا بلکہ گھر کے جگہ میری اکثر یہی کوشش ہوتی کہ اپنے گھر میں م اور دوستوں کے گھر میں ناگوار نہ رہ سکوں اس کے دو فائدے تھے ایک تو میری تنہائی کو سہاگئی مل جاتے دوسرے میرے کھانے کے اخراجات نہ بڑھنے کے برابر ہوتے تھے۔

یونیورسٹی نے ویلنٹائن ڈے پر ایک کنسرٹ بھی آرگنائز کیا تھا اور اس میں اقراء اپنی بیسٹ فرینڈ کو لائی تھی ہم سے ملوانے دو پینڈا اپنے چاروں طرف پھیلانے جھلکتی سنکتی ہونٹوں پر زبردستی کی مسکراہٹ بجائے پہلی نظر میں وہ مجھے پینڈو لگتی تھی اس کی ایک ایک حرکت چیخ چیخ کر اعلان کر رہی تھی کہ اسے زبردستی لایا گیا ہے میں نے ہاتھ بڑھایا تو بول پیچھے پیچھے تھی کہ میں اپنے قہقہے پر قابو نہیں رکھ پایا تھا اس کے چہرے پر ناگواری چھلکی تھی وہ ہمارے ساتھ مفر تیل نہیں لگتی اس لئے کنسرٹ شروع ہونے پر میں سب کو اشارہ کرتا آٹھ گیتا کہ وہ کھل کر انجوائے کر سکے وہ مجھے اچھی لگتی تھی خاص طور پر اس کے لمبے سلی سیاہ بال جی جی مجھ سے وہ غلطی سرزد ہوئی میں نے بونہی اس کے جوڑے سے شرارتا کچھ کہنا تھا اور وہ غضب ناک ہو گئی تھی جب میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کچھ چار دن بعد وہ اپنے جملہ حقوق کے ساتھ میری ملکیت میں ہو گئی میرے پلانز میں شادی دور دور تک بھی نہ تھی جب اقراء میرے پاس آئی تھی تو بے توہی سے اس کی بکواس سننے تک میرے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ میں اس سے شادی کی حامی ہوں گا میں اسے پسند نہیں آیا تھا یہ بات میں جانتا تھا مگر وہ مجھے اچھی لگتی ہے وہ یہ بات نہیں جانتی تھی بیٹھے بیٹھے مجھے خیال آیا میری بیوی بننے کے بعد اس کے چہرے پر کیسے رنگ ہوں گے جس کے لئے اس

کے چہرے پر ناگواری اور آنکھوں میں ناراضگی تھی اور اس شخص کے لئے اب وہاں کیا ہوگا اور میں نے یوں اچانک حامی بھری کہ میں خود حیران رہ گیا۔ وہ میری زندگی میں میرے گھر میں چلی آئی اور بہت جلدی میرے لئے لازم و ملزوم ہو گئی وہ میرے لئے سراپا محبت بن گئی کہ میں خود کو اس سے محبت کرنے سے روک نہیں پایا اس کی ایک ایک ادا محبت تھی اور وہ اس کا اظہار کرنے میں ذرا تجوی نہیں کیا کرتی تھی مگر میری ایک گہری نگاہ سے ہی شرم سے سرخ ہو جاتا کرتی تھی وہ خیال جس کے لئے میں بچپن سے ترستا تھا کہ کوئی میرا رکھے وہ اس نے رکھا وہ محبت جو مجھے چاہئے تھی اس سے ملی مجھ جیسے محبت کے مارے شخص کی ملکتی روح کو قرار آ گیا تھا میری بے ترتیب زندگی کو اس نے ترتیب دی وہ فغظوں میں بے شک اظہار نہ کرتی مگر پھر بھی اظہار کیا کرتی کہ اسے مجھ سے محبت ہے اور میں نے کبھی خود کو اظہار کرنے سے بھی عدیا وہی خود کو چھپانے کی بیماری۔ اور پھر محبت کا وہ عرصہ حد مختصر ثابت ہوا شاید مجھے محبت راس نہیں آتی تھی میں نے خود ہی ہمارے بیچ دوری پیدا کر دی اور اسے دورا ہے پر کھڑا کر دیا کہ چنو مجھے یا پھر اسے جو ابھی دنیا میں نہیں آیا اس کی نظریں مجھ سے اٹھا کرتی شکوہ کرتیں مگر میں نظر انداز کر کے گزر جاتا اور پھر اس نے مجھ پر اسے چن لیا اور میری زندگی سے چلی گئی مجھے یقین نہ آیا مجھے یقین آ بھی کیسے سکتا تھا اس کی محبت کے بھار کے تو میں نے اسے دورا ہے پر کھڑا کیا تھا وہ مجھے چھوڑ گئی ہے اس احساس نے میرا دل جھیر دیا اور میں جو رونا بھونچکا تھا میری آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں مگر وہی میری ضد اور ہٹ دھرمی وہ ہی خود کو باور کرانا ٹھیک ہے جاؤ تم بھی نہیں اسے مجھے کسی کی پرواہ نا کسی کی ضرورت میں اپنے دل کو جھٹکنا رہتا اور باور کرنا رہتا میں نے خود کو بے انتہا مصروف کر لیا میرے رویہ جیکٹ نے کمپنی کو فائدہ پہنچایا اور میرے رزلٹ سے پہلے میری جاب کی ہو گئی جس کی مجھے کوئی شک نہ تھی اس دوران فارحہ کی امی فیضان انگل اور اقراء مجھ سے ملنے کی سر تو دو کوشش کرتے رہے میں نے صرف ایک بار ان سے فون پر بات کی بس اتنا کہا مجھے چھوڑ کر جانے والوں کی واپس میری زندگی میں کوئی جگہ نہیں۔ ڈیڈ مجھ سے ملنے آئی چلائے ان کی آمد سے پہلے کوئی نہ جانتا تھا کہ میں شرادو داؤ داؤ داؤ داؤ پر انرز کے مالک داؤ داؤ داؤ کی کاہنا اپنے باپ کی اتنی بڑی فرم چھوڑ کر یہاں معمولی جاب کرتا ہے میں جو سمجھتا تھا کہ ڈیڈ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے وہ سب جانتے جانتے چلے جانے کے متعلق بھی انہیں معلوم تھا ہمارے کلیش کی کیا وجہ تھی یہ معلوم نہ تھی انہوں نے پوچھی میں نے کہا ہاں بالکل اسے میں بات نہیں کرنا چاہتا وہ خاموش ہو گئے میری شادی کے باعث انہیں یہ نہیں چلا تھا کہ اس وقت ملک میں کون سا شادی کرنے والا ہے وہ بولتے رہے میں سنتا رہا وہ کبھی مجھ سے غافل نہیں تھے نا امریکا میں نا یہاں میرے ہاں شفت ہونے کے وقت وہ یورپ میں ہی تھے سوچتے کے اندر اندر مجھے کان سے پکڑ کر گھر لے گئے میری لینڈ لیڈی کو فون کر کے انہوں نے رقم آفر کی تھی بدلے میں اسے میرا سامان پھینکا تھا اس نے ایسا ہی کیا تھا میری پروگریس رپورٹ ہر پچھنے فون کر کے لی جاتی تھی روحا آئی کو وہ ہر مہینے میری رہائش کے لئے بکرتے تھے اور کبھی بہت کچھ ان کی طرف سے شکوے کم ضرور ہوئے تھے مگر ختم نہیں ہوئے تھے وہ میری طرف سے غافل نہیں تھے مگر انہوں نے مجھے بھی محبت بھی نہیں دی تھی انہوں نے با آسانی مجھے روحا آئی کے ساتھ امریکا بھیجا دیا شاید ان کے پاس میرے ان سوالوں کے جواب بھی ہوتے مگر میں سوال کرتا تب ناں مجھے تو دل میں دہانے کی بیماری تھی میں خاموشی سے انہیں ٹھٹھنے اور بولتے دیکھتا رہا پھر وہ میرے سامنے بیٹھ گئے چند لمحے سوچتے رہے پھر بولنا شروع کیا۔

”تم اس دور میں ہو شراب کہ با آسانی مجھے سمجھ سکتے ہو میں جانتا ہوں تمہیں اپنی ماں کے حوالے سے بھی مجھ سے بہت سی شکایات ہیں تم مجھے اپنی ماں کو چھوڑنے کا ذمہ دار سمجھتے ہو۔“ ان کے بولنے پر میں چونک کے

سیدھا ہو بیٹھا تو میرے دل کے بہت اندر گڑی بات تھی انہیں کیسے علم ہو گیا وہ مسکرائے تھے۔ تمہاری مام اور میں فرسٹ کزن تھے وہ بہت خوبصورت تھیں اور مجھے اس سے محبت ہو گئی کیلئے محبت وہ کسی اور کو پسند کرتی تھی اگر میں جان جاتا تو کبھی اس سے شادی نہ کرتا میرے تایا کے بڑے کو سہارے کی ضرورت تھی اور اس سہارے کے لئے اس نے اپنا آپ قربان کر دیا اسے مجھ سے محبت نہ تھی اور کبھی ہو بھی نہ پائی میں نے اس اذیت کو کم کرنے کے لئے خود کو بے انتہا مصروف کر لیا تاکہ ہمارا کم سے کم سامنا ہو سکے اور اس پتھر میں تم انور ہوئے جب اسے اپنا من پسند ساتھ ملا اس نے مجھ سے ڈائیورس لے لی ہر نیچے کے لئے اس کے ماں باپ کسی ہیروز کی طرح ہوتے ہیں میں تمہاری ماں کا بیج تمہاری نظروں میں خراب نہیں کرنا چاہتا تھا شراب جب وہ اس دنیا میں نہیں رہی تو تمہیں بتا دیا جتنا تو میں اب بھی نہیں چاہتا تھا مگر چاہتا ہوں کہ کم از کم ایک اس حوالے سے تم مجھے قصور وار نہ سمجھو۔ وہ تھکان سے مسکرائے تھے۔

”میں نے اس عورت کو طلاق دے دی ہے، تم گھر آ سکتے ہو شرم میں چاہتا ہوں تم یہاں سے ریزائن دے دو اور اپنا بزنس سنبھالو مجھے تمہاری ضرورت ہے۔“ میں کہنا چاہتا تھا کہ کبھی مجھے بھی ان کی ضرورت تھی مگر وہ پہلے ہی بول پڑے۔ ”جو میں نے تمہارے ساتھ کیا ہے شرم میرے ساتھ مت کرو پلینز میں تمہاری بے رخی بہت جھگٹ چکا ہوں۔“ میں نے خاموشی سے اپنا ریزائن ٹائپ کر کے باس تک پہنچایا اور ان کے ساتھ چلا آیا۔

☆☆☆☆

آج آفس میں کچھ خاص کام نہ تھا اس لئے الفت کو فون کر کے منع کرتے فارحہ عالیان کو یک کرنے اس کے کنڈرگارٹن آگئی عالیان اسے دیکھ کر خوش ہوا تھا عالیان کی نیچر سے بات کر کے وہ اس کی انگلی تھامے چل پڑی دس منٹ کی واک پر تو گھر تھا عالیان پر جوش اسے بتا رہا تھا کہ اس کے سرورکیشن اشارٹ ہو گئے ہیں اور وہ اس میں کیا کیا کرنے والا ہے وہ اپنے بیٹے کی باتیں سنو سننے کے لئے اس کی پیچ پیچ میں بات بھی کرتی مین روڈ پر پیزا ہاٹ کے سامنے عالیان کے قدم سست پڑے اس نے گردن اٹھا کر دیکھا اور معصومیت سے بولا۔

”مجھے بھوک لگی ہے۔“

”ہاں تو ہم گھر ہی جا رہے ہیں ناں نانوں نے عالیان کے لئے مزیدار لچ بنایا ہوا۔“

”مگر مجھے پیزا کھانا ہے۔“ وہ آنکھیں پٹیٹاتے بے چارگی اور معصومیت سے بولا تھا فارحہ نے اسے حذر سے دیکھا۔ ”فاسٹ فوڈ تو ہیلتھ کے لئے اچھے نہیں ہوتے۔“ وہ صرف شکل شرم کی کاپی نہ تھا اس کی پسند و ناپسند بھی شرم پر گئی تھیں اسے فاسٹ فوڈ پسند تھا وہ دھوکے کی جگہ اسے کافی پینا پسند تھا وہ اپنے باپ کی طرح ہی ذہین تھا بال کی کھال نکال دیا کرتا اتنے سوال کرتا کہ فارحہ زچ ہو جاتی اس کے باپ کی بے تربیتی اور گندگی کو فارحہ نے اس کے اندر چپنے نہیں دیا تھا اس معاملے میں وہ بہت سخت تھی اس نے بے چارگی سے گردن موڑ کر دور ہوتے ریسٹورنٹ کو دیکھا اور فارحہ سے اس کی افسردگی دیکھی نہیں گئی۔

”جب ہم شاپنگ پر جائیں گے تب میں آپ کو پز اکھلا دوں گی۔“

”پرامس۔“ وہ چپکا اور ہاتھ آگے بڑھایا جسے تھا متے فارحہ نے پرامس پکا کیا تھا۔ عاشر اسے صبح آفس ڈراپ کر دیتا اور دوپہر میں یک بھی کر لیتا واپس آ کر وہ الفت اور سمین کا ہاتھ بٹائی صبا کی اب عید بھی تھی شادی کے بعد اس کی پہلی عید تھی بظاہر سب کچھ ٹھیک تھا وہ مطمئن تھی مگر پھر بھی اس کی زندگی میں خلاء تھا کی تھی اور یہ کی اس وقت زیادہ محسوس ہوتی جب وہ عاشر اور صبا کو ساتھ دیکھتی اور وہ تو اس ڈر سے زیادہ دیکھتی ہے نہ کبھی کہ

اس کی نظر نہ لگ جائے اور اس وقت بھی صبا کی عید کے لئے بھیجی جانے والی چیزوں کو دیکھتی وہ کہیں گم ہو گئی تھی۔ طاق راتیں شروع ہوتیں تو اس کے اٹھے ہاتھ اور لیوں پر اس شخص کے لئے بھی دعائیں تھیں جس کا نام ایک سانبان کی صورت اس پر تھا تھا بے شک وہ اس کے ساتھ نہیں تھا پاس نہیں تھا پر وہ اس کی محبت تھا اس کے بیٹے کا باپ تھا وہ ہمیشہ اس کی سلامتی کی دعائیں مانگتی تھی اس کا دل نرم پڑ جانے کی دعائیں مانگتی تھی اس کا بیٹا اپنے باپ کے سامنے تلے بڑا ہو یہ اس کی سب سے بڑی خواہش تھی وہ بڑا ہو رہا تھا باپ سے متعلق اس کے سوالات بھی بڑھ رہے تھے دعا مانگنے کے بعد اس نے جائے نماز پر بیٹھ لی اور لاؤنج میں چلی آئی عالیان اور سعد ایک دوسرے پر کشن برسا رہے تھے وہ مسکرا کے قریب آئی۔

”نماز پڑھی سعد۔“ اس کی آواز میں تنبیہ تھی۔

”جی آپ۔“ سعد نے ہنوز مصروف جواب دیا تھا وہ الفت کے قریب بیٹھ گئی اور الفت اسے شاپنگ کی جانے والی چیزوں کی لسٹ گنوانے لگیں چاند رات کے رش سے بچنے کے لئے اس نے سوچا آج ہی مارکیٹ پہنچی جائے حالانکہ بہت محنت ہو رہی تھی نہ دل چاہ رہا تھا وہ عالیان سعد اور سمین کے ساتھ شاپنگ کے لئے نکلی تو الفت جیسے کے پورشن میں چلی گئی جس جاتی تھیں کہ انہیں دیر ہو گئی۔ تقریباً سب ہی شاپنگ ہو گئی تھی صرف سمین کی جوہری رہتی تھی عالیان نے اسے راز ہو گیا تھا اس لئے بار بار اسے تنگ کر رہا تھا۔

”مما آپ نے پرامس کیا تھا ہم شاپنگ پر جائیں گے تو آپ مجھے پز اکھلائیں گی۔“ بڑے غلط وقت پر عالیان کو پرامس یاد آیا تھا وہ تھک چکی تھی اس نے عالیان کو گھورا تو وہ کسی صورت بنا کر بولا۔

”آپ نے مجھ سے پرامس کیا تھا۔“ وہ کس پر تھی۔

”کے ڈرامہ باز ہو تم اپنے باپ پر گئے ہو۔“

”بابا پز جب بابا مجھے میں تو میں انہیں بتاؤں گا آپ انہیں ڈرامہ باز کہتی ہیں۔“ عالیان نے کہا تھا اور اس کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔

”سمین میں عالیان کے ساتھ سامنے ریسٹورنٹ میں جا رہی ہوں تو میں آ جانا سعد بہن کے ساتھ رہتا۔“ سمین کو بتا کر اور سعد کو تنبیہ کرتی وہ اسے ریسٹورنٹ لے آئی۔ عالیان پر اس کے ٹھوڑی دیر بعد سلاکس اس کے منہ کے قریب کرتا وہ بار بار منع کر رہی تھی مگر اس کے اصرار پر اس نے چھوٹا سا اشارٹ لپکا اس کی ذہل کے پاس آکھڑا ہوا تھا اور اسے متوجہ کرنے کو انگلی سے ٹیبل پر ٹھک ٹھک کی تھی اس نے گردن اٹھائی تھی اور اس کے چہرے کی رنگت یکدم بدلی تھی وہ زندگی میں صرف ایک بار ملی تھی مگر سینکڑوں کے ہزاروں حصے میں انہیں پہچان گئی تھی ان کی نظریں عالیان پر جمی تھیں مگر مخاطب وہ اس سے تھے۔

”میں کافی دیر سے بیٹھا نہیں دیکھا رہا تھا، شرم کا بیٹا بالکل شرم کی کاپی ہے۔“ وہ جیسے پر ہٹتے ہوئے بولے تھے۔ ”شرم کا بیٹا اور اس کا۔“ اس کا جی چاہا عالیان کو لے کر یہاں سے بھاگ جائے اگر انہوں نے عالیان کو اس سے چھین لیا تو لکھوں میں منفی سوچوں نے اس پر حملہ کر کے اسے بے دم کر دیا تھا۔ عالیان ناک چڑھائے انہی نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

”بیٹا اپنے دادا کو پہلو نہیں بولو گے۔“ وہ ٹھوڑی سے اس کا چہرہ پکڑے بول رہے تھے۔ ”اوہ دادا ابو السلام علیکم۔“ اس کے سلام کرنے پر وہ ذرا خفیف سے ہوئے سر ہلایا مگر عالیان پر جوش سا اشارٹ لے چکا تھا۔

کاکا نے کچھ دنوں کے اندر اسے اعلیٰ درجہ کی تعلیم دے دی۔ قبول کیا کہ وہ یہاں کس لئے آیا ہے اس رات کئی کہنے

۱۰ اس وقت خوبصورت و ٹیکوٹو کمرے میں قد آدم فرج وٹو کے سامنے کھڑا ہوا اس کے ساتھ سول

ڈرائیوے تھا جس کے اختتام پر سیاہ آہنی گیٹ تھا اور ڈرائیوے کے دونوں اطراف وسیع و عریض لان وہ دو گھنٹے پہلے داؤد فاروقی کے ہمراہ یہاں پہنچی تھی اور جب سے اس کا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا بلکہ وہ تو پہلے دو دن سے مسلسل کچھ نہ کچھ سوچ رہی تھی یہاں آنے کا فیصلہ بھی اس نے بہت سوچ بچار کے بعد کیا تھا شاید داؤد فاروقی کی جگہ شراسے لینے آتا تو وہ نہ کسی شکوے کے بناء کوئی لفظ کے چل پڑتی مگر اب جبکہ شراس کی آمد سے لاعلم تھا وہ اس کا رد عمل سوچ رہی تھی وہ جان چکی تھی کہ تاپا ابوداؤد فاروقی کے آفس ان سے بات کرنے گئے تھے جس کے نتیجے میں وہ اس کے سامنے تھے اور یہ جان کر اسے اپنا آپ بہت ہلکا لگا تھا اور شاید انہوں نے اس کے تاثرات پڑھ لئے تھے جیسے تھے اس کا سر پھٹتے ہوئے تھے۔

”بیٹا میں تمہارے اور شراس کے اختلاف کی وجہ سے لاعلم تھا اگر علم ہوتا تو بہت پہلے تمہیں لینے آ جاتا میں نے جب بھی اس سے جاننے کی کوشش کی اس نے یہی کہا کہ وہ اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا میں تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس نے شراس سے ڈائریکس دی ہے یا نہیں میں تو تحسین احمد کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے حقیقت بتائی ورنہ میں تو انجان ہی رہتا۔“ عالیاں کو جب سے پتہ چلا تھا کہ وہ اس کے دادا ہیں اور اسے اس کے بابا کے پاس لے جانے آئے ہیں وہ تب سے ایکسائینڈ تھا خوش تھا اور فارحہ سے ہزاروں سوال پوچھ چکا تھا اب بھی وہ تھوڑی دیر بعد اس سے کچھ نہ کچھ کہتا تھا مگر وہ مختلف سوچوں میں غرق تھی اپنے باپ کے گھر کا ایک ایک کونہ دیکھنے کے بعد اب وہ اس کے پاس آتی کمرے میں تھا اور ایک ایک چیز سے چھیڑ چھاڑ کرتا اس سے سوالات پر سوالات کر رہا تھا جس میں ہر فرصت یہ تھا کہ اس کے بابا کب آئیں گے؟ واپسی کے سفر میں داؤد نے اسے کہا تھا۔

”شمر کی ماں کے دیئے دکھ بھلانے کے لئے میں نے خود کو مصروفیت کے پردے میں گم کر لیا تھا اور اس مصروفیت سے میرے دولت کے انبار میں تو اضافہ ہوا تھا مگر اب میں مجھ سے دور ہو گیا ہمارے بیچ آج بھی بہت فاصلے ہیں فارحہ مجھے امید ہے تم اسے پائے میں میری مدد کرو گی میرے بیٹے میں بہت سی برائیاں ہیں وہ بہت سے نفسیاتی الجھاؤ کا شکار ہے جو ہم والدین ہی کی مرہون منت ہے پر یہی حقیقت ہے کہ وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔“ فارحہ کو ان کی بات کا اعتبار نہ تھا وہ سوچ رہی تھی محبت ہونی تو کیا اور کیا؟ اسے آج بھی اس کا جواب یاد تھا جو اس نے اپنے کانوں سے سنا تھا وہ اقراء کے سامنے ہی تو بیٹھی تھی جب اس نے کہا تھا جانے والوں کی واپسی کی میری زندگی میں کوئی جگہ نہیں ہے ہارن کی آواز پر وہ چوٹی تھی۔ طویل ڈرائیو وے سے گزرتی سیاہ کار پورچ میں داخل ہوتے نظروں سے اوجھل ہو گئی عالیاں بھاگتا ہوا اس کے برابر آکھڑا ہوا تھا۔

”بابا آگئے۔“ مارے اشتیاق کے اس کی آواز کانپ رہی تھی اس سے پہلے کہ وہ نیچے بھاگتا فارحہ نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ کچھ ہی سیکنڈ گزرے تھے کہ وہ کلائی پر کوٹ لٹکائے اندر داخل ہوا تھا عالیاں جو نیچے بھاگنے کے در پر تھا اب متانت سے چلتا اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا تھا اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں تھیں اور پھر اگیا فارحہ کو یاد آیا اس کے پریکٹ ہونے کی خبر سن رہی وہ ایسے ہی ساکت ہوا تھا اس کی آنکھوں میں ایسی ہی بے یقینی تھی جبکہ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ حقیقت ہے یا رسل کا ڈون اسے وہ دکھا رہا ہے جو وہ پوری فلائٹ میں دیکھتا آتا تھا۔

”السلام علیکم، آئی ایم عالیاں شراہند آئی ایم یورسن۔“ اپنا ننھا سا ہاتھ بڑھانے وہ پوری طرح سنجیدہ تھا شمر

نے آہستگی سے اس کا ہاتھ ذرا سا تھما اور پھر جھپٹ کر اسے اٹھایا تھا اپنے بازوؤں میں بھینچے اس نے اس کے کال کو دور سے چومنا تھا ایک بار دو بار کی بار۔

”میری ماما بھی مجھے یہیں پیار کرتی ہیں۔“ وہ ہلکھلا کر ہتارنا تھا شمر نے لگا ہیں اٹھائیں سامنے فریج وڈو لے آگئے کھڑی وہ اسے بڑی سردی نظروں سے دیکھ رہی تھی ابھی کچھ منٹوں پہلے تک وہ پریشان حال اور منظر بھی اور اب اسے سامنے پا کر وہ برف کے جیسے میں تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ پوچھی عالیاں کو دونوں بازوؤں میں بھینچے سینے سے لگائے آگے بڑھا اور اس کے شانے پر اپنا ایک بازو دراز کرتے اس کی پیشانی پر اپنے لب لٹھے اس کا رویہ نارمل تھا یوں جیسے ان کے بیچ سالوں کے یہ فاصلے تو کبھی حائل ہی نہ ہوئے تھے برف کے جیسے میں حرکت ہوئی اور وہ کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

”ماما آپ سے ناراض ہیں۔“ اس کے بیٹے نے افسوس بھرے لہجے میں جیسے اسے اطلاع دی۔

”جانتا ہوں۔“ گہری سانس بھرتے اس نے ایک بار پھر اس کا قل چوما۔

”آپ انہیں ماما ہیں وہ بہت جلد مان جاتیں ہیں۔“ مشورہ دیا گیا تھا۔

”اچھا، وہ کب؟“ اس کی نے دلچسپی سے اسے دیکھا اس کے بیٹے نے تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھا کہ یہ رہا ہوتا نہیں معلوم کیسے کہہ سکتے ہیں اور معلوم تو اسے واقعی نہیں تھا۔ اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر گال پر پی کرتے مسکین لے لگتے ہیں اس نے سوری کہا تھا پھر بولا۔

”مجھے تو ایسے جھٹ سے مان جاتی ہیں۔“

”آپ نے اپنے بال کنوا دیئے۔“ وہ اس کی پشت کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”خیر یہ بھی آپ پر سوٹ کر رہے ہیں مگر لمبے بالوں میں آپ کو لگتے تھے۔“ سامنے ڈریسنگ کے آئینے میں وہ اس کے سوجرگٹ ہیز اسٹائل کو تنقیدی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ کتنا اچھا ہے ساختہ تھا۔

”ہم دونوں باپ بیٹا چھوڑے ہیں کیا؟“ اس کے ہاتھ سامنے کیا جس پر تانی مارتے عالیاں نے بھی لہجہ لگا کر فرض خیال کیا تھا۔

”تمہاری ماما کو میرے لمبے بال پسند نہیں تھے ناں اس لئے کنوا دیئے۔“ شمر نے جواب دیا۔

”ہاں ماما کو بڑے بال بالکل پسند نہیں میرے بھی ہر جھٹے کٹ کروائی ہیں زبردستی۔“ اس کے بیٹے نے اٹ چڑھاتے ماں کی پسند پر نا پسندیدگی ظاہر کی تھی وہ ایک بار پھر ہنس پڑا۔

”بابا آپ کو معلوم ہے کل عید ہے میں نے رمضان میں اللہ میاں سے بہت ساری دعائیں کی تھیں کہ وہ یہ عید میرے بابا کے ساتھ گزارنے دیں۔“ وہ معصومیت سے کہہ رہا تھا۔

”میں نے بھی کیس تھیں۔“ وہ بڑبڑایا۔

”اللہ نے دعائیں سن لیں ناں اب ہم عید ساتھ منائیں گے میری جان۔“ اسے خود میں بھینچ کر اس نے اپنا تار دیا۔

”چلو اب باپ فریش ہو جائیں پھر ہم مل کر کھانا کھائیں گے۔“

”میرے خیال میں پہلے میں فریش ہو جاؤں۔“ اس کی گود سے اترتے عالیاں ہاتھ روم کی طرف بڑھا شمر نے نا اچھی سے اسے دیکھا اس سے پہلے کہ وہ ہاتھ روم کا دروازہ بند کرتا شمر اس کے پیچھے لپکا تھا۔ ہاتھ روم میں نا اچھا ٹھکلیاں کرنے کے بعد وہ باپ بیٹا نیچے آئے تو ڈرنگ چکا تھا شمر نے پہلے اسے چیر پر بٹھایا تھا پھر

اس کے برابر والی کرسی خود سنبھالی فارحہ نے گھور کر عالیاں کو دیکھا تھا وہ چپ چاپ سر جھکائے اتر فارحہ کے برابر والی چیز پر آ بیٹھا شمر نے ہکا بکا اسے دیکھا۔

”سوری بابا، ماما ناراض ہو جائیں گی۔“ اس نے بے چارگی سے کہا: داؤد فاروقی ہنسی مضطرب کرنے کے چکر میں سرخ ہو رہے تھے شمر سے نظریں نہیں تو انہوں نے شانے اچکا دیے۔ وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا مگر اس کی ساری توجہ اپنے باپ پر تھی وہ اسے کھانے کے بارے میں اپنی پسند ناپسند بتا رہا تھا اور باپ بہت پر جوش انداز میں ہاں میں ہاں ملا رہا تھا دونوں کی پسند ملتی جو بھی شمر بار بار فارحہ کو مخاطب کر کے بھی کوئی دُش پاس کرنے کو کہتا بھی کچھ اٹھا کر دینے کو قریب پڑی چیزیں بھی وہ خود اٹھانے کی زحمت نہیں کر رہا تھا اس کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا اور فارحہ بحال مضطرب کر رہی تھی: داؤد فاروقی کھانا کھاتے سب دیکھ رہے تھے یہ ان کی زندگی کا سب سے خوبصورت یادگار لمبی ڈنر تھا اور آئندہ آنے والے سارے بریک فاسٹ ڈنر یادگار ہی ہونے تھے انہیں یقین تھا۔

”مما آپ ہمارا ناراض ہیں؟“ دفعتاً عالیاں نے اسے مخاطب کیا۔

”چپ کر کے اپنا کام کرنا اور سونے کی تیاری کرو۔“ وہ درستی سے بولی عالیاں نے ہونٹ لٹکالیا۔

”ماما میں بابا کے ساتھ رہنے کا ایک اور فرمائش ہوئی تھی اس سے پہلے کہ وہ مزید ڈانٹتی داؤد فاروقی بول پڑے۔

”آپ کو اپنا روم پسند نہیں آیا عالی؟“

”بہت اچھا ہے دادا ابو مگر میں آج اپنا کلاس سوؤں اہم فرسٹ ٹائم ملے ہیں ناں۔“ دادا ابو مسکرا دیے اور بابا نے انگوٹھا دکھا کر اپنے ساتھ سونا ڈن کو دیا اور مہینے کی طوطا چیشی پر پہلو بدل کر رہ گئیں کھانا کھا کر لاؤنج کی سمت بڑھتے داؤد نے اس سے کافی لمبی فرمائش کر دی اور وہ جو عالیاں کا ہاتھ پکڑ کر روم میں لے جا رہی تھی انکار نہ کر سکی۔

”ایک کپ میرے لئے بھی پلیز۔“ اپنے پیچھے اس نے شمر کی طرف اشارہ کیا۔

”ایک کپ میرے لئے بھی ممما۔“ اپنے باپ کی طرح وہ بھی کافی لمبی فرمائش کر رہی تھی وہ دیکھ کر ہنس پڑا اور وہ جو شہر کی فرمائش پر کان نہ دھرتی آگے بڑھ رہی تھی بیٹے کی فرمائش پر ہنس پڑا۔

گھورتے بولی۔

”دودھ پو اور چل کر سوؤ ویسے ہی بہت لیٹ ہو چکے ہو۔“ اور وہ جب اس کے لئے دودھ کا گلاس اور ان دونوں کے لئے کافی لے کر آئی تو وہ اپنے باپ کی گود میں سوچ چکا تھا وہ مذہب میں بڑی گئی کراسے اس کی گود سے کیسے اٹھائے اور اس کی سوچ شاید شمر نے پڑھ لی تھی جی احتیاط سے اسے اٹھاتے لاؤنج سے نکل گیا۔

”اس کی کافی روم میں ہی لے جاؤ فارحہ تھکا ہوا ہے اب نہیں آئے گا۔“ وہ جو صوفے پر بیٹھنے لگی تھی پوری جان سے جل گئی پاؤں پٹختی واپس مڑی انہوں نے آواز دے کر روکا وہ رگ مگر پٹختی نہیں کافی کا کپ اسے نکھاتے اور اس کا سر تھپتھپاتے وہ آگے بڑھ گئے۔ کافی کا کپ اس نے سائیڈ پر چٹا تھا اب اگر وہ جھک گئی تھی تو جھکے اس کی بلا سے شمر نے سرعت سے اس کی کلائی تھامی وہ چوٹ کھائی شیرینی کی طرح پلٹی تھی۔

”ڈونٹ بیچ می۔“ جھکے سے کلائی چھڑاتے وہ غرائی برف کے خول میں دراڑیں پڑیں پہلی باضابطہ بات تھی جو اس نے کی تھی شمر اٹھا اس کے گلے میں ہاتھیں ڈالتے گال چوما اور آہستہ سے بولا۔

”سوری میرے بیٹے نے بتایا کہ تمہیں منانے کا یہ طریقہ ہے۔“

”اس نے اپنی ماں کو منانے کا طریقہ بنایا ہے۔“ اس کے ہاتھ جھٹکتے وہ مڑی۔

”یور اسٹ یہ اس کی ماں کو منانے کا طریقہ ہے بیوی کو منانے کا طریقہ تو۔“

”شٹ اپ شمر۔“ پلٹتے ہوئے وہ پوری قوت سے چلائی شمر نے پلٹ کر عالیاں کو دیکھا وہ گہری نیند سو رہا تھا۔

”میں نے تمہیں لڑنا اور اپنے حق کے لئے کھڑا ہونا سکھایا تھا فارحہ اور تم نے کیا کیا تم لڑے بغیر میدان چھوڑ

”نہیں تم مجھ سے لڑیں تو سہی فارحہ یہ تمہارا راستہ تھا۔“ وہ تنجید گی سے بولتا اس کے قریب آ کھڑا ہوا تھا فارحہ اسے دیکھتی رہی تو گویا ایک کرب مکمل کے بعد الزام بھی اس پر آتا تھا شکوہ بھی اس سے کیا جاتا تھا۔

”لڑنے کے لئے ہتھیار چاہئے ہوتا ہے۔“ برف کے خول میں دراڑیں مزید پڑیں اس نے دونوں شانوں

سے اسے تھام لیا۔

”کیا محبت سے بڑا بھی کوئی ہتھیار ہوتا ہے۔“

”محبت۔“ فارحہ ہنسی سے ہنسی۔

”آپ کو کبھی مجھ سے محبت اور میری یکطرفہ محبت کسی کام کی نہیں تھی میں لڑتی ضرور لڑتی اگر آپ کے

”ملاقات مجھے ایسا کوئی گمان نہ ہوتا۔“ اس کے شانوں پر دباؤ ڈال کر شمر نے صوفے پر بٹھا دیا اور خود اس کے قدموں

میں بیٹھ کر اپنا سر اس کے زانوؤں پر رکھا۔

”محبت تو تھی ہمارے بیچ فارحہ شروع سے تھی محبت تھی تو تم اب تک میری زندگی میں شامل تھیں محبت تھی تو

ان کا وجود ہوا تھا۔“ اس نے عالیاں کی جانب اشارہ کیا برف کے خول میں آہستہ آہستہ دراڑیں بڑھ رہی

تھیں۔

”محبت تھی تو تم میری زندگی میں شامل ہوئی تھیں کیا لگتا ہے مجھ جیسے شخص سے کوئی زبردستی کچھ کروا

”تا ہے اور وہ بھی شادی جیسا اہم فیصلہ؟“ وہ ہولے سے لڑا۔

”مجھے تم سے محبت تھی فارحہ اور رہے گی ہمیشہ۔“ اس نے ہنس کر کہا ہاتھ چوما۔

”جیسی آپ نے کہا تھا آپ کی زندگی میں میری کوئی جگہ نہیں۔“ اس نے ہنس کر کہا کفارحہ کو دیکھا اس کی

آنکھوں میں پانی چمک رہا تھا۔

”یونو واٹ فارحہ غصے میں انسان بہت کچھ غلط کہہ دیتا ہے غلط فیصلے کرتا ہے انسان کی زندگی میں کئی بات کا

انتبار نہیں کرنا چاہئے اور میں تو ویسے بھی ایک بے وقوف انسان ہوں بہت وقوفیاں کی ہیں میں نے آگے بھی

لوں گا تم سنبھال لینا سنبھال لو گی ناں۔“ فارحہ نے حیرانی سے پلٹیں اٹھا کر اسے دیکھا لاؤنج شمر اپنے بے

دُاف ہونے کا اعتراف کر رہے تھے وہ ہنس پڑی برف کا خول اس کی کھلتی ہنسی میں چھنا کے سے ٹوٹ پڑا فارحہ

نے اثبات میں سر ہلاتے اس سے آئندہ سر زد ہونے والی بے وقوفیوں کو سنبھالنے کا بار اٹھایا اور اس کے ہاتھوں

اس ہاتھ دینے اپنا چہرہ ان پر لٹکا دیا۔

”میں تم سے ہمیشہ محبت کروں گا فاری۔“ وہ یقین دہانی کرا رہا تھا فارحہ مسکرا دی فریج وینڈو سے جھانکتا

باب ہلال عید بھی مسکرا دیا چاند کی پریاں پر کھولے فضا میں غور قفس ہو گئیں شیطان منہ چمپا کر بھاگ گیا صلح

فرشتے ایک دوسرے کو مبارکباد دینے تلکے پر فسون چاند رات بھٹکتی جاری تھی اور ایسے میں دوول ایک

سے میں مدغم راز و نیاز میں مشغول تھے۔

☆.....☆.....☆

شہلاگل سحر صالح

سیری تہکن (نقد و رد)

”دوسری شادی کر لیں آپ؟ میں آپ کو اولاد نہیں دے سکتی۔“ اسماء نے بیگنی بیگنی پلکیں اٹھا کے آس بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ تو حمزہ نے فی وی اسکرین سے نظریں ہٹا کر اپنی جان سے پیاری بیوی کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر پھیلی یاسیت اور بھگی پلکیں اس کا دل تڑپا گئیں۔ اس نے بے اختیار اسے اپنے قریب کر لیا۔

”کیا ممانے پھر کچھ کہا۔“ حمزہ نے اس کے

”میں سرگوشی کی۔ اسماء کی قربت حمزہ کو جھلسانے لگی۔“ نہیں۔“ اس نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔

”وقت تیزی سے گزر رہا ہے رپورٹ آپ ماننے ہے۔ ہمارا پیارا سا گھر بھی نئی آوازیں بے چین ہے۔ کوئی تو ہو جو ان چیزوں کو الٹ کر رکھ دے۔ ہمیں ہلکان کرے بھی نہی۔“ یوں سے ہمارے گھر کے دروہام بھی گونج

”اٹھیں۔ ننھی ننھی شرارتوں سے ہماری زندگی پر چھایا جو ختم ہو جائے۔“ اس کے سینے میں منہ چھپائے اسماء ایک ٹرانس کی کیفیت میں بولے جا رہی تھی۔ حمزہ اس کو تسلی بھی نہیں دے سکتا تھا کہ اس کے ساتھ وہ خود بھی بکھر جاتا تھا۔

”بس ایک بار آپ مان جائیے پھر ہمارے خواب حقیقت کا روپ دھار سکتے ہیں۔“ یکدم اس کے سینے سے سر اٹھا کے التجائیہ نظروں سے حمزہ کو

ناولٹ



سے ٹیک لگائے اسماء پر حمزہ نے اسپرے کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”ٹھیک ہوں ٹھوڑا لیٹ جاؤں گی۔“ اسماء نے کسمندی سے انگڑائی لے کر کہا۔

”مسٹر نعمان اور مسز نعمان کے بیٹے کے ریسپشن کا فنکشن ہے شام کو بطور خاص بلایا ہے ہم دونوں کو۔“ حمزہ نے پیار سے اس کے بال سنوارے

”اس لیے شام کو فریش اور تیار ملنا۔“ وہ خوش دلی سے مسکراتا تو اسے مطمئن کرنے کے لیے وہ بھی نم

آنکھوں سے مسکرا دی تھی کہ اتنے پیار کرنے والے شوہر کو وہ محبت کا ثبوت نہیں دے سکتی تھی۔ ساس اور

ندوں کی باتیں اسے حیدر دیتی تھیں۔ مگر قسمت وہ خود نہیں بنا سکتی تھی۔ اس لیے وہ حمزہ کو اولاد کے لیے

دوسری شادی کے لیے مجبور کر رہی تھی اور اپنے دل کی

مجبوری تو وہ خود ہی جانتی تھی۔ گڑیا کو تیز بچاؤ اور گھاسی

تھی۔ آپنی پارلر اس کے حوالے کر کے چچی کے ساتھ ڈاکٹر کے لیے گئی تھیں۔ وہ ایک لڑکی کے بالوں کی

کننگ کر رہی تھی کہ خوشبوؤں سے مہکتی خوش شکل ایک خاتون پارلر میں داخل ہوئی۔

”مونا کدھر ہے؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”جی وہ یہاں نزدیک تک گئی ہیں ابھی واپس آجائیں گی۔“ اس نے مرعوب لہجے میں کہا اور

آہستہ سے دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ آج کسٹمرز کم تھیں۔ اس لیے آدھے گھنٹے میں اس نے

سب کو فارغ کر دیا۔ گاہے بگاہے اس کی نظر اس خاتون پر پڑ رہی تھی۔ جو کلاک پر نظر ڈالتے پہلو

بدل رہی تھی۔ بچہ کلر کا نازک کام والا سوٹ، ہلکی پھلکی جیولری اور مرعوب کرنے والی شخصیت اس نے سیل

نکال کر شاید مونا آپا کو کال کی تھی اور پھر فون مونی کی طرف بڑھایا۔ آپنی نے اسے اسماء نامی خاتون کے بارے میں ہدایت دیں اور کہا کہ وہ لوگ بس واپس

آنے والے ہیں۔ اسماء مطلوبہ سیٹ پر آگئی تو مونی کپکپاتے ہاتھوں سے اس کی کلیننگ کرنے لگی۔ ہلکا

ہلکا میوزک فضا میں ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ وہ آنکھیں موندے بالکل خاموش تھی۔ اس نے مونی کو

کوئی ہدایت نہیں دی۔ ورنہ بڑے گھرانوں والی خواتین عموماً سو سو خرچے کرتیں۔ مونی محنت اور دل

سے اس کا میک اپ کر رہی تھی۔ وہ اصل میں بھی بہت خوب صورت بڑی بڑی پلکوں کی جھل میں

چھپی غزال آنکھیں شہابی رنگت پتھری جیسے ہونٹ، اٹھی ہوئی مغرور ناک اور براؤن سکی بال۔ میک اپ

مکمل ہونے تک مونا آپنی واپس آچکی تھیں۔ گڑیا کو بالے میں لٹا کے وہ اسماء کے قریب آئیں۔ دونوں

گرم جوش سے ملی تھیں۔ یقیناً گہری شناسائی تھی۔ اب وہ ان کو گڑیا کے بارے میں بتا رہی تھی۔

”پارمیک اپ تو مونی نے پیارا کیا ہے۔“ اس نے ستائی نظروں سے اسے دیکھا۔

”یہ خود ہی اتنی پیاری ہیں۔“ بے ساختہ مونی کے منہ سے نکلا اور مونا کے بے ساختہ تھپتھپے پر وہ بے

اختیار ہنس پڑی۔ ”چلو جی اسماء مونی بھی تمہارے متاثرین میں شامل ہو گئی ہے۔“ خوش دلی سے اسماء نے بغور اس

معصوم اور نوجوان لڑکی کو دیکھا۔ ”یہ مونی ہے پڑوس میں رہتی ہے۔ بہت

coprative اور پیاری لڑکی ہے۔“ یکدم مونا کا تعارف کا خیال آیا تھا۔

”اور مونی یہ میرے فرسٹ کزن کی وائف ہے۔ اسماء میرے کزن اکثر مجھ سے ملنے آتے رہے

ہیں۔ رشتے میں وہ میرے دودھ شریک بھائی بھی ہیں۔ بس اللہ انہیں اولاد کی نعمت سے نوازے

آمین۔“ مونا آپنی نے ادا سے کہا۔ لمحہ بھر کو اسماء رنگ متغیر ہوا تھا۔ وہ دونوں باتوں میں مشغول ہو گئی

تو وہ گڑیا کو لے کے چپکے سے باہر آگئی۔

”دنیا میں کوئی بھی مکمل نہیں ہے۔ کہیں نہ کہیں لی ضرور سے مکمل خوشی تو کسی کو بھی عطا نہیں کی گئی۔

اس عورت کی شکل دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ادا کی محرومی کا شکار ہے۔“ مونی ہنسنے ہوئے دکھ

سے سوچتی رہی۔ ☆.....☆

فنکشن میں انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ ان ہی ہائی سوسائٹی میں اپنے اپنے پیشوں کے

ناز سے معتبر جانے جاتے تھے۔ سارا وقت حمزہ کی نظر بس اس کا طائفہ کرتی رہیں۔ دونوں ہی

یڈیل پل جانے جاتے تھے۔ کچھ وقت کے لیے ان بھی بھل گئی تھی۔

”بہت خوب صورت کپل ہے۔“ بزمیک ہی ن خاتون نے تبصرہ کیا تھا۔

”ہاں مگر بد قسمتی سے اولاد کی نعمت سے محروم

“اوہ! کیا فائدہ پھر دولت اور حسن کا کہ انسان نام و نشان ہی گزر جائے۔“ پہلی خاتون نے

زنی سے تبصرہ کیا تھا۔ اسماء کے دل پر جیسے نائی چل گئی اور وہاں سے اٹھ کر دوسری سائیڈ پر

آئی۔ واپسی پر وہ قدرے خاموش تھی۔ ”انصیب دشمنان! خیر تو ہے۔“ حمزہ نے اس

نہایتی لٹ بھینچی۔ ”ٹھیک ہوں بس تھکن سی ہے۔“ آواز میں

لیٹی تھی۔ ”آج تو غضب ڈھا رہی تھی ہماری بیگم۔“

نے پیار سے اسے دیکھا۔ ”اس سرسبز درخت کا کیا فائدہ حمزہ جو میوہ نہ

لی۔“ اسماء نے گویا سسکی لی تھی۔ ”میوہ نہ دے چھاؤں دے سکتا ہے ناں۔“

نے دودھ دیا۔ ”مگر چھاؤں والے درخت تو صرف زادراہ

کے لیے ہوتے ہیں۔ جہاں مسافر سستا کے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ البتہ میوے دار

درخت اپنے گھر میں لگانے کی خواہش ہر ذی نفس کو ہوتی ہے۔“ اس نے سرسٹ کی پشت پر ٹکا دیا تھا۔

احساس محرومی سے اس کی آنکھیں بھگی رہیں تھیں اور حمزہ ہونٹ بھیچے تیزی سے ڈرائیوگ کر رہا تھا کہ

اسماء اب مسلسل اس پر دباؤ ڈال رہی تھی۔ ☆.....☆

”ہاں شکر ہے سب خیر سے ہیں۔“ کچن کی طرف بڑھتے ممالی آواز اس کے کانوں سے ٹکرانی

تھی۔ ”بس میری تو یہ خواہش اس دنیا میں پوری نہیں

ہو سکتی ساری عمر بیٹے کے لیے ترستی رہی دعائیں منیں مانگیں اور وہ نعمت ملی تو اب پوتے پوتیوں کے

لیے تڑپ رہی ہوں۔ کیا فائدہ اس دولت جائیداد اور کاروبار کا جو اس کو بعد میں سنبھالنے والا ہی کوئی

نہیں ہے۔ وقت ہے کہ تیزی سے گزر رہا ہے مگر مجال ہے جو غصہ کو احساس ہو۔

”ارے بیوی کا کیا باؤ ہوگا۔“ دوسری طرف سے پوچھنے پر وہ استہزاء بھری نظر

”اس کی بلا سے اولاد ہو یا ناں ہو۔ ارے مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ ہاتھ ہوگی ورنہ حمزہ کی بات بھی

ناں مانتی۔ یہ گھر مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے کلب میں میری تمام دوستیں جب فخر سے اپنی پوتے یا

پوتیوں کا ذکر کرتی ہیں تو یقیناً مانو میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ مجھے اپنا آپ بہت بد قسمت محسوس

ہوتا ہے۔“ ممالی کی منڈا ہا جو دوہنی میں مقیم تھی (mo) پر اس سے ویڈیو کال پر بات کر رہی تھیں۔

اسماء کچن میں پانی لینے لگی تھی ان کی ساری گفتگو اس کی سماعت میں سیسے کی طرح اتری تھی۔ وہ اب

ایسے ہی کھلم کھلا اس کو سناتی تھیں۔ ان کی نظر میں سارا قصور ہی اس کا تھا۔

☆.....☆

”سنو سنبل اور رجماء کو دیکھنے کچھ لوگ آرہے ہیں۔ تم مونا کے گھر چلی جانا اور جب تک میں جواب نہ بھجواؤں تو واپس مت آنا۔“ چچی نے اس کے لیے حکم صادر کیا۔

”اور جلدی جلدی جو چیز مہمانوں کے لیے بنانی ہے۔ بنالو اور ہانی سنگ لڑکیاں خود کریں گی۔“ آئسو پتی وہ بچن میں آگئی۔

”اب پناہ لینے کے لیے غیروں کے گھر جانا پڑے گا اگر میرے ماں باپ کی عمر کم تھی۔ تو مجھے بھی در بدر بھٹکنے کے لیے بیدار نہ کرتے۔ چچا الگ مجبور تھے۔ چھپو لے کر لیکن تو پھوپھا کی نسبت خراب ہوگئی۔ چچی الگ اسے اپنی بیٹیوں کا دشمن سمجھتی تھیں لاکھ کوشش کے باوجود بھی وہ اس کا دل نہیں جیت پائی تھی۔“ شامی کباب، دہی بڑے، پکوانے، ٹکڑے، چکن رول، چنا چاٹ اس نے سیتے سے ہر چیز کھا لی اور چچی کا حکم بجالانے کے لیے مونا آپنی کے گھر

رخ کیا۔ وہ ان کے بلانے پر ہی آئی تھی اور آج بن بلائے سخت برا لگ رہا تھا۔ پاؤں من مین بھاری لگ رہے تھے۔ مونا بچن میں برہانی بنارہی تھی۔ پارلر آج بند تھا۔ وہ بھی ان کے پاس بچن میں آگئی۔

”ارے موتیا تم۔“ مونا نے خوش گواری سے کہا۔

”جی..... وہ دل تنگ ہو رہا تھا۔“ اس نے نفرس چرا کر بہانہ گڑا۔ مونا نے بغور اس کا چہرہ دیکھا لیکن کریدار نہیں۔

”بہت اچھا کیا زارا میں کوکنگ کر لوں پھر ایک دو نیو ہیز اسٹائل چیک کرتے ہیں۔ رات کو ہی میں نے ڈاؤن لوڈ کیے ہیں۔“ برہانی کو دم پر لگاتے ہوئے اس نے خوش دلی سے کہا۔

”آپنی! اگر بچن کا کوئی کام ہو تو۔“ جھجکتے ہوئے کہا۔

”نیکی اور پوچھ پوچھ بس تم اچھا سا سلا د بنا دو اور

میں جھٹ پٹ بیٹھا بنا دوں آج میرا بھائی آئے گا اور اس کو میرے ہاتھ کے کھانے بہت پسند ہیں۔ پھر دونوں سکون سے بیٹھیں گے۔“ مونا نے اسے سبزیاں تھمائیں۔ موبائل کی ٹیبلٹ پر مونا چونکی۔ دہی سے اس کے ہر بینڈ کی کال تھی۔ وہ اس سے بات کرنے چلی گئی۔ موتیا چپ چاپ سلا د کے لیے سبزیاں کاٹنے لگی۔ زبردست طریقے سے اس نے سلا د سجا دیا تھا۔ تب کسی نے مضبوط ہاتھ اس کی آنکھوں پر رکھے تو وہ بری طرح گھبرا گئی۔ شیفٹ پر بڑا شیشے کا گلاس اس کے ہاتھ سے لگ کر کرچی گر چکی ہو گیا تھا۔ اچانک اس کی آنکھوں سے ہاتھ ہٹے تھے اور رخ موزا تو جان ہی نکل گئی۔ کوئی اجنبی اس کا چہرہ دیکھ کر یکدم پیچھے ہٹا تھا۔

”آئی ایم ویری سوری میں سمجھا مونا ہے۔“ اس کے چہرے پر راڑی ہوا نیاں دیکھ کر وہ نادم ہو گیا تھا۔ گلاس ٹوٹنے کی آواز پر مونا بھی بچن میں آگئی تھی اور آتے ہی پوچیشن سمجھ گئی تھی۔

”او موتیا! سوری حسن کی کال تھی ان کے ساتھ برہانی تھی۔ یہ میرے بھائی ہیں حمزہ اور حمزہ یہ میری چھوٹی کی جانی ہے وہ مست ہے موتیا۔“ مونا نے دونوں کا تعارف کروا دیا۔ حمزہ نے ایک کے بعد دوسری نظر اس کے چہرے پر زلزلہ ڈالی تھی جو ابھی بھی خطہ انحواں تھی اور ایسا لگتا تھا جیسے کسی پھوٹ پھوٹ کر رودے گی۔ وہ مونا کے ساتھ بچن سے نکل گیا اور وہ اپنی بے بسی پر دل موس کر کے رہ گئی تھی۔ کہ چچی کے بلاوے کے بغیر وہ قدم بھی باہر نہیں رکھ سکتی تھی۔

☆.....☆

رات کو سونے کے لیے لیٹے تو اسماء نے اس کی طرف کروٹ بدل لی۔

”حمزہ مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“

”سو باتیں کرو۔“ حمزہ نے اسے قریب کیا۔

”حمزہ مجھے آپ کا بچہ چاہیے۔“ اس کی آواز

میں ہٹ دھری تھی۔

”چھوڑو بار ابھی تو میں خود بچہ ہوں۔“ حمزہ نے ہنسی سے کہتے ہوئے اسے اپنی مضبوط گرفت میں لیا۔ مگر وہ بدک کر پیچھے ہٹ گئی۔

”مجھے آپ کا جواب چاہیے اور وہ بھی ہاں میں۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”کیا تم میرا شیشہ برداشت کر سکتی ہو؟“ حمزہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”اولاد کے لیے میں کچھ بھی کر سکتی ہوں مگر شرط ہے کہ بچہ ہمارا ہو۔ مجھ میں کی ہے۔ آپ میں تو نہیں پھر دولت سے لیا کچھ نہیں خریدا جاسکتا ہے۔

نہ پر اپنا بچہ نہیں آپ کی اولاد چاہیے۔ اور اس کے لیے آپ کو ہر حال میں دوسری شادی کرنی ہوگی۔

وہ معاشرہ مجھے نفسیاتی مریض بنانے کے لیے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کے وہ پھوٹ پھوٹ کر رودے گی۔

”اب حمزہ نے اسے سینے میں چھپاتے ہوئے ہاں دیا۔ سب کچھ اس کی مرضی پر چھوڑ دیا۔

☆.....☆

سنبل اور رجماء دونوں کا رشتہ طے ہو گیا تھا۔ چچی کی نو بیٹیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ آج کل موتیا بھی ان کا مناب سے بچی ہوئی تھی۔ منشا کی لے کر وہ مونا کے گھر آگئی تو ایک خوش خبری اور بھی منتظر تھی۔ مونا کا نام اسے باہر بلوا رہا تھا۔ ایک ہفتے کے اندر اس کا دل آنے والا تھا۔ اور وہ بے پناہ خوش تھی۔ ایک موتیا کی جو مونا کی خوشی میں خوش ہو تھی مگر ساتھ ساتھ اس کا ماضی ٹھکانہ ختم ہونے کا دکھ بھی تھا۔ جہاں وہ کچھ وقت کے لیے چچی اور ان کی بیٹیوں کے مظالم سے گزار رہی تھی مگر قسمت کو شائد کچھ اور منظور تھا۔

☆.....☆

حمزہ کے اقرار سے حمزہ کے گھر والوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اسماء کو بے اختیار وہ سادہ اور معصوم سی لڑکی یاد آتی تھی۔ جو مونا کے گھر دیکھی تھی اور جس کے

حالات سن کر لمحے بھر کے لیے وہ خود بھی افسردہ ہوگئی تھی۔ دل میں ایک فیصلہ کر کے اس نے مونا کو فون ملایا اور اپنا مدعا بیان کیا۔ مونا لمحے بھر کو چپ ہوئی مگر اس کے اصرار پر گویا اس نے ہامی بھری۔ چچی سے بات کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ لڑکے کے شادی شدہ ہونے کا سن کر چچانے صاف انکار کر دیا ویسے بھی پہلے دو بڑی بیٹیوں کی شادی سر پر تھی۔ اسے میں موتیا کے لیے گنجائش کہاں نکلتی۔ پھر لوگ باتیں کرتے کہ یتیم نو عمر بچی شادی شدہ مرد کے ساتھ بیاہ دی مگر کہتے ہیں کہ ہولی کو کون نال سکتا ہے اور رشتے تو آسانوں میں طے ہوتے ہیں موتیا کی جوڑی بھی حمزہ کے ساتھ لکھی تھی۔ اس لیے اسماء بذات خود چچی کے پاس آئی اور جانے ان کے کانوں میں کیا کہا چچی نے چچا کو منا کے دم لیا۔ جہیز کے نام پر پھوٹی کوڑی بھی نہیں لی گئی۔ البتہ چچی اور اس کی اولاد کے لیے بیش قیمتی تحائف دیے گئے۔ دونوں بہنوں کی شادی طے کیے لیے خاصی امداد بھی دی گئی۔ اور موتیا کو لکان کے بعد حمزہ کی تحویل میں دے دیا گیا۔ جانے اب ادھر اصل کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا تھا۔ سن ہوتے دماغ کے ساتھ اس نے سب دیکھا اور سنا تھا۔ گویا اس کی قیمت ادا کر کے اسے لایا گیا تھا۔ چچا کی بے بس نظریں اس کے دل کو پاپائی تھیں۔ اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ اندر جیسے جینے کی امنگ کی ختم ہوگئی تھی۔

☆.....☆

مونا آپنی نے اسے بہت دل سے تیار کیا تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر اپنے اجنبی روپ کو دیکھا۔ نہ دل میں کوئی امنگ، ناں کوئی ارمان، نہ کوئی گدگدی، بس سپاٹ چہرے کے ساتھ وہ رخصت ہو کر حمزہ والا آگئی۔ ایک خوب صورت سچے سنورے کمرے میں اسے بٹھا دیا گیا۔ چند نفوس تھے جو اس کے ارد گرد بیٹھے تھے مونا آپنی کی صبح فلائٹ تھی۔ وہ اسے پیار کر

کے جلدی چلی گئی تھیں۔ اس کی مندریں اسے تحائف دے رہی تھیں۔ سہرا رہی تھیں مگر وہ ہوش و حواس میں کب تھی۔ نام گزرنے کے ساتھ سب رفتہ رفتہ آرام کے لیے چلے گئے لیکن اسے ابھی انتظار کی اور گھڑیاں گزرتی تھیں۔ تب بچے سجائے روپ کے ساتھ کب وہ بیٹھی بیٹھی نیند کی آغوش میں کب گئی اسے خبر ہی نہیں ہوئی۔ اسماء کے لیے یہ بہت کھٹن وقت تھا۔ آج سے کئی سال پہلے وہ اس رات حمزہ کا انتظار کر رہی تھی۔ محبت کی بیج پر امانوں سے گزری ہوئی رات تھی وہ۔ اور آج انگاروں کی بیج پر وہ لیٹی تھی۔ گھڑی کی ٹیک اس کی دھڑکن میں تیر کی طرح چسپ رہی تھی۔ جانے کونسا وقت تھا جب دروازہ بجایا۔ اس نے آنکھ کر دروازہ کھولا تو حمزہ کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ حمزہ کے روم میں آکر جلدی سے دروازہ بند کیا۔ اور بیڈ پر دراز ہو گیا۔

”حمزہ۔“ اسماء ٹپ کر آگے بڑھی۔

ایک نظر اس کی سرخ سوچی ہوئی آنکھوں پر ڈالی اور پھر اسے اپنی پناہوں میں لے لیا۔

”وہ تمہارا انتظار کر رہی ہوگی۔“ اسماء نے سرگوشی کی۔

”چپ۔“ حمزہ نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھا اور اسماء کے لیے انگاروں کی بیج کو محبت کی بیج بنادی۔ اس کی محبت میں بھیکتی وہ اس معصوم سی لڑکی کو بھول گئی۔ جو آج کی رات اس محبت کی حقدار تھی جانے رات کا کونسا پہر تھا۔ جب موتیا کی آنکھ کھلی۔ اس نے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ آدھی رات بیت چکی تھی اس نے ایک نظر اپنے حلیے پر ڈالی اور پھر آہستگی سے اٹھ کر واش روم جا کر کپڑے بدلے منہ دھویا اور واپس بستر پر آگئی۔ کمرہ ویل ڈیکور بیٹ تھا۔ آسائش کی ہر چیز سے مزین مگر شاید بڑے لوگوں کا یہ بھی کوئی ریوان تھا کہ جس کے ساتھ اس کی زندگی مشروط ٹھہری تھی۔ جانے وہ کدھر تھا مگر اس کا ناں آنا موتیا

کے لیے باعث تقویت تھا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی مگر دل پر عجیب دھوپ چھاؤں کا موسم ٹھہرا تھا۔ ذہن لاکھ کوشش کے باوجود کوئی تانے بانے نہ بن سکا۔ تب سب کچھ اپنے رب پر چھوڑ کر وہ دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگی۔ زندگی نے اتنے روپ دکھائے تھے کہ اس اجنبی جگہ اور تنہائی میں بھی اسے خوف نہیں آ رہا تھا۔ دیر سے اٹھنے پر اس کی نماز قضا ہو گئی تھی۔ جلدی جلدی نہا دھو کے اس نے لائٹ کام والا سوٹ پہنا اور کمرے سے باہر آئی تو ہوکا عالم تھا۔ گھر کے مکین سب سو رہے تھے۔ سامنے لان میں رنگ برنگے گلاب کھلے تھے چنبیلی کے پھول وافر مقدار میں نیچے گرے ہوئے تھے۔ مطلع صاف تھا اور سورج نکل آیا تھا۔ ”حمزہ دلا“ اپنی خوب صورتی اور شان و شوکت سے چمک رہا تھا۔ صرف بچن سے نوکروں کی آوازیں اور برتنوں کی کھٹ پٹ کی آوازیں آرہیں تھیں۔ اس کا بہت دل چاہا کہ وہ گھاس پر گرے چنبیلی کے پھول چن لے مگر شرم آ کر بے آگئی۔ اور وہ واپس روم میں آگئی۔ اب وہ روم میں ہر چیز کا جائزہ لینے لگی۔ ہر چیز مہنگی اور بیش قیمت تھی۔ ان سب میں ایک چیز اڑاں تھی اور وہ بھی موتیا کی ذات۔ بہت اتلاؤ کے بعد چچی لوگ نہ آئے تو اپنی ناقدری پر اس کی آنکھیں بھرا آئیں۔ موتیا آئی یاد آئیں کہ اس موقع پر وہ بھی اس کے ساتھ نہ تھیں۔ ملازمہ نے آکر اسے ناشتے کے لیے بلایا تو وہ بری طرح گھبرا گئی۔

”ہنگم صاحبہ نے کہا ہے کہ اگر آپ چاہیں تو آپ کا ناشتہ آپ کے کمرے میں بھی بھجوا سکتے ہیں۔“ اس کی گھبراہٹ بھانپ کر ملازمہ نے فوراً کہا تو اس نے سکھ کا سانس لیا اور اثبات میں سر ہلادیا۔

☆.....☆

دو تین دن میں اس کی مندریں اپنے گھروں میں سدھاریں۔ ہر ایک نے جاتے جاتے اس کے کان

میں اپنے پچھونے کی خوش خبری کا جلد از جلد سننے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ یہ موتیا کے لیے الگ نشانی تھی کہ اس نے ابھی تک اس شخص کو بھی نہیں بلایا تھا۔ جس کے حوالے سے وہ لائی گئی تھی اور ان کے حوالے سے اس سے بہت سی امیدیں وابستہ کر لی گئیں تھیں۔ گھر میں حمزہ کی ممانعت ان کی اپنی سروریاں اور اپنا سرکل تھا۔ اسماء زیادہ اپنے روم میں رہتی۔ حمزہ کی گاڑی کی آواز سن کر اکثر وہ پاپ جاتی اور گھر میں نوکروں کی فوج اسے لائٹ میں بہت مشکل ہو رہی تھی۔ ایک پرانی بات یہ بھی یاد آتی تھی کہ چاندی کے موتیا کے روم کا وجود غیب سے تھا کیونکہ وہ تنہائی مٹانے والی اس سے جو گفتگو کرتی تھیں۔

☆.....☆

نادی کی چوتھی رات جانے رات کا بول سا پہر تھا۔ اب اس کا دم جیسے گھٹنے لگا وہ روم کھول کر باہر نکلی۔ اس کا رخ لان کی طرف تھا۔ چاند پورے روم میں لان چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔ ستاروں کی مانند پڑی تھی۔ اس نے گلابوں کی بھینی لائی۔ شبو اپنے اندر اتاری اور جھک کر چنبیلی کے پھول چنے لگی۔ اس گھر کے مکین بھی عجیب تھے۔ اٹھانا الگ تھک رہتا۔ سب کی اپنی اپنی دنیا تھی اور جس شخص کے حوالے سے وہ یہاں آئی تھی اس نے اسے نظر بھر کے دیکھا بھی نہیں تھا اور اسے اس کی کوئی خبر بھی۔ آج بہت دنوں بعد اسے اس کا لگ رہا تھا۔ صبح صبح ممانعت حمزہ کی کلاس تھی۔ رات کو اسماء نے اسے اپنی قسم دے کر اسے روم میں بھیجا تھا۔ وہ جان بوجھ کر آفس کے کمرے پہنچا کہ اسے اسٹڈی روم میں بند رہا اور سگریٹ دیا۔ آخر ناچار دیر سے وہ اس کے روم میں آیا تو اسے روم اس کا منہ چڑھا رہا تھا۔ واش روم چیک کیا تو اسے غیب سے خیالات نے سر اٹھایا۔ تیزی سے

باہر آیا تو اسے لگا جیسے لان میں کوئی موجود ہے تب چاندنی روشنی میں اس نے اس وجود کو دیکھا۔ تو اسے جھکا لگا۔ اس حسن اور معصومیت کے پیکر سے وہ موتیا آپا کے گھر دوبارل چکا تھا۔ وہ تو کتنی نو عمر تھی۔ پستہ کلر کے ایمر ایڈی والے سوٹ میں صاف تھرے چہرے کے ساتھ وہ کتنی پاکیزہ لگ رہی تھی۔ سر پر سلیقے سے اوڑھا دوپٹہ گلابوں کو ہلکے سے چھوئی سانسوں سے خوشبو اپنے اندر اتارتی پھر کچھ سوچ کے وہ پکا سا مسکرائی اور سر جھٹک کے چنبیلی کے پھول گھاس سے چنے لگی۔ حمزہ نے تلے قدم اٹھاتا اس کے پاس آیا۔ اس کی نظر سیدھی اس کے پاؤں پر پڑی تھی تو خوف سے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنناہٹ سی دوڑ گئی۔ سر اٹھانے کی ہمت نہیں تھی جیسے وہ چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی ہو۔

”اس وقت ادھر کیا کر رہی ہو۔“ حمزہ نے ڈیٹ کر کہا۔ تو وہ مزید گھبرا گئی۔ تیزی سے کھڑی ہوئی مگر پھر کراپ رہی تھی۔ حمزہ نے دیکھی سے اس کے گھبرائے ہوئے روپ کو دیکھا۔ جواب بھی اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے اجتناب کر رہی تھی۔ اسماء حد سے زیادہ پر اعتماد تھی اور یہ حد سے زیادہ ڈر پوک۔

”چلو روم میں بیمار ہو جاؤ گی اور اس وقت تو کتنی ہوائی مخلوق گزرتی ہیں۔ اٹھا کے جائیں گے تمہیں۔“ حمزہ نے شرارت سے کہا۔ تو اثبات میں سر ہلاتے ہوئے تیزی سے روم کی طرف بڑھی۔ حمزہ اس کے ہم قدم تھا۔ روم میں آکر اس نے لاک لگایا۔ تو موتیا نے مڑ کر حیرت سے دیکھا۔

”مجھے پہچانتی ہو۔“ وہ اس کے مقابل اکھڑا ہوا۔ اس کا جھکا سر مزید جھک گیا۔

”گوگنی تو نہیں ہو؟“ حمزہ نے انگلی سے اس کی ٹھوڑی اٹھائی۔

”نہیں نہیں۔“ وہ تیزی سے بولی۔ چہرہ شرم

اور خوف سے سرخ ہو چکا تھا۔ حمزہ اس کا ہاتھ تھام کے صوفے پر لے آیا اور اسے اپنے پاس ہی بٹھالیا۔

”کیا نام ہے تمہارا۔“
”موتیا۔“ اس نے آہستگی سے کہا دل پسلیاں توڑ کر باہر آ رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ سینے سے بھیگ چکا تھا۔ وہ اس کی تعلیم اور گھروالوں کے بارے میں پوچھتا رہا۔ اپنے بارے میں بتاتا رہا اور وہ سر ہلا کے سنی رہی۔ یہاں تک اس کے دل میں خوف قدرے کم ہوا نیند سے اس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں تو وہ اسے بند پر لے آیا۔ اور اس کے قریب ہی لیٹ گیا۔ موتیا کی حالت جیسے غیر ہونے لگی۔

”موتیا! کھولیں۔“
”وائف ہی نہیں اچھے دوست بھی ہیں۔“ اس نے جھک کر اس کی پیشانی چومی اور کہا اس پر درست کر کے کروٹ بدل کے گویا مگر اس کے منہ میں کچھ بھی نہ تھی۔ خوشبو موتیا کی نیند اڑا گئی تھی اور اس کے منہ میں اسے دوسری دنیا میں ہی پہنچا دیا تھا۔ اب خوف کے بجائے ارد گرد تحفظ کا احساس تھا۔

☆.....☆
صبح ناشتہ اس نے حمزہ کے ساتھ کیا تھا۔ ماما بھی تھیں البتہ اسماء کو کوئی فیشن شو تھا اور اس سلسلے میں اسے لندن جانا تھا۔ اس لیے وہ پیننگ میں مصروف تھی۔ سہ پہر میں اس کی فلائٹ تھی۔

”موتیا ہم سب اپنے اپنے کاموں میں بڑی ہوتے ہیں۔ اس لیے آپ گھر میں بور ہوتی ہوں گی اگر آپ کا انٹرسٹ ہو تو میں یونیورسٹی میں آپ کا ایڈمشن کروا دیتا ہوں یا پھر کسی پارلر میں آپ کو رس کر لیں۔“ حمزہ نے چائے پیتے ہوئے اسے دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔ جو ناشتہ چھوڑ کے ہونے کی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔

”گھر میں ٹھیک ہے۔ بکھیرہ پالنے کی کیا ضرورت ہے۔“ ممانے ناگواری سے کہا۔

”مما حالات کا کچھ نہیں پتہ چلتا اپنے قدموں پر کھڑا ہونا ضروری ہے اور ویسے بھی موتیا بہت ٹیلیویژن ہے۔ اسے اپنے آپ کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ چاہے پھر میں آپ کا اچھے سے پارلر میں ایڈمیشن کروا دیتا ہوں تاکہ آپ ساری جدید تکنیک سیکھ لیں۔“ حمزہ نے گویا خود ہی فیصلہ کر لیا اور سوائے سر جھکانے کے وہ کبھی کیا سکتی تھی کہ اس کے اندر فیصلہ کرنے کی قوت ہی نہیں تھی۔

☆.....☆
حمزہ نے مہنگے ترین پارلر میں اس کا ایڈمشن کروا دیا تھا۔ زندگی گویا مصروف ہو گئی تھی مگر اس دوران حمزہ سے بھی اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ وہ بہت لگن سے کام لیکھ رہی تھی۔ اس کے کام میں ویسے بھی صفائی تھی۔ اس لیے اسے کافی سراہا جاتا تھا۔ وہ اب اپنے شوق کے ساتھ حمزہ کے سامنے بھی سرخرو بھی ہونا چاہتی تھی۔

☆.....☆
اسماء کا شو بہت کامیاب رہا تھا اور کچھ دن وہ وہاں اپنے ماں باپ کے پاس رہ گئی تھی۔ چھٹی والے دن وہ واپس آئی تھی کہ اپنے ہاتھوں سے حمزہ کے لیے ناشتہ بنا سکے۔ اس نے قہر والے پراٹھے بنا کے آلیٹ بنایا اور اسٹرونگ چائے بنا کر میز پر سجادی۔ حمزہ نے خوشگوار حیرت سے اس تبدیلی کو دیکھا اور مزے سے اس کا ساتھ دینے لگا۔ اس کا دل رکھنے کے لیے ممانے بھی کچھ نوالے لیے تھے۔

”آج کچھ بھی میں خود ہی بناؤں گی مگر مینو آپ لوگوں کی پسند کا ہونا چاہیے۔“ وہ جوش سے بولی۔
”محترمہ اس کی ضرورت نہیں چلیے میں آج آپ کو گھمانے لے جاؤں۔“ حمزہ نے اس کی بات کو ٹوک کر کہا۔ تو وہ منہ بنا کے رہ گئی۔ ممانا شہ کر کے اپنے روم میں جا چکی تھیں۔ وہ کسی کی بھی بات میں بھی انٹرسٹ نہیں لیتیں تھیں۔

”ایک چھٹی ہے وہ بھی ضائع ہو جائے گی۔“
اس نے حمزہ کی طرف دیکھ کر منہ بنایا۔

”کس دنیا کی مخلوق ہو تم محترمہ! ناں تم کو شاپنگ کرنی ہوتی ہے، ناں گھومنے کا شوق ہے اور ناں فرمائش کرتی ہو۔“ حمزہ نے اسے عجوبے کو دیکھا جو عورت ہو کر ان چیزوں کو خرافات کہہ رہی تھی جو عرف عام میں عورت کی شدید خواہش ہوتی ہے۔

”سب کچھ تو آپ مانگے بغیر لے آتے ہیں۔“
ابن نے عقیدت سے اسے دیکھا مگر حمزہ نے گویا ٹھان لی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد وہ اسے اپنے ساتھ لے کے بارہا تھا۔ اس نے موتیا کو کھانا کھانچ کر دیا۔ ڈھیروں ڈھیر شاپنگ کروائی۔ بہت سی لاکھ لاکھ سیٹ لے دیا اور آخر میں لاگ ڈرائیو پر لے آیا۔

”اگر ہمارے ساتھ اسماء آتی ہوتی تو اسے حمزہ دتا۔“ اس کے پیار میں نہال موتیا نے حمزہ سے کہا تو وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کی چالاکی یا مکاری کا شائبہ تک نہ تھا۔ بلکہ لہجے میں ایک عقیدت سی تھی اسماء کے لیے۔ تھک ہار کے رات گئے دونوں واپس آئے۔ موتیا کے دل میں حمزہ کے لیے محبت عقیدت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ اس نے سارے شاپنگ بیگ صوفے پر ڈالے مگر حمزہ کی انہونی خواہش نے اسے حواس باختہ کر دیا۔

موتیا! تم نے جو کچھ پارلر سے سیکھا ہے۔ وہ سب ذرا اپنے اوپر اپلائی کر دو اور ایک شاپر میں بلیک رنگ کی نائی ہے وہ پینک کے میرے پاس آؤ۔“
موتیا جو ٹھنک سے چور تھی اور سونے کے چکر میں تھی نیزہ کی خواہش پر چونک گئی۔ اب اتنی نادان تو نہیں تھی جو تعلق ان کے بیچ تھا اس میں یہ لمحے آنے تو نازیر تھے۔ وہ مرے مرے قدموں سے ٹیکمیل کرنے لگی۔ وہ خود مزے سے ہنر بردار ہو کر LE اپریئل سرچ کرنے لگا۔ بلیک ٹرکی ماپن سی نائی اس کا گلاب بہت گہرا تھا سلیقے سے میک اپ اور بالوں

کو ویسے ہی کھلا چھوڑ دیا۔ اس کا رگد رگد لپٹے وہ بھاری قدموں سے اس کے پاس آئی تھی۔ حمزہ نے فی وی پر نظریں جمائے اس کے لیے کھسک کر جگہ بنائی۔ اس نے ایک نظر حمزہ کی لاہروانی پر اور دوسری نظر اسکرین پر ڈالی۔ تو سامنے کا منظر اس کے چھکے چھڑوانے کے لیے کافی تھا۔ اس نے فوراً حمزہ سے ریوٹ لے کے آف کر دیا۔

”کیوں؟“ حمزہ اس کی طرف مڑا مگر نظر نے واپس پلٹنے سے انکار کر دیا تھا۔ سادہ اور لیج چہرہ سادے سے دلشین ہتھیاروں سے مزین تھا۔

”کتنا گناہ ہے ناں کہ غلط سلط آپ دیکھ رہے تھے۔“ موتیا نے تنگ کر کہا۔
”جب اتنی خوب صورت بیوی بندے کو لفٹ نہ کرائے تو بندہ بشر بھگ تو سکتا ہے ناں۔“ حمزہ نے اس کا رگد لپٹ کے صوفے پر پھینک دیا تو موتیا بری طرح پٹپٹ گئی۔ حمزہ کا یہ روپ بہت انوکھا اور نرالہ تھا۔ اس کے خوب صورت بال پشت تک پھیلے تھے۔ حمزہ نے اسے قریب کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے دونوں بیویاں حسین ذلیل اور وفادار دی تھیں اس معاملے میں وہ خوش نصیب واقع ہو تھا۔

”موتیا!“ حمزہ نے ہر گھونک کی خواہش کی پیاک جہازوں سے لجائی موتیا نے ہنسنے لگی تھیں۔ وہ دہیبہ چہرہ اس کے کتنے پاس تھا۔ سرخ ڈوروں والی شرتی آنکھیں، گندی صاف رنگت، بھرے بھرے ہونٹ اور کالے گھنے بال وہ اس کی گردن پر جھکا تھا۔ موتیا پر عجیب سا نشہ چھا رہا تھا۔ حمزہ دل کھول کر اپنا پیار لٹا رہا تھا اور موتیا چھوٹی مولی بنی اس کے پیار کے سادوں میں پھیک رہی تھی۔ اس کی محبت اب عشق میں ڈھل رہی تھی۔

☆.....☆
حمزہ نے اس کے وجود کو جیسے مکمل کر دیا تھا۔ وہ اس کا خیال رکھتا۔ ہر فرمائش پوری کرتا اور رات کو

پیار لٹانے والا دیوتا بن جاتا۔ تب اس کے سینے پر سر رکھ کے وہ اسے اپنی ساری تکلیف بتاتی کہ کیسے وہ مجبوری میں موتا آپنی کے گھر ٹائم گزارتی۔ حمزہ کی پناہوں میں روتی کہ وہ اس کا واحد سائبان ہے۔ اس لیے وہ بھی بھی اسے ظالم دنیا میں اسے تنہا چھوڑے اور وہ اسے ہونٹوں میں جذب کرتا اس کے نظر نہ آنے والے زخموں پر مرہم لگانے کی کوشش کرتا۔

☆.....☆

ایک دن تحائف سے لدی وہ چچی کے گھر گئی تو وہاں چچی نے اس کا سردمہری سے استقبال کیا۔ ان کی دو بیٹیوں کو اپنے چھوٹے اور زبان درازی کی وجہ سے سسرال سے نکالا گیا تھا۔ موتیا کی پوزیشن دیکھ کر چچی کو جیسے پتہ لگ گیا۔

”ارے برا ہو مونا کا۔ یہ نہیں تم کو گھر میں بلا کے کس کس سے ملواتی تھی۔ میں تو سادہ دوست ہوں میں ناں تو اس کی چالاکی کو سمجھ سکتی نہ تمہاری۔“ ایسے تو بھاگ بھاگ کر نہیں جاتی تھیں تم۔ بھی تو اکیلی رہتی تھی وہ۔ میری بیٹیاں پاکیزہ تھیں۔ اس لیے ان کو کبھی اس نے نہیں بلایا۔“ چچی نے لگی لپٹی بغیر اس کو سنائی اور چچی کی تہمت پر سن ذہن کے ساتھ انہیں دیکھتی رہی۔ پھر بچا سے ملے بغیر وہ چیکے سے نکل آئی۔ چچی کی زبان اب بھی زہر اگل رہی تھی۔ بہتی آنکھوں کے ساتھ اس نے ان گئے گئے رشتوں کو بھی زندگی کی ڈائری سے کاٹ دیا۔ ممائی کچھ فریڈز کی گید رنگ تھی۔ تب انہوں نے کچھ ڈشز اسے بنانے کو کہا تھا۔ اس کی اچھی عادات کی وجہ سے ممائی اب اس سے کچھ بات چیت کرنے لگی تھیں۔ کبھی کبھی فرمائش کر کے اس سے کچھ بنا بھی لیتی کہ اس کے ہاتھ میں ذائقہ بہت تھا۔ آج بھی اس کا بارلر سے آف تھا وہ پورا اور دیگر ملازمین کے ساتھ کوکنگ میں جتی ہوئی تھی۔ کوکنگ آخری مراحل میں تھی کہ اچانک اسے بہت زور کا چکر آیا نزدیک پڑی

کری کو اس نے تھام لیا۔

”کیا ہوا بیٹا!“ بوالبک کر آئی۔

”کچھ نہیں ہوا چکر سا آگیا تھا۔“ اس نے اسے تسلی دی اور دوبارہ کام میں لگ گئی۔ سب کچھ تیار ہونے کے بعد وہ روم میں تیار ہونے آئی کہ ابکائی نے اسے واش روم پہنچا دیا۔ بمشکل اس نے خود کو صوفے پر پہنچایا اور آنکھیں موند لیں۔ دماغ چکر رہا تھا۔ ملازمدار سے بلائے آئی مگر پھر اس کی حالت دیکھ کر لائے قدموں واپس چلی گئی۔ کچھ دیر بعد ممائی اور بوا اس کے روم میں تھیں۔ بوا کی جہاندیدہ نظروں نے لمحے بھر میں سب بھانپ لیا۔ انہوں نے آہستگی سے ممائی کو کچھ بتایا تو ممائی ساری گید رنگ کینسل کر کے اس کو ڈاکٹر کے پاس لے گئیں اور خوش خبری کی تصدیق نے گویا ایک دھماکہ سا کر دیا۔ اس چھوٹی سی بات نے اسے فرش سے عرش پر بٹھا دیا۔ حمزہ کو بھی میٹنگ کینسل کر کے آنا پڑا۔ اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ اب اس نے اساء کو فون کر کے بتایا اور اگلی صبح اس کی فلائٹ تھی۔ بہنوں کی آمد شروع ہو گئی۔ ممائی نے گویا خزانوں کے منہ کھول دیے تھے اور موتیا کے لیے یہ سب بہت خوش کن تھا۔ تنہائی میں حمزہ نے اسے بازوؤں میں گھما ڈالا۔ اس کے چہرے پر پیار کے نکتے ہی پھول کھلا دیے۔

”مانگو میری جان! کیا مانگتا ہے؟“ حمزہ نے سخی بن کر پوچھا۔

”نکھتے میرے رب نے آپ کو عطا کرے سب کچھ عطا کر دیا ہے بس ہمارا بچہ میں اساء آپنی گی کو میں ڈالوں گی کہ یہ ان کا حق ہے اور پہلی اولاد وہ ہی ماں ہیں۔“ موتیا نے حمزہ کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے کہا تو حمزہ کو اس کے سامنے اپنا آپ بہت کم تر لگا۔ وہ انسانیت کی معراج پہنچی۔ ابھی بھی اس کا چہرہ باطن کی پاکیزگی سے چمک رہا تھا۔ کتنی چھوٹی تھی وہ اور کتنا پیارا اور وسیع دل تھا اس کا۔ اس نے بھی اپنی اوقات

سے بڑھ کر نہیں مانگا تھا۔ حمزہ کے بازو پر سر رکھے وہ دنگی تھی اور نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ حمزہ نے آہستگی سے اس کا سر سرہانے پر رکھا اور لٹری کی میں کھڑے ہو کے سگریٹ پینے لگا۔ اس کا دماغ عجیب کشمکش کا شکار تھا۔

☆.....☆

اسماء کی واپسی ہو گئی تھی۔ وہ اور ممائی کا بہت زیادہ خیال رکھتی تھیں۔ پارلر جانا اس کا بند ہو گیا تھا۔ اس کی خوراک کا اور اس کی واک کا باقاعدہ خیال رکھا جانے لگا۔ حمزہ کو اس کو چیک اپ کے لیے لے جاتا مگر جانے کون وہ اسے الجھا الجھا سا لگتا۔ پھوٹی چھوٹی باتوں پر اس کا دل بھرانے لگا تھا۔

☆.....☆

حمزہ اور اسماء نے اس کے لیے مصروفیات سے لقمہ لے دیا تھا۔ اس رات کھانے کے بعد اس کا دل شدت سے آسکریم کھانے کو چاہا۔ حمزہ اسے نزدیک اسنوپی پر لے آیا۔ وہ لوگ واک کرتے ہوئے آئے تھے۔ موسم کافی خوش گوار تھا۔ ہلکی ہلکی ہندا باندی اشارت تھی۔ اسٹریٹ لائٹ کی روشنیوں میں ساری دکائیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس کو یہ پہل پہل اور گھما گھما اچھی لگ رہی تھی۔ مگر اسے ٹھنڈی محسوس ہونے لگی۔ اس نے دوؤں ہاتھ رزرتے ہوئے خود کو گرم کرنا چاہا۔ حمزہ تو قدرے ناموش سا تھا۔ اس کی حرکت پر اس نے ٹھنڈ سے گلابی پڑتا چہرہ دیکھا اور اپنی گرم چادر اسے اوڑھادی۔

”مگر آپ کو ٹھنڈ لگے گی۔“ وہ جھجکی۔

”نہیں ٹھیک ہے۔“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا مگر حمزہ نے ان کی طرف سے ”ویسے محترمہ! آپ کو تو میں اچھی طرح جانتا ہوں مگر حیران اپنی اولاد پر ہوں جو عجیب و غریب

فرمائش کرتی ہے۔ اب ٹھنڈ میں اسے آس کریم چاہئے ماں کو ٹھنڈ لگ رہی ہو اور بی بی کو گرمی۔“ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے حمزہ نے سکرانے ہوئے کہا تو وہ سرخ پڑ گئی۔ آسکریم کھاتے ہوئے حمزہ نے دلچسپی سے اس کا چہرہ اور بھرا وجود دیکھا۔ ماں بننے کے مراحل سے گزرنے کے باوجود وہ دن بدن خوب صورت ہوتی جا رہی تھی۔ کبھی وہ حیران ہوتا تھا درمیانے طبقے سے تعلق کے باوجود بھی اس نے اسے بے جا شاینگ کرتے نہیں دیکھا تھا اور نا کبھی اس نے اس سے زیادہ پیسوں کی فرمائش کی تھی۔ وہ تو اس کی محبت اور توجہ پا کے ہی نہال ہو جایا کرتی تھی۔ حمزہ چپ چاپ اس کی آنکھوں میں چمکتی روشنیاں بغور دیکھتا چلا گیا۔ حمزہ نے اس کا اکاؤنٹ کھلوانے کے لیے بینک فارم اسے سائن کرنے کے لیے دیا تھا۔

”ابھی کی کیا ضرورت ہے۔“

”کیوں ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے پاس تمہارا پاس پل ہے۔ ہونا چاہیے تم اسے پر کرو کہ میں تمہارے نام پر اسے خلیہ رقم ڈال دیا کروں۔“ جانے کیوں وہ مذکورہ کا شکار بن کر فارم پر کر کے دے دیا مگر اپنے اکاؤنٹ پر اچیک بک کے بارے میں خبر تک نہ لی۔

”آپ میری بہت فکر مت کیا کریں۔“ اس نے حمزہ کی گردن میں بازو ڈال کر کہا۔

”جس کے پاس ممائی جیسی ماں اسماء جیسی بہن اور آپ جیسا جان لٹانے والا شوہر ہو وہ کبھی بھی خلاش نہیں ہو سکتا۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ بس مجھے آپ لوگ کبھی تنہا چھوڑ کر مت جانا کہ میری نظر میں وہ شخص فلاں اور قابل رحم ہوتا ہے جس کے پاس کوئی سچا رشتہ نہیں ہوتا۔“ حمزہ کے شانے پر سر ٹکا کے اس نے لاڈ سے کہا تو حمزہ نے اسے قریب کر لیا۔ حالانکہ چہرے پر شجیدگی کی گہری

چھاپ تھی۔ وقت ہو لے ہو لے سرک رہا تھا۔ اس کی ڈیویری کے دن نزدیک آرہے تھے مگر کچھ دنوں سے اس پریشان کن خواب دکھائی دینے لگے ہوا اسے زیادہ سے زیادہ ذکر کے لیے کہتیں۔ وہ کرتی بھی مگر جانے کیوں ایک ہی جیسے خواب اسے اب پریشان کرنے لگے تھے۔ ایک دن چیک اپ کے بعد حمزہ اسے ایک پیارے اور کشادہ سے فلیٹ میں لے گیا جو ویل ڈیکوریٹ تھا۔

”یہ میری طرف سے تمہارے لیے تحفہ ہے۔“ اس نے چابی پکڑ لی تو وہ زرد چہرے کے ساتھ ادھر ہی بیٹھ گئی۔

”اس کی کیا ضرورت ہے بہرا تو اتنا پیارا گھر ہے۔“ اس نے حمزہ کے چہرے پر نظریں گاڑیں۔ ”پان مگر تم نے مجھے زندگی کی ایسی بڑی خوشی دی ہے کہ میں تم کو کچھ گفٹ بھی نہیں کر سکتا۔“ حمزہ نے ہنسنے پر پٹن سے کہا تو وہ بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔

”آپ بہت اچھے ہیں۔ پتہ نہیں میری کون سی نیکی کا صلہ ہیں آپ۔ آپ ہی میری ذات کی تکمیل ہیں۔ اور میرا سائبان بھی۔“ وہ ہو لے ہو لے بولتی حمزہ کے حواس پر چھا رہی تھی۔ ایک بھر پور لکڑی لائف کا حصہ بن کر ویسے ہی سادہ مزاج اور پیار کرنے والی تھی۔ ماما کی عزت کرتی مہمان کے لیے کوکنگ کرتی اسماء کے آگے پیچھے پھرتی اور اس کے لیے گویا وہ جو گین ہی بن گئی تھی۔ عورت کا ایک خوب صورت روپ بھی وہ۔

☆.....☆

کچھ دنوں سے اسماء اور حمزہ کے درمیان عجیب سی سرد جنگ جاری تھی۔ موتیا اندر کی بات سے واقف نہ تھی مگر ایک عجیب سے خوف نے اسے گھیرا ہوا تھا۔

عصر کے وقت وہ باہر لان میں ہوا اور ماما کے ساتھ بیٹھی تھی۔ دھوپ ہو لے ہو لے سرک رہی تھی۔

ہوا مالے چھیل کر زبردستی چھانکیں اسے پکڑا رہی تھیں۔ اچانک دزد کی لہر اٹھی اور اس کا رنگ زرد ہو گیا۔ اس نے بے اختیار ماما کا ہاتھ پکڑا۔

”مکھا ہوا موتیا بیٹا؟“ ماما نے نرمی سے اس کا ہاتھ دبایا کہ ایک اور لہر نے اسے ادھا کر دیا۔ ماما نے اسماء کو آواز دی اور ساتھ حمزہ کو بھی کال ملا دی۔ کچھ ٹائم کے بعد وہ ہاسپٹل کے لیے رواں دواں تھے۔ حمزہ آؤٹ آف سٹی تھے۔ اس کے آنے میں کافی ٹائم تھا۔ یہاں سب اسماء ہینڈل کر رہی تھی۔ لیبر روم میں جاتے ہوئے بھی وہ اس کا حوصلہ بڑھاتی رہی۔

ہوش کی دنیا میں آتے ہی اس نے آنکھیں کھولی تو خوشی سے دھکتے ہوئے چہرے اس کے دل میں جیسے شگوفے کھلا گئے۔ حمزہ بیچ چکا تھا اور اس کے ہاں جڑواں بچے ہوئے تھے۔ بیٹا اور بیٹی پورے ہاسپٹل میں مٹھائی پائی گئی تھی۔ کراؤن سے ٹیک لگائے پہلو میں بچے بچوں کو بغور دیکھا تھا۔ ایک عجیب سے احساس نے اس کے پورے وجود کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ حمزہ نے اس کے ہاتھ پر بوسہ دے کر اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔ چند دن اولاد کے صدقے اسے اتنی وی آئی تھی کہ پان مگر تھک گئی کہ وہ خود بھی مغرور ہو گئی تھی۔ اس نے اپنا بیٹا اسماء کی گود میں ڈال دیا تھا جو اس کی بندھنیوں کو ہاتھ میں لیے نم آنکھوں سے اسے چومتی رہی کہ اس دن کے لیے اس نے اس پل صراط کو پار کیا تھا مگر کچھ دنوں کے بعد جب ایک دن صبح اس کی آنکھ کھلی تو اس کی دنیا لٹ بک گئی تھی۔ حمزہ، ماما اسماء اور بچوں کو لے کر لندن چلا گیا۔ اس کے لیے فلیٹ اور کاؤنٹ میں اچھا خاصا روپیہ چھوڑ گیا تھا۔ اتنا بڑا رامہ اس کے ساتھ کھلا گیا تھا کہ وہ تقدیر سے ہی شاک ہو گئی۔ ہوا ہی ایک اس کا سہارا تھیں۔ وہ اپنے فلیٹ میں شفٹ ہو گئی اس نے اپنے ماضی کو تالا لگا کر چابی کہیں پھینک دی۔ اب وہ جانی مانی موتیا حسن تھی۔ جو دن میں ایک کامیاب

پان مگر اور رات کو ایک اجڑی بیوی اور بے بس ماما کی۔ زندگی سے اس نے سمجھوتہ تو کر لیا تھا مگر اب اس کی پائی میں کھڑی وہ سرک کی چھل پہل، گہما گہمی، ہنسیاں دیکھتی تو اس کے اندر کے اندھیرے اور اس کی بڑھ جاتے دل نادان ابھی بھی حمزہ کو دھوکے باز بننے کو تیار نہ تھا۔ اب بھی سائیں آہٹوں کا انتظار تھیں اب بھی کان کسی کی آواز کے منتظر رہتے اور پان مگر ماما کے لیے ترستے۔

پان مگر سال کا بچہ طویل نہ تھا مگر اس کے لیے پان مگر کے ہاتھ تھے آج بار بار اس نے جلدی کی۔ پان مگر دل عجیب سی بے چینی کا شکار تھا۔ ہوا اس میں تھیں کہ دروازے پر دستک لگے ساتھ ہی اس کا دل عجیب سی لے پر دھڑک اٹھا۔ پان مگر نے ہوا کو کھولا تھا۔ اس نے ہوا کے رونے کی آواز سنی تھی۔ پان مگر ایک مانوس آواز نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ وہ اپنی جگہ دم بخود بیٹھی تھی۔ تب اس نے اس میں کوئی سگریٹ بیگ اور دو بچوں کی انگلی تھامے روم میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کا چہرہ زرد اور کمزور تھا۔ پان مگر دھنسی ہوئی تھیں دونوں بچے سہمے سے تھے وہ ان کے پاس آیا اور تب ہی موتیا کے سامنے بیٹھ گیا اور حسب عادت اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”سمجھ نہیں آتی کہاں سے شروع کروں۔“ وہ

”تم سے دور جا کر ہم میں سے کوئی بھی ایک اتھ جین سے نہیں سو یا۔ قیامت تم پر گزری تو سکھ۔“ اللہ نے ہمیں بھی دور رکھا۔ اسماء کے کہنے پر میں قدم تو اٹھایا مگر یقین کرو چین اور سکون جیسی بات میں تمہارے قدموں میں ہی چھوڑ گیا تھا۔ تمہارے ساتھ کی گئی زیادتی نے مجھے نفسیاتی مریض بنا دیا میں بزنس میں نقصان پر نقصان کرنے لگا اسماء اب احساس جرم کا شکار تھی۔ ماما مستقل بیمار رہنے لگیں۔ اسماء اور میرے بیچ جھگڑے ہونے لگے۔

بچے اس سے سنہلے نہیں تھے ان کے چہروں میں اسے تمہارا چہرہ نظر آتا۔ ایک دن کسی پارٹی سے آتے ہوئے کارا ایکسٹنٹ میں اس کی ڈیٹھ ہو گئی اور میں کو سے میں چلا گیا۔ پتہ نہیں ماما نے ان بچوں کو کیسے سنہالا۔ وہ میری چھوٹی بہن تانیہ کے پاس کینیڈا چلی گئی تھیں۔ بس مجھے ڈیڑھ سال بعد ایک مہینہ پہلے ہوش آیا تو سب سے پہلے تمہارا خیال آیا۔ میرے رب نے مجھے حیا دار، معصوم اور پر خلوص بیوی سے نوازا تھا مگر میں اس کی قدر نہ کر سکا۔ میرا جرم ناقابل معافی ہے۔ میں بخشتو بابا اور ہوا سے تمہارے بارے میں پوچھتا رہتا تھا۔ اس لیے اسماء کے کہنے کے باوجود بھی تم کو طلاق نہیں دے پایا۔“ بچے ہوئے آنسوؤں سے حمزہ نے اسے اپنی ساری داستان کہہ سنائی۔ چہرہ موتیا کا بھی بھگیا ہوا تھا۔ اس نے دونوں بچوں کو خود میں سمجھنا اور رونے لگی۔ بچے خوف زدہ ہو گئے۔ ہوا نے آکر بچوں کو اس سے الگ کیا اور پان مگر نے اس کے لیے باہر لے گئیں۔ تب اس نے حمزہ کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ اس کی سزا کی کہانی سن رہا تھا۔ اس کے رب نے اس کے صبر کی لاج رکھی اور اس کی تکلیف سے بڑھ کر اس کو بھی نہیں دیا۔ تو پھر وہ سزا دینے والی کون تھی۔ اس کے ہاتھ بڑھے تھے اور حمزہ کے آنسو پوروں سے چن لیا۔ حمزہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا دوسرے لمحے وہ اس میں سمٹ کر رو رہی تھی۔

”بہت تھک گیا ہوں موتیا۔“ ”میں آپ کی ساری تھکن اتار دوں گی۔“ موتیا نے اس کے کان میں سرگوشی کی تو اس کے بالوں میں منہ چھپا کے حمزہ شانت ہو گیا۔ دو تھکے ہوئے مسافر محبت کی منزل پر ایک دوسرے کو تھام کر اترے تھے کہ باقی کا سفر ایک دوسرے کی سنگت میں خوشگوار گزرتا تھا۔

☆.....☆

فرید کوٹ کا انجینئر

داروں کے ساتھ اتاری جانے والی تصویریں دیکھ دیکھ کر مسکراتا رہا۔ پراخ میں جو تصویر سامنے آئی اسے دیکھ کر میں بھی حسرت کی تصویر ہو گیا۔

☆.....☆

جیسے ہی فرید کوٹ کا انجینئر قریب آیا۔ انجن کی تیز سیٹی نے آدھی رات کی خاموشی کو چیر ڈالا۔ ساتھ ہی پہیوں کی رفتار بھی دم توڑنے لگی۔ پر میرے دل کی دھڑکنوں کو جیسے نئی زندگی مل گئی۔ ٹرین پوری طرح رکی بھی نہیں تھی کہ میں چھلانگ مار کر اتر آیا میرے علاوہ بمشکل تین چار لوگ اور تھے جو انجین پر اترے تھے۔ فرید کوٹ میری جائے پیدائش تھی زندگی کے بیس سال میں نے یہاں گزارے تھے، پھر میرے والد پورے خاندان سمیت کراچی جا بے توپلٹ کر بھی یہاں آنا نہ ہوا۔ یہاں میرا کچھ ایسا رہ گیا تھا جس نے ہمیشہ مجھے بے گن رکھا اور وہی پانے میں یہاں اپنا کٹ بیگ اٹھا کر میں گھر کی طرف آ گیا۔ جنگلے کے پیچھے چھری بالوں اور داڑھی والا اوگھٹا جاگتا ایک شخص بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے بلی سی چادر اوڑھے کوئی آدمی بیٹھا پر سو رہا تھا۔ ”ہیلو! سنیے جناب کیا آپ بتا سکتے ہیں سلیم احمد کہاں ملیں گے؟“ اس نے سر اٹھایا اور منبر سے بوجھل آنکھیں بمشکل کھولتا ہوا بولا۔

”سلیم سامنے کھڑا ہے۔“ اس کے الفاظ نے مجھ پر شادی مرگ کی کیفیت طاری کر دی۔ ”اوئے! سلیم یہ تو ہے بالکل ہی بابا ہو گیا یار تو تو۔“ میری بات سن کر اس نے پہلے مجھے سر سے چیر تک دیکھا پھر میرے چہرے پر غور کیا۔

وقت کی ڈور ہمارے ہاتھ میں نہیں ہوتی پر یہ وقت ہمیں بہت کچھ دیتا ہے، مثلاً خوشی، غم، ہنسی بہت سے احساسات جو ہمیں اپنوں کے قریب رہتے نہیں ملتے۔ پر جب ہم دور بہت دور ہو جاتے ہیں تب یہ احساسات ہماری رگ چاں میں بس کہ ہمیں قریب رکھتے ہیں۔ پچھلے سترہ سالوں سے میں بھی کچھ ایسے ہی احساسات میں جکڑا ہوا تھا۔ باوجود اس کے کہ جس مٹی سے میرا خیمہ اٹھا زندگی مجھے اس مٹی سے اٹھا کر ہزاروں میل دور ایک ایسے شہر میں لے گئی جہاں ہر طرف کنکریٹ اور لوہے کی آغوش سے بنی بلند و بالا عمارتوں کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ نہ وہ کھیت کھلیاں نہ وہ ندی پگڈنڈی اور نہ ہی وہ خوشبو پھرتی مٹی سے لے گھر اور ان میں بسنے والے خوشبو جیسے لوگ۔ یہاں تو بس چلتی پھرتی مشینوں جیسے انسان دکھائی دیتے تھے۔ پر میرے اندر کی سیلانیت اور میرے پیشے نے مجھے گری گری کا راہی بنا دیا شاید اسی لیے میں ابھی تک مخصوص رشتوں کی قید سے آزاد تھا۔

برسوں بعد میرا کراچی اپنے گھر آنا ہوا تو سوگواریت سے بھرپور فضا نے میرا استقبال کیا۔ میرے والد اچانک حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث چل بے تھے۔ رات گئے تک اپنی والدہ بہن بھائی اور ان کے بیوی بچوں کے درمیان والد کی اچھی اچھی باتیں یاد کرنے کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ دودن کی بے آرامی کے باوجود بھی نیند نہیں آئی۔ میں نے اپنی مخصوص دراز کھولی اور ایک پرانا الم نکال لیا۔ بہن بھائیوں کے ساتھ کچھ نکھیلی اور کچھ دھیلیاں رشتے

میں نے اسے بتایا کہ ”یہاں سے جانے کے بعد سمت مجھے کراچی سے بھی آگے امریکہ لے گئی اور یہاں میں اپنے ماموں کی مہربانیوں اور کچھ اپنی صحت کے بل بوتے پر ایک پرائیویٹ امریکن ایئر لائن سے بابتہ ہو گیا اور اب دنیا جہان میں اڑتا پھرتا ہوں،

☆.....☆

کسی مال گاڑی کی سیٹی کی آواز پر میری آنکھ کھلی تو
نکلی جڑھ آیا تھا۔ صبح نور کے نر کے تک باتیں
کے لئے ہر جے میں اسٹیشن کے ویٹنگ روم
میں سو گیا تھا۔ ٹکٹ فائبر پر اچھی خاصی چہل پہل
شروع ہو چکی تھی۔ چائے کے ایک اسٹال پر اشوک
گھر ایک دیکھے میں گڑھی جانے کو بیٹھ رہا تھا۔
ٹھنھے دیکھ کر مسکرایا اور اشارے سے پاں بلانے لگا۔
وہاں پہنچا تو دیکھا سلیم بھی اسٹال کے اندر بیٹھا
ہائے اور پاؤں کا ناشتہ کر رہا تھا۔ اشوک نے مجھے بھی
گرم گرم چائے کا کپ تھما دیا۔ میں نے سلیم سے
پیشانی کی قبر تک ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ ٹکٹ گھر پر اس
تنت کسی اور کی ڈیوٹی تھی سو ہم دونوں دوست پڑ پڑ
کے قریب واقع قبرستان کی طرف چل دیے۔ رفیق
سلیم کی بیوی کی قبروں پر فاتحہ پڑھ کر ہم وہیں
قریب ریل کی خالی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے
سلیم سے رفیق کی موت کے بارے میں پوچھا تو وہ
بے بسی سانس بھج کر اس کی داستان الم سناتے لگا۔
”یہ تو جانتا ہی تھا کہ باب کے مرنے کے بعد

ان بند کردی ہے۔“ ہم واپس اسٹیشن لوٹ آئے۔

نہیں۔ ایک پچاس پچپن کی بھی دوسری

سر نہ کھجائیں.. Healthy ہو جائیں!

English



بوڑھے کو چنا۔ یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔
”تم نے یہ سب کس کی کو نہیں بتایا تو اب مجھے کیوں
بتا رہے ہو۔“

”میں چاہتا ہوں بربادی کی جو فصل ہر طرف
پک چکی ہے وہ کاٹ لی جائے۔ کچھ ثواب سلیم نے
سمیٹ لیے ہیں اگر چاہو تو کچھ تم سمیٹ لو۔ جو راہ تم
سلیم کو دکھا رہے تھے اس پر خود بھی چل سکتے ہو۔“ وہ
اپنے اسٹال کی طرف بڑھ گیا۔ پر میرے لیے سوچ کا
نیادروا کر گیا۔ میں سمجھ گیا کہ نازو کو اسی نے بلایا ہے۔
میں کہیں میں واپس آیا تو نازو واپس جانے کے لیے
کھڑی ہوئی تھی اور سلیم اسے کچھ پیسے دینا چاہ رہا تھا۔
”رکھ لو نازو تمہارے کام آئیں گے۔“

”نہیں سلیم آج اگر تم سے لے لیے تو کل کسی اور
کے آگے ہاتھ پھیلانے کی شرم جاتی رہے گی۔ مارے
کے جیسے بھی زندگی کی گاڑی چلچل تو رہی ہوں۔“ یہ کہہ
کر وہ چلی اور مجھے دیکھ کر مسکراتی ہوئی بولی۔ ”چلتی
ہوں۔ سیف بہت دور جاتا ہے۔“ خدا حافظ کہہ کر وہ
بہن کے باہر چلی گئی۔ میں نے سلیم کو دیکھا اور سلیم
نے مجھے آگے آگے چلتی وہ فریڈ کوٹ کے بورڈنگ
پینچ کی تھی۔

”نازو! رک جاؤ نازو۔“ میری آواز پر اس کے قدم
رک گئے۔ تیز تیز چلتا میں اس کے قدم مقابل آ گیا۔
”میں تمہیں کچھ دینا چاہتا ہوں نازو۔“ اس کے
چہرے پر مصومیت سی چھائی تھی۔

”پر میرا جواب وہی ہوگا جو سلیم کو دے آئی
ہوں۔“ میں نے اپنا ہاتھ اس کے آگے پھیلا دیا۔
”میں تمہارے لیے تحفظ کی چادر لایا ہوں نازو! اگر
میرا یقین ہو تو میرا ساتھ قبول کرلو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔“
اس نے بے یقینی سے میری آنکھوں میں سچائی کو
خلاشا پھرا گلے پہل اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔
بلا آخر فریڈ کوٹ میں، میں نے اپنی گم گشتہ خوشیاں
پاہلی لی تھیں۔ ☆ ☆

جاتی۔“

ان کی باتیں سن کر ایک خیال بجلی کے کوندے کی
طرح میرے ذہن پر لپکا اور میں فوراً نازو سے
معذرت کرتا ہوا سلیم کو پھینچ کر باہر لے آیا اور پھر جو
بات میں نے اس سے کہی وہ سن کر حیران پریشان
مجھے دیکھتا رہ گیا پھر سر جھکا کر کہنے لگا۔ ”میں ایسا نہیں
کر سکتا۔ میں اپنے دل میں کسی اور کو جگہ دے چکا ہوں
اور بہت جلد زندگی میں بھی۔“

میری آنکھوں میں اس کا چہرہ تھا اور ذہن میں
ماسی شیدا کے پیچھے کھڑی چپ چاپ سی عورت۔
”کیا مہر؟“ میرے سوال کا اس کے ملتے سرنے
مثبت جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔ میں مزید کچھ بول
نہیں سکا۔ جس نیکی کے لیے میں اسے اکسارہا تھا
وہی نیکی وہ کسی اور کے ساتھ کرھنے چلا رہا تھا۔ کچھ
بوجھل دل کے ساتھ میں پلانا تو سامنے شوکھ رہا تھا۔
”میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے ایسا کیوں
کیا۔ مجھے اس سے محبت ہوئی تھی۔ پر وہ میرے ساتھ
مل کر صرف ظلم کی بجھی سے نکلتا چاہتی تھی اس کی سوتیلی
ماں نے اس کا رشتہ اپنے بوڑھے بھائی سے طے کر دیا
تھا وہ میرے ساتھ وہاں سے بھاگ آئی۔ میں نے
اسے عزت کے ساتھ اپنے گھر میں رکھا۔ میری بوڑھی
ماں مجھے کوئی رہتی پر میں نے پروا نہیں کی۔ میرے
لیے اس کا ساتھ بہت تھا۔ پر اس نے میرا ساتھ قبول
کرنے سے انکار کر دیا جانتے ہو کیوں۔“

میں بت بنا اسے سن رہا تھا۔
”کیوں کہ میں ایک ہندو ہوں۔ وہ مذہب کی
حدود جانتی تھی۔ پر یہ نہیں جانتی تھی کہ گھر سے بھاگ
جانے والی لڑکی اور بھگالے جانے والے لڑکے پر دنیا
اور مذہب دونوں زندگی تنگ کر دیتے ہیں۔ میں فکر
مند بھی تھا اور ممکن بھی۔ برباد کر سکتا تھا نہیں کیا پر بدلہ
ضرور لے پڑھا۔ اس کی ماں نے بھی تو بوڑھے سے
رشتہ طے کیا تھا مگر میں نے اس کے لیے نسبت بہتر

پیارا دیوانہ ہوتا ہے

ڈونٹ وری۔“ فی الفور نشاط کی پریشانی دور کرنے کو اس نے ایسے ہی کہہ دیا۔ پر اس کی سلی اتنی عارضی ہوگی۔ شام کو ڈیڈی کو خود پر ڈھیروں پر فیوض اسپرے کرتا دیکھان کے اطوار پر اس کے ہوش صحیح معنوں میں اڑ گئے۔

”بس اس معاملے کو یہیں رک جانا چاہیے۔“ سوچتے ہوئے اس نے گلا کھنکھار اندر چلی آئی۔ ”کہاں جا رہے ہیں ڈیڈ اس وقت..... میرا مطلب ہے صاحت خالد آ رہی ہیں تو.....“

”ہاں دراصل شہر بانو صاحبہ نے اپنی پر مشن کی خوشی میں دوستوں اور کوئیکز کو کھانے پر مدعو کیا ہے تو میں بھی۔“

”پر آپ تو نہ ان کے دوست ہیں نہ کوئی لگ۔“ اس نے نظروں سے انہیں دیکھنے لگی تو وہ پٹپٹا گئے۔ ”اے بھئی ہمسایہ داری اور انسانیت بھی کوئی چیز ہے جسے براہ راست غلو سے بلا رہی نہیں تو اس میں منع کیسے کر سکتے ہیں تو اس کی تفتیش سے گویا برامان گئے۔

”اچھا آپ چلے جائیں میں خالد کو منع کر دیتی ہوں۔ ویسے خالد اتنے دنوں بعد آ رہی نہیں تو سوچا اتنے ڈھیر سارے دنوں بعد سب مل بیٹھ کر کھانا کھائیں گے پر خیر آپ کا جانا بھی ضروری ہے۔“ اس نے چہرے پر ایسی مسکینت طاری کرتے کہا گویا خالد آخری مرتبہ آ رہی ہوں۔

”اچھا ٹھیک ہے میں نہیں جاتا پھر، ورنہ ایک فساد نشو نے بھی کھڑا کر دینا ہے۔ میں ہی منع کر دیتا ہوں شہر بانو صاحبہ کو۔“ ان کے چہرے کی ساری خوشی

پیارا دیوانہ ہوتا ہے مستانہ ہوتا ہے ہر خوشی سے ہر غم سے بے گانہ ہوتا ہے قدیم طرز پر بنے اینٹک پیس کا نمونہ پیش کرتے اس قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے بال سنوارتے بٹ صاحب کے لبوں پر رقصاں دھن نشاط کے ہاتھوں کے طوطے تو کیا کوئے مینا بھی اڑ گئے۔

”میرب! کیا تجھے بھی وہی دکھ رہا ہے جو مجھے دکھ رہا ہے۔“ وہ جان بولا لاوا ایک بنانے کی تیاری میں لگی تھی جب نشو نے کہا۔

”سوری نشو! میں اسے کھینا چھوڑ دیا ہے۔“ ایک کانچر بول میں ڈالے اس کے انداز میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔

”اوہو میں مارٹنگ شوز کی نہیں ڈیڈی کی بات کر رہی ہوں یونو آج کل ان کا انداز کچھ بدل بدل سالا لگ رہا ہے وہ اکیلے گنگنا تے رہتے ہیں کل غمی سے کسی اسٹائلٹ کا پوچھ رہے تھے۔ اب اس عمر میں انہیں اچانک ان کی کیا ضرورت آن پڑی اور تو اور کل میں نے انہیں فون پر کسی کو جان کہتے سنا۔“

”یہ تو واقعی برا بھلا ہو گئی۔“ بولڈ کو اوون میں رکھتے اس کے ہاتھ ایک بل کو تھمتے۔

”سیریلی مجھے تو ڈر ہے کہیں انہیں پھر سے وہ ڈینجرس بیماری یعنی عشق فوبیا تو نہیں ہو گیا۔ گاڈ یہ معاملہ صرف فون تک ہی ہو تو اچھا ہے معاملہ زیادہ آگے نہ بڑھے ورنہ اس عمر میں ایسی حرکتیں بھلا کہاں زیب دیتی ہیں۔“ نشاط کی پریشانی ایک طرف بجا تھی۔

”خدا خیر ہی کرے ایسا ویسا کچھ نہیں ہوگا یو



سارا جوش آن واحد میں سمٹ گیا تھا۔ میرب کو اب افسوس ہونے لگا۔ کیا تھا اگر ڈیڑی چلے جاتے، خالہ پھر کبھی آجائیں، کتنے خوش لگ رہے تھے ڈیڈو۔ میں خواخوہ و نشو کی باتوں میں آگئی شہر بانو کا فون بند جا رہا تھا۔ ڈیڑی کی نظریں بار بار فون کی جانب اٹھ رہیں تھیں کہ شاید ابھی کال آجائے پر فون خاموش ہی پڑا رہا میرب کی مرتبہ اس دوران ان کے کمرے کا چکر لگا چکی تھی۔ وہ ریواننگ چیئر پر ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے تھے۔ کتاب قریب میز پر اوندھی پڑی تھی اور کافی کامگ ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ خالہ بھی اچانک ضروری کام آجانے کے لیے نہ آئیں۔ سارا اہتمام ساری تیاری دھری کی دھری رہی۔ نشو تو کھانے کے بعد فون سے لگ کر بیٹھی تھی۔ لیکن سیٹ کرنی کافی بنا کر دستک دے کر دم کے اندر پہنچی تھی۔

”آپ کی کافی ٹھنڈی پڑ چکی ہے تو تھیں بخانا کے لیے آئی۔ مجھے پتا ہوتا کہ خالہ کا پروگرام ہونے والا ہے تو میں جانے سے ہرگز منع نہ کرتی۔“

آپ کو پتا ہے خالہ کس مقصد سے آ رہی ہیں۔ اب ایسے اہم موقع پر آپ کا ہونا بھی تو ضروری ہے۔“

نشاط اور ضمیر بھائی ایک دوسرے میں انٹرسٹ تھے۔ اب اس لیے خالہ ضمیر کے لیے نشاط کا ہاتھ مانگنے آ رہی تھیں۔ معاملہ چونکہ ان کی لاڈلی بیٹی کا تھا اور نشو کی خوشی سے بڑھ کر ان کے لیے کچھ بھی اہم نہ تھا۔

شہر بانو کا کیا ہے وہ اگلے دن ان سے روبرو دعوت پر نہ آنے پر معذرت کر لیں گے۔ ملاقات کا وہ سوچنے لگے پر اگلے تین دن تک ان کے درشن نہ ہو پائے شہر بانو صاحبہ پنڈی اپنے ماموں کی عبادت کے لیے گئیں تھیں۔ نچلا مکان سونا سونا سا لگنے لگا۔ لبوں پر رقصاں مسکان مہم مہم بڑنے لگی اور پھر بالآخر وہ تین دنوں بعد انہیں نظر آئیں۔ پارک میں چہل قدمی کرتے ہوئے فیروز کی لباس میں کھلی کھلی تازہ دم، شفیقون دوپٹے کے ہالے میں روشن چہرہ اور ناک

میں چمکتا لوگ اس لوگ کی چمک میں وہ ایسے کھوئے کہ گلوں میں روشنی نہ رہی۔ انہیں دیکھتے وہ اپنے آپ میں کہاں رہتے۔ یہ بڑھاپے کا عشق بھی نر سیا پا ہے۔ اس پر چلتے انہیں اندازہ نہ ہوا کہ کب رواں سڑک کے بیچ آگئے وہ تیز رفتاری سے چلتا موٹر سائیکل ان کو مار کر گزر گیا اور وہ ٹکرا کر ایک جانب گر گئے۔

”دھیان سے بٹ صاحب!“ ان کے قریب رش جمع ہونے لگا۔

”ٹھیک تو ہیں آپ۔ یہ آج کل کے نوجوان بھی۔“ کوئی آگے بڑھ کر انہیں سہارا دینے لگا۔

”اچھا ہوا زیادہ چوٹ نہیں آئی۔“ قریب سے مانوس سی آواز ابھری اب سب اس بانیک والے کو ٹوک رہے تھے۔ صدیق صاحب اور نور انہیں گھر تک چھوڑ آئے۔ اس وقت نشو اکیڈمی اور میرب یونیورسٹی میں ہوتی تھیں۔ انہیں سیزھیاں چڑھتا دیکھ کر وہ آگے بڑھیں۔

”میں نے بٹ صاحب اچھیاں تو اس وقت گھر پر نہیں آئے تھے۔“

”میں نے اس کو کال کر لی ہے بس آتی ہوگی۔ جب تک میں نہیں ضرور آرام کر لیں۔ بس جب تک میں دودھ میں ہلکی ہلکی ہوتی ہوں زخم تازہ ہیں اس سے آرام لے گا۔“ وہ مزہم لہجے میں کہنے لگیں۔ وہ آواز کے سحر میں کھونے لگے۔ اب وہ صوفے پر بیٹھی زخمی ٹانگ کا معائنہ کرنے لگیں ہلکی خراش اور موج آتی تھی۔

”آج کل تو انسانیت نام کی چیز ہی نہیں رہی۔“

کیسے ٹھوکر مار کر چلتے بنے مڑ کر پوچھا تک نہیں اور حد ہوتی ہے بٹ صاحب دھیان کہاں تھا آپ کا اگر آپ احتیاط کرتے تو یہ حادثہ رونما نہ ہوتا۔“

”میرا دھیان تو آپ پر ہی لگا تھا۔“ وہ سوچنے لگے۔

”میرب نے جب ایکسیڈنٹ کا سنا تو اس کے ہاتھ پیر ہی پھول گئے۔ آپ کے سوا ان کا ہے ہی، خیال رکھا کریں اپنا۔“ ماما تو ان کی ہیں نہیں۔ یہ بھی اس طرح غفلت برتنے لگے تو ان کے ہاتھ کا کیا ہوگا۔“ دودھ کا گلاس پکڑاتے اچھا خاصا ڈیڈو بھی دے گئیں۔

”آپ جو ہیں میرا خیال رکھنے کے لیے۔“

”جی!“ وہ اچنبھے سے پوچھنے لگیں۔

”میرا مطلب یہ ہے میں آپ جیسے نیک اور رحم الونگ بھی تو ہیں اور دوا کی بات تک ہم جیسے لوگ کی ٹوک ٹرائر کے نیچے آکر دم توڑ گئے ہوتے اور دانی پوچھنے والا تاک نہ ہوتا اور ایک باسٹ کو فیصد بیج ہی آپ نے انسانوں کی بھیڑ سے تو دنیا بھر کی ہے۔ پر انسانیت جیسے ختم ہو کر رہ گئی ہے۔“

”میرب ڈاکٹر کو لیے آگئی۔ ڈاکٹر نے دوا میں ڈیڈو کیا اور مہر مہر رات کو ماش کرنے کے لیے لے کر چلے گئے۔ میرب دواؤں کے ساتھ گرم دوا کا گلاس لیے چلی آئی تو انہیں بائیں کی بجائے بائیں پیر پر مساج کرتا دیکھ وہ وہیں صوفے پر لیٹی۔ پر ڈیڈو کا دھیان بجانے کہاں تھا جو انہیں اس اند کی خبر تک نہ ہو سکی۔

”ڈیڈو پہلے ڈیڈو تو کر لیں کس پیر میں موج دانی ہے میں کب سے نوٹ کر رہی ہوں اور آپ نے نہ بجانے کس کے خیالوں میں گم۔“ خیالوں کا ماننا تو احساس ہوا وہ غلطی سے دائیں پیر پر بام لگ رہے تھے۔ ذرا سی شرمندگی بھی ہوئی بھی خفت نہ تو بولے۔

”ہاں وہ ذرا اس میں بھی درد ہو رہا تھا اس لیے۔“

”ڈیڈو! لائیں دیں میں مساج کر دیتی ہوں۔“

”نات سارا درد اڑاؤں چھو ہو جائے گا۔ جب تک

آپ یہ ٹیلیس لیں۔“ دودھ کا گلاس پکڑاتے وہ گولیاں نکالنے لگی۔ صبح کالج جانے سے قبل شہر بانو پھر چلی آئیں۔ ان کی خیریت دریافت کرنے۔ کیمل کلر کے پرنٹڈ لان کے سوٹ میں ملبوس بلیک چادر اور پینڈ بیگ تھامے وہ جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں وہ یہاں کے مقامی کالج میں پیچھرار تھیں۔ شوہر سے سپریشن کے بعد بیٹے کو لیے اب بٹ صاحب کے گھر کرائے پر وہ رہ رہی تھیں۔ بٹ صاحب جس طرح نرم مزاج اور سیدھے سادھے ہندے تھے ان کی بیٹیاں بھی بالکل ان ہی کا پرتو تھیں۔ سترہ سال قبل شریک حیات کی دائمی جدائی کے بعد اب وہی بیٹیوں کے سب کچھ تھے۔ وہ اپنی بیوی سلوئی سے مثالی محبت کرتے تھے شاید ان کے اب تک تنہا رہنے کی وجہ یہ بھی تھی۔ پر اب نجانے کیسے شہر بانو کو دیکھ کر دل کی مرجھائی گئی پھر سے کھلنے لگی تھی۔ وہ تازہ دم ہی ان کے روبرو تھیں۔

”کالج چلا رہی تھیں سوچا جانے سے قبل آپ کی خیریت معلوم کر آؤں۔ ویسے اس طرح ایک جگہ پڑے رہنے سے اس کا دل اوب جائے گا ذرا ایکسرسائز اور چہل قدمی ہے بہتر محسوس کریں گے۔“ اور اگلی صبح ڈیڈی کو لے کر ایکسرسائز کی کوشش میں ہلکان دیکھ کر وہ اپنا سر تھام کر رہ گئی۔

”کیا کر رہے ہیں آپ، اس کنڈیشن میں ڈاکٹر نے آپ کو زیادہ ہلنے سے منع کیا ہے۔“

”شہر بانو صاحبہ کل کہہ رہی تھیں کہ ایکسرسائز اور چہل قدمی سے صحت بہتر ہوتی ہے تو اس لیے۔“

”ڈیڈو شہر بانو صاحبہ نہ ہوئیں کوئی عالم ہو گئیں جو فتویٰ دے دیا اس پر عمل کرنا ہے۔ یعنی حد ہے بھی۔ آپ کوئی ایکسرسائز نہیں کریں جب تک ٹوٹی فٹ نہیں ہو جاتے اور یہ لیں آپ کا بھر پور ناشتہ۔“

میرب ٹرے رکھتے ہوئے بولی۔

”تم یہ روز ناشتے میں جی پکی دالیں اٹھا کر

لے آتی ہو مجھے نہیں کھانا یہ سب۔ یعنی صبح ہی سزا شروع ہو جاتی ہے اس عمر میں اس طرح کے پھیکے بد ذائقہ کھانے کھلا کر کیوں وقت سے پہلے مار دینا چاہتی ہو۔“ غصہ عود کر آنے لگا۔

”خدا خیر کرے ڈیڈو! ہر وقت اناب شتاب ہی بولیں گے۔ نہیں بتاتی اب سے میں آپ کا ناشتہ کر لیں کسی کھڑے میڈیکل انتظام کیونکہ نشوونما تو دس بجے سے مکمل اٹھنے والی نہیں۔“ وہ غصے میں تن فرن کر کے جا چکی تھی پر دو پہر تک اس کا غصہ ہوا ہو گیا تھا۔ کھانے کی ٹرے اور دووا میں لیے وہ پھر سے چلی آئی۔

”ناشتہ نہیں کیا آپ نے۔“ ناشتے کی ٹرے جوں کی توں پر اس کی تھکی ہوئی۔

”تم کچھ کھانے کے تامل لاؤ تو۔“ ان کا غصہ ہنوز برقرار تھا۔

”اچھا اب کھانا کھالیں کل آپ کی بعد کا ناشتہ بناؤں گی۔ پر صرف ایک دن اس کے لئے کچھ کھانا میری مرضی مانتی پڑے گی۔“

”کیوں ہٹلری جان شین بنی پھرتی ہوا چھی خاصا رنگت برباد کر دی اپنی خود پر توجہ دو پڑھائی پر توجہ دو اس عمر میں لڑکیوں کے شوق ختم نہیں ہوتے اور تم ہو کہ میری بھی وادی بننے کے چکر میں ہوئی وی پر لڑکیوں کو نت نئے فیشن بھاتے ہیں اور تم کو کنگ چینل کھول کر بیٹھ جاتی ہو ہیلتھ ٹی وی کھولے صحت کی ٹیپس نوٹ کر کے آزمائی رہنا۔“

”وہ تو آپ ہیں ہی اتنے خاص۔“ ان کے گلے میں بازو جمائے کرتے وہ لاڈ سے بولی۔ اگلا دن ایک بار پھر مصروفیت کی نذر ہو گیا۔ خالہ تو نہ آئیں پر اس کا جاپان کا ویزا لگ گیا تھا۔ میرب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا تو ڈیڈو اینڈ شیف کورس کے لیے جاپان جانا اس کا خواب تھا جس کی تعمیر اس کی منزل قریب تھی۔ چند ایک دیگر شارٹ کورس بھی تھے۔ یہ اس کی منزل کی پہلی سیڑھی تھی پہلا پڑاؤ اپنی خوشی میں ڈیڈی کی

آنکھوں کی مدد ہم پڑتی چمک نہ دیکھ سکی۔

”تم بھی چلی جاؤ گی پھر نشوونما چلی جائے گی۔ دونوں کے بعد کیسے رہوں گا میں۔“ انداز میں افسردگی سی آئی۔

”ڈیڈو میں کون سا ہمیشہ کے لیے جاری ہوں۔ بس کچھ وقت کی تو بات ہے۔“ بچوں کے بغیر تنہا رہنے کی عادت جو نہ تھی۔ اب یہ تصور بھی گراں گزرنے لگا۔ اکیلے پن کا خیال ہی کاٹ کھانے کا دوڑنے لگا۔ اپنے اکیلے پن کا خیال جوانی میں توں آیا جب بچے چھوٹے تھے۔

”گنتی بتا کر کہا تھا یوسف دوسری شادی کر لے۔ پر تب تو تو نے میری ایک نہ سی اب کی ہو یا۔“ بلقیس قصور سے آئی تھیں۔ نظر کمزور پر لوگوں کو پرکھنے کی نظریہ بڑا تیز تھا۔ کچھ ان کی عمر کا بھی تقاضا تھا۔

”تو اب کون سی دیر ہوئی وہ دھیسے سے کہہ لگے۔“

”اس نے اس عمر میں پھر دنیا والے کیا کہیں گے۔ اور پھر لڑکیاں اس سے آئے گی بھی کنواروں کے لیے۔ لڑکیاں تو بوجھ بنتی ہیں جاتی ہیں۔ اب اس عمر میں مجھے بیٹا ماننا چاہیے۔“

”اس کی آپ فکر نہ کیجیے۔ بچوں سے پوچھ لیں ایک بار۔“ انہوں نے نہ درتے ڈرتے دل کی بات کہہ دی دروازے کے اس پار کھڑی میرب کا سر چکر کر رہ گیا۔

”بچوں کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے اگر کوئی کڑی ہے تیری نظر میں تو کل ہی بات کر آئی ہوں۔ یعنی اب نا تو خالہ بھی ان کی ہموار بن گئیں کمرے میں آکر وہ بیڈ پر دھپ کرنے کے انداز سے آگری یعنی نشوونما کا شک درست نکلا اس بار معاملے کی نوعیت کچھ اور تھی۔

”پہلے کبھی بھار فون پر شغل بازی کر لیا کر۔“

”اب تو نہیں نہیں لوگ کیا سوچیں گے زمانہ کیا کہے گا۔ اب تو کو ہر حال میں ان کے فیصلے سے باز رکھنا۔“ ساری پچویشن نشاط کے گوش گزار کر کے اب ان سرجوڑے بیٹھیں تھیں۔

”آئی ایم ڈیم شیور ہونہ ہو یہ سننا ہی ہوگی۔ گھر کی سفاکی کے بہانے وہ یہاں عشق کی پتلیں لڑانے بہانی ہے کبھی فاروق انکل اور اب ڈیڈو۔ نہیں ڈیڈو اب اس اب اتنی بھی گزری نہیں۔“ میرب فوراً اپنے لپٹے لگی اس کے ذہن میں چلیے رنگوں والی سائیل پیزوں والی سنیتا کا عکس جھلملایا تو اس نے

”اب صبح ناشتہ بنائے اس کا کان پھر سے ہو گئے۔ صبح سویرے پرانے زمانے کی بات چلائے وہ ٹیس پر آنکھیں موندھے۔

”میک شیور نا تو خالہ نے نہیں ضرور کوئی امید کا دیا دیا ہے جی تو ڈیڈو اتنے کول لگ رہے۔“ نشاط کی تو مامو نیندیں ہی اڑ گئیں۔

”ریلیکس ہوں پتا کرتی ہوں اس فساد کی جڑ کو۔“ وہ دل ہی دل میں تہہ کرنے لگی۔

”انہی کو کھیلتے بیٹھیں سے گر کر چوٹ لگی سوچا۔“ معلوم کر آؤں پہلے پڑوسی ہونے کے ناتے سے۔“

”ابھی ہمارے اور پھر شہر بانو صاحبہ اکیلی عورت۔“

”ابھی کیا کہتی پھریں گی۔“ تو یہ ڈیڈو اتنے بن

”تو اب تو بے لگے جہاز ہے۔“

”پھر بالآخر پچھ دوں میں یہ عقدہ بھی چل گیا۔“

”آخر چند دن چوے بلی کے کھیل کے بعد وہ

”اب تو تہہ تک پہنچ ہی گئی۔“

”اب جا گلے کچھ کہیں یہ حسین رات ہونہ ہو۔“

”ناہید پھر اس جنم میں ملاقات ہونہ ہو۔“

بودوں کو پانی دیتی سریلی آواز۔

”کیسی ماں تھی بیٹا چارٹا لگے لگوا کر آیا اور خود کیسے ہے پرواہی پھر رہی تھیں۔ اور سب سے اہم بات آگ دونوں طرف برابر لگی ہے۔ جلدی کچھ کرو میرب، کہیں ڈیڈو اس حسین چڑیل کی ذلفوں کے اسیر ہو کر نہ رہ جائیں۔“ اب کیا بچا تھا پہلے جو چھپ چھپا کر بہانے بنایا کرتے اب ڈیڈو حکم چل عشق کی پتلیں لڑا رہے تھے۔ بھی اسٹی کو آؤ سنکریم کھلانے جاتے تو کبھی ماں اور بیٹے کو لیے پارک میں پھرنے لگے۔ اسٹی کا پڑا کھانے کا موڈ بن رہا تھا۔ میں کیسے منع کر دیتا۔ اوہ گاڈ اس عمر میں یہ چوٹیلے یعنی بیوی کے ساتھ ریڈی میڈ بچہ بھی دیے آفر بری نہیں۔ میرب بھی رفتہ رفتہ ڈیڈی ہموار بننے لگی نشوونما تو پتنگے لگ گئے۔ ویک اینڈ کو صبر آیا۔

”یہ ماموں کو ہو کیا گیا ہے۔“ پچویشن جان کر وہ بھی پریشان سا ہو گیا۔

”تم لوگوں سے ایک عدد باپ کنٹرول نہیں ہوتا۔“

”تو حرج ہی کیا ہے جی تمہاری شادی ہو جائے گی میرب بھی اس کے بعد کورس کے سلسلے میں جاپان چلی جائے گی تب سوچا ہے وہ اکیلے تنہا کیسے رہیں گے۔ ویسے دیکھا جائے تو ان کی خواہش اتنی بری نہیں صرف ان کا انداز غلط ہے۔ کوئی یوں چھپ چھپ کر بھی ایسے کرتا ہے بھلا وہ اگر واقعی اس معاملے میں سرسپس ہیں تو بات آگے بڑھانے میں میرا نہیں خیال کوئی حرج بھی ہے۔ ایک بار وہ شہر بانو صاحبہ سے بات کر کے دیکھ لیں اس کے بعد ہی آگے کچھ کہا جاسکتا ہے۔“ نشاط آنکھوں میں

”ابھی پریشان سا ہو گیا۔“

”ابھی ماموں کو ہو کیا گیا ہے۔“

”تو حرج ہی کیا ہے جی تمہاری شادی ہو جائے گی میرب بھی اس کے بعد کورس کے سلسلے میں جاپان چلی جائے گی تب سوچا ہے وہ اکیلے تنہا کیسے رہیں گے۔ ویسے دیکھا جائے تو ان کی خواہش اتنی بری نہیں صرف ان کا انداز غلط ہے۔ کوئی یوں چھپ چھپ کر بھی ایسے کرتا ہے بھلا وہ اگر واقعی اس معاملے میں سرسپس ہیں تو بات آگے بڑھانے میں میرا نہیں خیال کوئی حرج بھی ہے۔ ایک بار وہ شہر بانو صاحبہ سے بات کر کے دیکھ لیں اس کے بعد ہی آگے کچھ کہا جاسکتا ہے۔“

بارود بھرے شعلے سے دیکھنے لگی۔

”ایم ڈیم شیور میرے مرنے کے بعد تمہارا بھی یہی ارادہ ہے۔“ وہ کہنے لگی۔

”لاحول ولا یقین“ میں اب تمہارے ڈیڈی کی طرح تو ہوں نہیں صابر، شاکر جنہوں نے تمام عمر تم دونوں کی خاطر شادی نہ کی کہ کہیں سوتیلی ماں کے مظالم تم لوگوں سے تمہارے بچپن میں آنکھوں سے خواب ہی نہ چھن لیں۔ اب ایسا صبر آج کل کہاں۔“ کیسا طمانیہ تھا۔ کتنی گہری بات کہی تھی۔ ضمیر بھائی نے چائے کی ٹیبلے لیے جو دروازے پر سن سی کھڑی رہ گئی جب کہ اندر کشن سے اس کی فیوچر کی شاندار پلاننگ پر آؤ بھٹ کرنے لگی۔

”ہونہہ مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تمہاری نیت میں فتور ہے مگر کان کھول کر سن لو۔ میں اتنی اطمینانی سے مر کر تمہارا پیچھا چھوڑنے والی نہیں۔“ کتنی جلدی پر کھڑے کروہ گم سم سی پلٹ آئی، میسر پر گہری جامد غلامی کا راج تھا۔ ڈیڈی جو موچی کے باوجود آج کی تاریخ کی یہ حیرت انگیز بات تو تھی۔ لبوں پر دھین جو ہر وقت کی رہتی غائب تھی یہ خوش آئند بات نہ تھی۔ ڈیڈ جن کی مسکان ایسی تھی جیسے ابھی ابھی مسکراتا دیکھا ہو۔ خوش ہونے کے معنی جان گئے ہوں جیسے ورنہ پہلے تو حالات کی چکی میں پس کر گھن چکر بن گئے تھے۔ وہی مسکان وہی چمک ماند پڑنے لگی۔ کل شام تک سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا اب یہ اچانک۔

☆.....☆

”شہر بانو صاحبہ! وہیں جا رہی ہیں۔ میرب!“

”اوہ تو یہی ان کی افسردگی کی وجہ۔“

”ہمیشہ کے لیے۔“ پچھلے پانچ سالوں سے وہ

ان کے گھر کے نچلے پورشن میں بطور کرائے دار رہ رہی تھیں جب وہ یہاں آئیں تھیں تو اتنی محض چار سال کا تھا۔ سیکے کے نام پر ان کا صرف ایک ماموں تھا۔ زعیم عباسی سے ڈائریوس کے بعد ماموں کی

طرف جانے کی بجائے انہوں نے اسی شہر میں رہنے کو ترجیح دی وہ ایک انڈیپنڈنٹ خاتون تھیں دوسروں کے سہارے جینے کے بجائے اپنی قوت بازو پر اپنی مدد و تحنت میں رہنے کو ترجیح دی پر اب اچانک ان کا جانا معاملہ چاہے جو بھی ہو، ڈیڈو کی اداسی افسردگی اس سے دیکھی نہ گئی۔

”آپ انہیں روک لیں ڈیڈا!“ واقعی ضمیر بھائی نے سچ کہا ان کی خواہش اتنی بری نہ تھی بس ان کے انداز غلط تھا۔ ان کی آنکھوں میں چمک سی در آئی۔

”پر لوگ کیا کہیں گے زمانہ کیا سوچے گا۔ انہوں نے نکتہ اٹھایا۔

”آپ انہیں بس روک لیں ان سب کی ٹینشن نہ لیں آپ۔“

”انگل زندگی آپ کی ہے تو فیصلہ بھی آپ کو کرنا ہوگا اور پھر دنیا کیا سوچے گی یہ اہم نہیں۔“ ضمیر کی بات پر وہ سوچ میں پڑ گئے۔ میرب کی باتوں اور ضمیر کے دیکھے حوصلے سے بالآخر انہوں نے شہر بانو سے بات کرنے کی ٹھان لی۔ پر شاید تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اسی اس شش دن میں تھے کہ کیسے شہر بانو تک دل کی بات پہنچا کر۔ وہ اگلے دن کارڈ لے آئے پانچویں۔ شہر بانو کی شادی وہ کتنے پل بے یقینی سے کارڈ کو دیکھتے رہے۔ شادی سے قبل ماموں نے انہیں اس لیے بلوایا تا کہ وہیں سے ان کی رخصتی ہو اور وہ نعمان صدیقی کے سنگ رخصت ہوں اور وہ ان کا دل انہیں ایک بار بھی خیال نہ آیا۔

☆.....☆

وہ تو پھر سے تمہارہ گئے خاموش محبت کی کوئیل کھلنے سے قبل ہی مر چھا گئی گردش وقت ٹھم سی گئی۔ کتابیں ہمارا بننے لگیں تنہائیاں پھر سے مانوس ہونے لگیں۔ انہوں نے باہر جانا ملنا جلنا تقریباً ترک کر دیا۔ بی وی بیٹھے دیکھتے ان کا دھیان کہیں اور لگا ہوتا۔ یہ بات واقعی اس کے لیے تشویش کا سبب تھی۔

اپنے ڈیڈی کا ہر طرح خیال رکھنے کی کوشش میں، ضمیر کو ایک شارٹ کورس کے سلسلے میں جانا پڑ گیا تو نشوونما کی شادی چند ماہ کے لیے ہی سردی گئی۔ ہنگامے ختم سے گئے برے خود میں فی ہید سوئے ایک بار پھر چل پڑا نچلے گھر کے لیے آئے دار کا بندوبست نا حال نہ ہو سکا گو کہ اس کی ماس ضرورت نہ تھی پر خالی پڑا رہنے کے خیال سے آپ نے بورڈ لگا دیا اور پھر چند دنوں بعد ان کی رخصتی ہوئی۔ ریٹائرڈ فلائٹ لفٹیفٹ نفیہ نقی کی انہیں بے ہنگاموں سے دور ایک پرسکون رہائش گاہ کی تلاش تھی اور یہ جلد بین ان کے معیار کے مطابق تھی۔ وہ اس کالونی میں مذکور صاحب کے توسط سے آئیں تھیں پر بہت کم وقت میں ان کا سب سے ملنا ملنا اور میل ملاپ بن گیا۔ سب کے مسائل میں ان کا ہاتھ بڑھتا اور ان کا حل تلاش کرتے۔ سب کا درد لعل کا دانا۔ دوسروں کی تکلیف میں غمرہ ہونے والی اور اشی میں خوش ہونے والی، آتے ہی انہوں نے ہائی کی کئی مسائل جو منہ کھولے کئی سالوں سے حل ہونے کے منتظر تھے چنگیوں میں انہیں حل پایا۔ وہ ایک ہمدرد، نیک دل اور بے غرض انسان تھیں۔ باقی سب کی طرح نشاط اور میرب سے بھی ان کی گارنٹی چھیننے لگی۔ البتہ بٹ صاحب ان سے ادا فاصلے پر رہتے انہیں سستی کاہلی سے نفرت تھی۔ ان کا گنگ کے بعد وہ دیگر کاموں میں کمر بستہ ہو گئے، ان کی دیکھا دیکھی نشاط بھی اب اونگھتے ہوئے ایک سرسبز کر لیتی گھر کے دیگر کاموں اور نانی میں بھی اب دلچسپی سے حصہ لینے لگی۔ وہ اتنے وقت میں ان کے اتنے قریب آ گئی گویا سدا سے بنی کا حصہ ہی ہوں۔

”ایز فورس میرا خواب تھا جس نے مجھے اپنوں سے دور کر دیا ماما اور پاپا کا تو میرے بچپن ہی میں پیش ہو گیا۔ بابا بزنس میں ایسے مگن ہوئے کہ گھر

کی طرف ان کی توجہ نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ بھائی عثمان تو ایز فورس جا کر سیٹل ہو گیا۔ اور وہیں فیملی بنائی پاپا چاہتے تھے میرا بھی گھر بس جائے پر شادی کا مطلب تھا اپنے خواب سے دستبردار ہو جانا جو کہ مجھے بالکل منظور نہ تھا۔ میرے فیصلے سے کبھی کو اعتراض تھا سوائے دادو کے جنہوں نے مجھے ہمیشہ سپورٹ کیا۔ میرا جنوں مجھے میری منزل تک تو لے آیا پر ہر بڑھتے قدم کے ساتھ ماضی اور ماضی سے وابستہ ہر چیز دھند کی طرح اپنے نشان مٹاتا رہا اس فورس میں آنے کے چار سال بعد پاپا معمولی ہارٹ ٹیک سے چل بے اور پھر کڑرتے وقت نے یہ احساس دلایا کہ میرے ہاتھ تو بالکل خالی رہ گئے۔ اور آگے بڑھنے کی جاہ میں درحقیقت میں بہت پیچھے رہ گئی۔“ وہ بھی ایک شکستہ، ٹوٹی پھوٹی شخصیت کی مالک تھیں پر خود پر خول چڑھائے زندہ تھیں ان کی چمکی مسکان اندر جیسے درد اور کاپتہ دیتی ان کی گہری باتوں پر وہ اکثر چونک جاتے۔ ان یوں ہی میرب نے پوچھا کیا۔

”آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی۔“ تو وہ ہیکے سے بولیں۔ ”یوں سمجھو جس آئینہ کی مجھے تلاش تھی وہ شاید نمل سکا۔“ ان کے جواب پر وہ افسردہ سی ہو گئی۔

”تم واقعی بہت کمال کی لک ہو میرب! بہت کئی ہیں بٹ صاحب کہ تم جیسی ان کی بیٹی ہے۔“ ان کی تعریف پر وہ جھینپ سی گئی وہ اب بچن کے کام کرتیں باغبانی کا انہیں بے حد شوق تھا۔ وہ شوق اب پورا کر لیتیں اور فراغت میں اپنے پیچ پر ایف بی کے ایز فورس کے شوقین افراد کو گائیڈ بھی کرتیں۔ زندگی میں اتنا سب کچھ کرنے کے باوجود گویا اب ان کے پاس کرنے کو کچھ نہ بچا تھا۔ ان کے انداز سے مایوسی، کم مائیگی کا احساس پھلکتا جو دوسروں کا غم بانٹنے پھرتیں ان کا اپنا درد سمجھنے والا کوئی نہ تھا۔ پر

میرب ان کے لفظوں میں چھپے کرب کو بھانپ گئی۔
 ”اپنی منزل اپنی خواہش کے پیچھے اتنا جنونی
 مت ہو جانا کہ کہیں یہ قیمتی وقت ریت کی مانند
 تمہارے ہاتھ سے نکل جائے اور فقط کچھ تارے اور
 خسارے ہی نہ رہ جائیں۔“ اس کی خواہش جان کر
 انہوں نے بہت سچے کی بات کہی تھی اور فیصلہ جو
 اسے کرنا تھا اور وہ فیصلہ ہو چکا تھا۔ جس ذہنی بے
 سکونی اور الجھنوں کا وہ شکار تھیں کم و بیش ڈیڑھ کی بھی
 یہ ہی حالت تھی اور پھر کیا حرج ہے جب دو تہا لوگ
 ایک مضبوط رشتے میں بندھ جاتے ہیں۔ ایک
 دوسرے کا سہارا بننے میں تو تمام ٹکٹائیں تمام الجھنیں
 بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ڈیڑھ ایک کی سوچ جان کر
 بہت خفا ہوئے۔
 ”تم ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہو۔ میرب! وہ
 ہماری کرائے دار ہیں۔ بہت اچھی خاتون ہیں اور
 میں ان کی بہت عزت کرتا ہوں پر جیسا تم سوچ رہی
 ہو وہ امپابل ہے۔ کبھی کبھار کا کبھی مذاق کرنا اور
 بات ہے اور حقیقت ان سب کے برعکس ہوتی ہے
 اور جہاں تک شادی کی بات ہے تو وہ میں نے تیب
 کیوں نہ کی جب تمہیں اور نشو کو ماں کی ضرورت تھی
 کیونکہ میں سلوئی کی جگہ کسی اور کو دیے ہی نہیں سکتا۔“
 میرب کو ان کے جواب کی توقع نہ تھی۔ وہ مایوس سی
 وہاں سے چلی آئی۔ پر اصل حقیقت تو بعد میں کھلی یہ
 سب شہر بانو صاحبہ کے انکار کا نتیجہ ہے جو ڈیڑھ اتنے
 دگر فرتے تھے۔ شہر بانو نے نہ صرف انہیں انکار کیا بلکہ
 ان کی محبت کی تذلیل کی تھی اور پھر ایک بار ٹھوکر
 کھانے کے بعد اب دوسری مرتبہ وہ رسک نہیں لینا
 چاہتے تھے۔ تو یہ تھی ان کے نفسیہ سے اتنے کچھ کچھ
 روپے کی وجہ۔ انہیں اسی بات کا تو انفس تھا جیسے
 شہر بانو انہیں رد کر دیتیں پر سب کے سامنے ان کی
 محبت کی تذلیل نہ کرتیں وقت واقعی کسی کے لیے نہیں
 رکھتا اور وہ بھی ایک بار پھر اس گردش وقت کا حصہ

ان نفسیہ جی نے جیسے ان کی آنکھیں کھول دیں۔
 اپنی خواہش اپنی خوشی اپنی زندگی میں وہ اتنے کم سے
 اتنے کہ وہ ڈیڑھ کو ان کی ضرورتوں کو بھی سمجھ نہ سکے۔
 اور انہیں۔ جی اب ان کے دل کا حال بھی جاننے کے
 لیے ابھی وہ چپ رہیں تو یہ سراسر ان دونوں کے
 نامہ زبانی تھی۔
 ”نفسیہ جی شاید ڈیڑھ سے کچھ کہیں بھی یا نہ۔“
 اب ہر حال میں ڈیڑھ کو کنوینس کرنا تھا اور ڈیڑھ بھی
 اپنے فیصلے سے ایک انچ ہٹنے کو تیار نہ تھے۔ اس نے
 انہیں منانے کی اپنی سی کوشش کی وہ چپ چاپ ان
 نامہ کر دیتی اور ان سے بول چال بالکل ترک
 کر دی اور نشاط کا کسی بھی حال تھا۔ چند دن یوں
 انہیں ملے چلتا رہا پھر بالآخر وہ تھک رہ گئے۔
 ☆.....☆
 ”تم واقعی بہت ضدی لڑکی ہو میرب! اور ڈیڑھ
 تم نے اپنے ساتھ ملا لیا۔ ایک گھر میں مجھے
 ابھی ہم بیویوں اس طرح اجنبیوں کی طرح
 رہنا پڑا۔“
 ”تو پھر آپ مان جائیں۔“ اس کی بات پر
 وہ بیوی میں پڑ گئے۔ شام کو نفسیہ جی آئیں ان کی
 آنکھیں کھولنے۔
 ”میں نے بھی عام لڑکیوں کی طرح ایک
 بلی تراشا ایک مضبوط کردار کے ہمسفر کی چاہ کی
 تھی۔ اب بھر کی خاک چھاننے کے بعد بھی میری
 دل رہی۔ میری منجھنی سرفراز سے اسی وجہ سے ٹوٹی
 تھی۔ جس شخص کی نظر میں عورت کی کوئی عزت نہیں
 تھی۔ نظر میں وہ شخص انسان کہلانے کا مستحق نہیں۔
 یا اور ماما کے ڈائیورس سے مل پاپا کا پڑوسن کے
 لیے انہیں چل رہا تھا اسی وجہ سے یہ ریلیشن ٹوٹا۔
 میں بہت چھوٹی تھی۔ پر کچھ ذہن میں وہ بات
 اب ہو کر رہ گئی ہر مرد مجھے فریب کے اس کھیل کا
 ٹانے لگا۔ پر آپ سے ملکر جانا کہ مرد صرف ایک

طرح کے نہیں ہوتے۔ آپ کی وفات میرے دل
 میں آپ کا احترام اور بڑھایا۔ وہ محبت جو آپ نے
 کبھی سلوئی سے کی جس کو اب تک بھرا ہے ہیں کیا
 اس محبت کے سمندر کا ایک قطرہ مجھے بھی مل سکتا
 ہے۔ خدا میں نے بھی ان کی جگہ لینے کے متعلق
 نہیں سوچا جس اتنی سی امید ہے میری محبت اور میری
 وفائیں آپ کے دل میں جگہ کر لیں گی۔ اپنا آپ
 منوالیں گی کیونکہ آپ کا ہمسفر بننا آپ کا ساتھ
 میرے لیے قابل فخر ہوگا۔ اس گھر اور اس کے
 مینوں سے جو وابستگی جو انچنٹ ہوئی ہے میری
 خواہش ہے بھی نہ ٹوٹے۔“ وہ چند ثانیے اس کے
 چہرے سے نظر نہ ہٹا سکے جس کے لفظوں میں
 صداقت ہی صداقت تھی۔ وفا کے رنگ تھے۔ وہ خود
 ان کے ساتھ کی متمنی تھیں۔ ان کے آگے بڑھے
 ہاتھ کو ان کی محبت کو کیسے مسترد کر دیتے اس محبت کو
 مسترد کر دینا کفران نعمت تھا۔ وقت نے رشتوں کے
 تانوں کو اور اہمیت کو واضح کر دیا تھا۔ ان کا ساتھ پانا
 ان کی خوش قسمتی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ اور وہ
 ان کی محبت کو مسترد کر کے شہر بانو نہیں بننا چاہتے
 تھے۔ انہوں نے جاموس سے اپنی رضامندی دے
 دی، میرب اور نشو کو بھانپنے کا حکمانہ ہی نہ رہا۔
 ”میرا خیال ہے اب مزید تاخیر نہیں کرنی
 چاہیے ورنہ جس حساب سے ڈیڑھ دل پھینک واقع
 ہوئے ہیں تو کہیں کوئی اور ہی۔“ نشو کی بات پر وہ
 چونک گئے۔
 ”یو ڈونٹ وری اب میں آگئی ہوں نا سب
 سنبھال لوں گی۔“ اس کے کمال پر چٹکی بھرتے انہوں
 نے شرمیلے سے لہجے میں کہا۔ تو ان کی اس ادا پر وہ دل و
 جاں سے فریفتہ ہو گئے قدرت نے گویا انہیں ان کی
 حیثیت سے بڑھ کر نوازا تھا۔ اب اس اہم موقع پر شکر
 کرنا تو بیڑا تھا نا اور کم از کم وہ ناشکرے تو نہ تھے۔
 ☆.....☆

دل پر مصیبت کی دستک

”سلوئی! غنوی نے اس کو بھوڑ کے رکھ دیا تھا۔

”کیا مصیبت ہے غنوی! پاگل ہو گئی ہو کیا؟“ سلوئی نے اپنے دونوں بازو اس کے ہاتھوں سے چھڑا دیے۔
”مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تمہارے سینے میں دل ہے یا خدا نے کوئی پتھر فکس کر دیا ہے۔ کوئی اپنی عقل کوئی



”نہ ہے بھی یا نہیں۔“ وہ ٹھیک ٹھاک برہم ہو رہی تھی۔

”اوکے فائن تو تم یہ بتاؤ میں کیا کروں، ماما وہاں اسپتال میں آئی سی یو میں ایڈمٹ ہیں وہ چاہتی ہیں کہ جلد بعد میرا نکاح کسی سے کر دیا جائے تو کیا برائی ہے اس میں۔“

”کسی سے کر دیا جائے مطلب کسی اور لڑکے سے اور یہ برائی کیا کم ہے کہ شہکاش ملک سے تمہارا نکاح نہ جارہا ہے۔ وہ شہکاش ملک جس کے سینے میں واقعی دل نہیں پتھر ہے جو زندگی کے معنی نہیں جانتا تم جیسی بی بی مٹی سے گوندھی لڑکی کہاں تک اس پتھر دل انسان سے اپنا سر پھوڑے گی۔“

یلوئی نے بغور چاہت سے اپنی چھوٹی بہن کو دیکھا، جو اس کے لیے فکر مند تھی اس کو سوچ سوچ کر گھلی ہوئی تھی اندر ہی اندر، وہ اس قدر غصے میں تھی اس وقت اس کا پس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کچھ نہ کر کرے ہر شے

ملک ناز



کوئیں نہیں کروے یا پھر شہکاشہ ملک کے وجود کے ایک ہزار ٹکڑے کر دے اس کی دنیا تہہ وبالا کر دے۔
 ”میری جان محبت وزنی سے ہر شے کو اپنے مطابق کیا جاسکتا ہے جیسے چاہے موڑا جاسکتا ہے۔“ سلوئی
 غنوی کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔
 ”مجھے تسلی دینے کی ضرورت نہیں ہے سلوئی! اور نہ ہی تمہیں کسی بھرم میں رہنا چاہیے۔ وہ کوئی شے نہیں
 شہکاشہ ملک ہے جس کو تم کیا محبت وزنی سے موڑ دو گی وہ خود تمہاری زندگی اجیرن کر دے گا۔“ غنوی نے سلوئی
 دونوں ہاتھ بری طرح جھڑک دئے تھے۔

”بد عادے رہی ہو اپنی بہن کو۔“ سلوئی کے پاس غنوی کو زیر کرنے کے ایک سوا یک طریقے تھے۔
 ”اللہ نہ کرے جو تم پر بد عاد کا معمولی سا بھی ساہ پڑے۔“ اس نے تڑپ کر سلوئی کو خود سے بھینچا تھا۔
 سلوئی کی بہ نسبت غنوی شوخ و چٹیل زندگی کو دل آویز کرنے والی اور اپنا آپ منوانے والی تھی بلکہ اسکول
 کالج میں اگر کوئی لڑکی سلوئی کو کچھ کہے بھی دیتی تو خود ہی لڑنے بھڑنے کو تیار ہو جاتی مرنے مارنے کو آ جاتی، سلوئی
 کے مقابل میں غنوی ڈرا جذباتی اور غصے کی تیز تھی۔

”سلوئی! منع کرو اس رشتے کے لیے شہکاشہ ملک تمہارے قابل نہیں ہے بلکہ میں تو کہتی ہوں وہ کسی
 لڑکی کے قابل نہیں ہے شہکاشہ ملک اپنی ذات کا الگ ہی نمونہ ہے اس میں کائنات چھپ چھپ سکتے ہوئے
 تھا اور اب کے سلوئی اپنی بے ساختہ ہنسی کو نہیں روک سکتی تھی۔

”بس ہنسی رہو سخت زہر لٹ رہی ہو مگر یاد رکھنا ڈیڈی سے میں خود بات کروں گی میں یہ شادی قطعی طور پر نہیں
 ہونے دوں گی۔“ اٹل لب و لہجے میں کہتے ہوئے وہ منہ پھلا کر صوفے پر بیٹھ گئی تھی، سلوئی اس کی طرف بدوشی
 اس کا سوا بکل چیخ پڑا تھا، فون اسپتال سے آتا تھا، اس کا دل دھڑکا، یعنی وہ قیامت کی گھڑی آگئی تھی، سلوئی
 غنوی کو دیکھا جو اسی طرف دیکھ رہی تھی، غنوی بھی اس کی طرف سے اٹھ گئی تھی اور سلوئی کے پاس آئی، فون دیکھا راجیل
 آفریدی کا فون تھا۔

”ڈیڈی کا فون، لاؤ میں بات کروں گی دو مجھے فون۔“ غنوی نے سلوئی کے ہاتھ سے فون لینا چاہا۔
 ”پاگل ہوئی ہو کیا، ماما اسپتال میں ایڈمٹ ہیں بلا وجہ ڈیڈی کو نہیں ملے گا۔“ غنوی کی جذباتیت کو وہ
 طرح جانتی تھی، اس لیے ہلکے سے ڈانٹ دیا تھا مگر غنوی پر سلوئی کی ڈانٹ کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

”سلوئی بے وقوفی کی باتیں مت کرو، جو ہو رہا ہے اسے ہونے دوں ایسا ہی نہیں ہو سکتا میں تمہیں
 بوجھتے اس آگ میں کودنے نہیں دوں گی۔“ غنوی نے ایک بار پھر اس کے ہاتھ سے فون لینا چاہا مگر اس بار سلوئی
 نے اس کے منہ پر دھیرے سے چاٹنا مار دیا تھا۔

”تم نے مجھے مارا ہے۔“ رو با کسی منہ پر ہاتھ رکھے وہ سلوئی کو بھیگی آنکھوں سے دیکھنے لگی تھی۔
 ”غنوی! میری بات سنو۔“ سلوئی کو اپنے اس اچانک رد عمل پر شدید افسوس ہوا تھا۔

”تم ہوئی نہیں اس لائق کہ تمہارے ساتھ بھلائی کی جائے جاؤ دو آگ میں جہنم میں جاؤ تم اب میں تمہیں
 نہیں روکوں گی جب انسان خود ہی اپنے ساتھ برا کرنے پر ڈیٹ جائے تو کوئی اس کے ساتھ بھلائی نہیں کر سکتا
 اور پھر وہ کی نہیں سسکتی ہوئی اپنے بیڈروم میں بھاگتی چلی گئی تھی۔ فون ایک بار پھر تیل دینے لگا تھا، اس نے فون
 دیکھا اور ریسیو کر لیا تھا۔

”جی ڈیڈی کہیے۔“

”بیٹا! میں کب سے آپ کو فون کر رہا تھا کہاں تھیں آپ۔“ وہاں سے پریشانی سے لبریز آواز ابھری تھی۔
 ”ڈیڈی میں ڈرا چیکن میں تھی۔“

”چلو ٹھیک ہے یہ بتاؤ کب تک پہنچ رہی ہو یہاں سے ڈرا نیور نکل گیا ہے۔“
 ”بس ڈیڈی میں آدھے گھنٹے میں پہنچ جاؤں گی اور ماما کی طبیعت کیسی ہے؟“
 ”کچھ بہتر ہے۔“

”اوکے بس میں تیار ہو جاؤں آتی ہوں۔“
 ”اوکے بس جلدی آؤ، کیونکہ آغا جان اور شہکاشہ آچکے ہیں۔“

”جی! خوب صورت چہرے پر اداسی اداسی تھی۔ ایک سر دسانس کھینچتی وہ اپنے بیڈروم کی جانب بڑھی
 تھی۔ ڈرا نیور کے ہمراہ سلوئی کچھ ہی دیر میں اسپتال پہنچ چکی تھی۔
 ”السلام علیکم!“

آئی سی یو کے مامروں نے راجیل آفریدی، آغا جان بیٹھے تھے آغا جان خوشی سے نہال ہوتے اٹھے
 ان کے سر پر درخت شادیت بھرتے ہوئے اس کے سر پر بوسہ لیا تھا۔

”جیتی رہو خوش رہو۔“
 ”شہکاشہ! آغا جان نے دو دھڑکے کی سے فون پر بات کرتے شہکاشہ ملک کو آواز لگائی تھی، شہکاشہ
 نے پلٹ کر آغا جان کو دیکھا اور فون آگ لگا کر شہکاشہ چلا آگے بڑھا۔
 ”جی آغا جان!“

”بیٹا سلوئی آگئی ہے سب ریڈی ہے شہر مل کہاں ہے؟“ آغا جان کے لبوں پر خوشی سے بھری مسکراہٹ
 تھی۔ ان کے ساتھ کھڑی سلوئی کو شہکاشہ نے لمحے بھر کے لیے دیکھا تھا مگر اس لمحے بھر میں نفرت کی ایک آگ
 تھی اس کے پورے وجود میں، اعصاب میں ایک تناؤ سا آگیا تھا، نگاہوں میں دہکتے انگاروں کی ایسی تیش
 تھی جس نے سلوئی کو اندر تک جھلسا دیا تھا، وہ نہ دیکھ کر بھی محسوس کر سکتی تھی کہ ان آنکھوں میں اس کے لیے نفرت
 کی شعلے نکل رہے ہیں۔

شہر مل نکاح خواں اور گواہوں کے ہمراہ آچکا تھا، تھوڑی ہی دیر میں شہکاشہ ملک اور سلوئی کا نکاح پڑھا دیا
 گیا تھا۔

”ثناء تمہاری خواہش کا احترام ہو گیا ہے سلوئی کا نکاح آج کر دیا گیا ہے۔“ راجیل آفریدی نے ثناء کے
 ان میں جھک کر دھیرے سے کہا تھا، ثناء نے آنکھیں کھول کر دیکھا تھا۔

”سمیرا! ثناء نے بہت ہو لے سے بنا آواز کے ایک نام لیا تھا۔
 ”ہاں ہاں سمیرا ابھی تو ہمیں تھا تم سو رہی تھیں تا تو کافی دیر سے یہیں تمہارے پاس تھا۔“ راجیل آفریدی
 ثناء کا سر ہلایا تھا۔ ثناء نے مطمئن ہو کر واپس آنکھیں موندھ لی تھیں، راجیل آفریدی نے بغور ثناء کا چہرہ
 دیکھا تھا۔

”مبارک ہو، ماہ گل نکاح ہو گیا ہے۔“ آغا جان کے چہرے پر زمانے بھر کی خوشی پنہاں تھی، مسکراہٹ میں
 ان کوں سا تھا۔

”بس، ہم کچھ دیر میں ہی نکلنے والے ہیں۔“

”جی جی بالکل تیار اور استقبال شاندار ہونا چاہیے کہ لگے۔ میں آغا ملک کی بہو اور شہکاشہ ملک کی بہو آ رہی ہے کوئی کمی بیشی نہیں ہونی چاہیے۔“ شہزاد اور شہکاشہ سامنے بیٹھے آغا جان کو ہی دیکھ رہے تھے۔ شہکاشہ کے چہرے پر جس قدر بے زاریت، بے سکونی، الجھن تھی شہزاد کے چہرے پر اتنی ہی خوشی کے رنگ تھے۔

”آغا جان کتنے خوش ہیں نا بھائی۔“

”مجھے سمجھ میں نہیں آتا جس لڑکی سے اور اس کے پورے خاندان سے ہمیں آغا جان کو نفرت کرنی چاہیے۔“

”انتقام لینا چاہیے آغا جان انہیں ہی سر پر کیوں بٹھا رہے ہیں۔“ شہکاشہ ملک کے لبوں سے جھڑپتے لفظ کے کاٹوں کو شہزاد نے بہت چونک کے دیکھا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ بھائی۔“ شہکاشہ ملک نے شہزاد کو دیکھا اور کچھ سوچتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

”کچھ نہیں، جاؤ اور آغا جان سے پوچھو کہ یہ گھڑا کس قسم کرتا ہے۔“ وہ وہاں رکنا نہیں اور باہر کی جانب نکلتا چلا گیا تھا، شہزاد ملک نے بہت دور تک اس کی چوڑی پشت کو دیکھا تھا، سامنے سے آتی راجیل آفریدی کے ہمراہ سلوی پر نظر پڑی۔

”اتنی پیاری سی لڑکی کے ساتھ کوئی ظلم مت کرو بھائی۔“ شہزاد ملک نے دل میں سوچا تھا۔

”کیسی ہیں شہزاد بیٹی! آغا جان سلوی اور راجیل آفریدی کو اتنا دیکھ وہاں آئے تھے۔“

”بہتر ہیں، آغا جان، سلوی آپ کی امانت ہے آپ جب چاہیں اسے لے جاسکتے ہیں۔“

”اور اگر ہم کہیں کہ ہم سلوی بیٹی کو آغا جان سے لے جانا چاہتے ہیں۔“ آغا جان نے جاننا نظروں سے سلوی کو دیکھا تھا اور پھر راجیل آفریدی کو جو شاید بہت کچھ سوچ رہے تھے۔

”پھر میں کہوں گا کہ اس سے اچھی اور کوئی بات نہیں ہو سکتی۔“ راجیل آفریدی نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر بات کہی تھی۔

جب کہ سلوی ان کے دل کی حالت سے بے خبر حیران نظروں سے گزرتی تھی۔

”کتنی آسانی سے آپ مجھے الگ کر رہے ہیں ڈیڈی۔“ سلوی نے نہایت دکھ سے یہ بات سوچی تھی۔

”ٹھیک ہے ہم اپنی امانت لے کر جا رہے ہیں۔“ پتک جا رہے تھے۔ پتک جا رہے تھے۔ پتک جا رہے تھے۔

لبوس سلوی کو راجیل آفریدی نے آخری بار اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ سلوی تادیہ خود کو سمجھا نہیں سکی تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں سے اشک بہنے لگے تھے۔

”ڈیڈی!“ وہ تو زبان پر شکوہ بھی نہیں لاسکتی تھی۔

”میری جان تمہاری ماما کی بھی یہی خواہش ہے۔“ سلوی نے غمزدہ نظروں سے راجیل آفریدی کو دیکھا تھا۔

”ہی لہو میں اس کی زندگی یہ رخ بدل لے گی یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔“

”جاؤ انشاء اللہ تمہاری ماما جیسے ہی ٹھیک ہوں گی وہ ان حالات کو آپ کی شادی کو قبول کر لیں گی میں انہیں لاؤں گا تم سے ملاؤں گے۔“ آغا جان جو شہزاد سے کچھ کہہ رہے تھے بات ختم ہوتے ہی وہاں آئے تھے۔

”اب ہمیں اجازت دو راجیل آفریدی، ہمیں چلنا چاہیے۔“

”جی آغا جان۔“ راجیل آفریدی کی آنکھوں میں سی سی بھر گئی تھی۔ انہوں نے سلوی کی پیشانی پر ہوسہ لیا تھا۔

نیو ماڈل کی بجاو میں ڈرائیور کے ہمراہ گاڑی سڑک پر فرمائے بھرنے لگی تھی، فرنٹ سیٹ پر ڈرائیور اور شہزاد ملک براجمان تھے جب کہ بیک سیٹ پر آغا جان اور شہکاشہ ملک کے درمیان سڑکی سڑکی سی سلوی بیٹھی تھی،

”جی جی بالکل تیار اور استقبال شاندار ہونا چاہیے کہ لگے۔ میں آغا ملک کی بہو اور شہکاشہ ملک کی بہو آ رہی ہے کوئی کمی بیشی نہیں ہونی چاہیے۔“ شہزاد اور شہکاشہ سامنے بیٹھے آغا جان کو ہی دیکھ رہے تھے۔ شہکاشہ کے چہرے پر جس قدر بے زاریت، بے سکونی، الجھن تھی شہزاد کے چہرے پر اتنی ہی خوشی کے رنگ تھے۔

”آغا جان کتنے خوش ہیں نا بھائی۔“

”مجھے سمجھ میں نہیں آتا جس لڑکی سے اور اس کے پورے خاندان سے ہمیں آغا جان کو نفرت کرنی چاہیے۔“

”انتقام لینا چاہیے آغا جان انہیں ہی سر پر کیوں بٹھا رہے ہیں۔“ شہکاشہ ملک کے لبوں سے جھڑپتے لفظ کے کاٹوں کو شہزاد نے بہت چونک کے دیکھا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ بھائی۔“ شہکاشہ ملک نے شہزاد کو دیکھا اور کچھ سوچتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

”کچھ نہیں، جاؤ اور آغا جان سے پوچھو کہ یہ گھڑا کس قسم کرتا ہے۔“ وہ وہاں رکنا نہیں اور باہر کی جانب نکلتا چلا گیا تھا، شہزاد ملک نے بہت دور تک اس کی چوڑی پشت کو دیکھا تھا، سامنے سے آتی راجیل آفریدی کے ہمراہ سلوی پر نظر پڑی۔

”اتنی پیاری سی لڑکی کے ساتھ کوئی ظلم مت کرو بھائی۔“ شہزاد ملک نے دل میں سوچا تھا۔

”کیسی ہیں شہزاد بیٹی! آغا جان سلوی اور راجیل آفریدی کو اتنا دیکھ وہاں آئے تھے۔“

”بہتر ہیں، آغا جان، سلوی آپ کی امانت ہے آپ جب چاہیں اسے لے جاسکتے ہیں۔“

”اور اگر ہم کہیں کہ ہم سلوی بیٹی کو آغا جان سے لے جانا چاہتے ہیں۔“ آغا جان نے جاننا نظروں سے سلوی کو دیکھا تھا اور پھر راجیل آفریدی کو جو شاید بہت کچھ سوچ رہے تھے۔

”پھر میں کہوں گا کہ اس سے اچھی اور کوئی بات نہیں ہو سکتی۔“ راجیل آفریدی نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر بات کہی تھی۔

جب کہ سلوی ان کے دل کی حالت سے بے خبر حیران نظروں سے گزرتی تھی۔

”کتنی آسانی سے آپ مجھے الگ کر رہے ہیں ڈیڈی۔“ سلوی نے نہایت دکھ سے یہ بات سوچی تھی۔

”ٹھیک ہے ہم اپنی امانت لے کر جا رہے ہیں۔“ پتک جا رہے تھے۔ پتک جا رہے تھے۔ پتک جا رہے تھے۔

لبوس سلوی کو راجیل آفریدی نے آخری بار اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ سلوی تادیہ خود کو سمجھا نہیں سکی تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں سے اشک بہنے لگے تھے۔

”ڈیڈی!“ وہ تو زبان پر شکوہ بھی نہیں لاسکتی تھی۔

”میری جان تمہاری ماما کی بھی یہی خواہش ہے۔“ سلوی نے غمزدہ نظروں سے راجیل آفریدی کو دیکھا تھا۔

”ہی لہو میں اس کی زندگی یہ رخ بدل لے گی یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔“

”جاؤ انشاء اللہ تمہاری ماما جیسے ہی ٹھیک ہوں گی وہ ان حالات کو آپ کی شادی کو قبول کر لیں گی میں انہیں لاؤں گا تم سے ملاؤں گے۔“ آغا جان جو شہزاد سے کچھ کہہ رہے تھے بات ختم ہوتے ہی وہاں آئے تھے۔

”اب ہمیں اجازت دو راجیل آفریدی، ہمیں چلنا چاہیے۔“

”جی آغا جان۔“ راجیل آفریدی کی آنکھوں میں سی سی بھر گئی تھی۔ انہوں نے سلوی کی پیشانی پر ہوسہ لیا تھا۔

نیو ماڈل کی بجاو میں ڈرائیور کے ہمراہ گاڑی سڑک پر فرمائے بھرنے لگی تھی، فرنٹ سیٹ پر ڈرائیور اور شہزاد ملک براجمان تھے جب کہ بیک سیٹ پر آغا جان اور شہکاشہ ملک کے درمیان سڑکی سڑکی سی سلوی بیٹھی تھی،

کوئی جذبہ نہیں اٹھا رہا تھا۔

☆.....☆

ثناء وہ ابوں انجکشن اور ڈرپ کے زیر اثر بے خبر سو رہی تھیں، راجیل آفریدی نے ثناء کو ایک نظر دیکھا اور ڈاکٹر سے تھوڑی بہت بات چیت کر کے باہر نکل گئے تھے، انہیں گھر جانا تھا غنوی کو بھی تو سمجھانا تھا اس ناراضی ختم کرنی تھی جو پچھلے ایک ہفتے سے راجیل آفریدی سے ناراض ہے جو سلوی اور شیکہ کا شہ ملک کے نکاح کے لیے قطعی طور پر رضامند نہیں تھی، کیونکہ وہ انجان بھی تاجم بھی سچائی اور حقیقت سے بے خبر تھی، بائیس سال تک راز پر پردہ ڈالا ہوا تھا کہیں آج وہ راز غنوی پر آشکار نہ ہو جائے اور شاید حالات جو رخ اختیار کر چکے ہیں یہی ہے کہ غنوی کو سب کچھ جان لینا چاہیے آخر کب تک وہ چھپائیں گے اور شاید زندگی کی آخری سانس تک چھپائیں چلتا اگر مظہر عام پر آغا جان نہیں آجاتے اور انہوں نے اپنی امانت طلب نہ کر لی ہوتی۔

”صبح یہ ٹھیک طریقہ نہیں ہے تم صبر کرتے میں ایک کوشش اور کر لیتا ہو سکتا تھا کہ آغا جان مان جاتے۔“

”نہیں راجیل بھائی! مجھے معلوم ہے وہ لوگ بھی نہیں مانیں گے آغا جان کے فیصلے میں لچک آجائے قیامت تک نہیں ہونگے۔“ زریں گل نے روتے ہوئے کہا تھا۔

”اور اب کیا ہوگا؟“ ثناء نے اس بارے میں، غیرت کے نام پر ہتھیار نکل آئیں گے اس کا اور ان کے جنہیں۔ سلوی کی تکلیفیں تمہیں کی فضا ہو جائیں گی، نیست و نابود ہو جائیں گی، برباد ہو جائیں گی، تم لوگ نہیں جانتے تم لوگوں نے نکاح کے دو قبیلوں میں جنگ چھیڑ دی ہے۔“

”وہ سب میں کچھ نہیں جانتا، راجیل بھائی میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میں اور زریں گل ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے بغیر بھی نہیں رہ سکتے۔“ صبح آفریدی کے لب و لہجے سے بغاوت کی آہنی تھی اس کا انداز اس کا فیصلہ پختہ تھا اگلے صبح سے وہ لمحے بھر کے لیے نہ ہی ایک قدم پیچھے ہٹنے کو راضی تھا اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی سمجھوتا کرے گا۔

”تم لوگوں نے کس مشکل میں ڈال دیا ہے مجھے۔“ راجیل آفریدی کی آنکھوں کے منہ گئے تھے۔

”راجیل جو ہو گیا سو گیا، آگے کا کیا کرتا ہے کیا ہوگا؟“ ثناء نے ایک نظر زریں گل کو دیکھا تھا اور افسردہ سے کھڑے صبح کو۔

راجیل آفریدی نے پرسوج نظروں سے ثناء کو دیکھا تھا۔

”ایک ہی طریقہ ہے اب۔“

”وہ کیا؟“

”تم دونوں کے فون کہاں ہیں جلدی سے ان سے اپنی اپنی سم نکال کر توڑ دو۔“

”جی۔“ راجیل آفریدی کے کہنے پر صبح آفریدی اور زریں گل دونوں نے اپنی اپنی سمزفون سے سم نکال کر توڑ دیں۔

”جلدی سے گاڑی میں بیٹھو ہمیں بائے روڈ بھی ٹکنا ہے کوئٹہ کی حدود سے۔“

کوئی چار پانچ گھنٹے کے وقف سے وہ لوگ کراچی کی حدود میں داخل ہو گئے تھے۔ یہاں راجیل آفریدی دو سو گز کا ایک شاندار بنگلہ تھا جو انہوں نے بہت پہلے خریدا تھا مگر آج کام آتا تھا۔

ایک سال ہو گیا تھا ان لوگوں کو یہاں شفٹ ہوئے مگر اس ایک سال میں ایسا کچھ بھی سامنے نہیں آیا کہ ان

”اے کوئی نقصان پہنچے یا کوئی فون نہیں آیا تھا، زریں گل کی گود میں ایک پیاری سی خوب صورت سی بیٹی تھی۔ گلابی گلابی رنگت والی سلوی میں زریں گل اور صبح آفریدی کی جان بیدھی مگر ان دونوں نے اپنی پہلی بچی ثناء کی

”ثناء بھائی آپ نے میری اس موٹر پر مدد کی اس وقت اپنے گھر اور دل میں جگہ دی جب ہم پر بہت مشکل

”ثناء بھائی آپ نے ثناء کا ہاتھ تھاما تھا۔“

”مشق! بری بات میں نے کچھ نہیں کیا یہ تم لوگوں کی اٹوٹ محبت ہی ہے جو تم دونوں کو ایک دوسرے سے

”ثناء بھائی آپ نے زریں گل کے ہاتھ پر اپنا دوسرا ہاتھ دھر دیا تھا۔“

”ہم جانتے ہیں کہ ہماری بیٹی کی پرورش و تربیت آپ کے ہاتھ میں ہونے چاہیے۔“ صبح آفریدی مسکراتے

”اے زریں گل کو دیکھنے کے بعد ثناء کو دیکھنے لگا اور آگے بڑھ کر زریں گل کے برابر بیٹھ گیا تھا۔“

”اوکے۔“ ثناء خوش دلی سے مسکراتی اور کاٹ سے پیاری سی سلوی کو گود میں بھر لیا تھا، زریں گل نے صبح

”یہی کو مسکراتی آنکھوں سمیت دیکھتے ہوئے اپنا سر چاہت سے اس کے شانے پر دھر دیا تھا۔“ صبح آفریدی

”محبت سے اس کے بالوں میں اپنے لب رکھ دیتے تھے۔“

”صبح آفریدی اسی دوران اندر راجیل آفریدی داخل ہوئے تھے۔“

”جی راجیل بھائی!“ صبح آفریدی زریں گل کے پاس سے کھڑا ہو گیا تھا۔

”صبح امیری ڈاکٹر شہلا سے بات ہوئی ہے ٹی سارج کے کچھ پیپرز ہیں تم یوں کروان پر سائن کر دو پھر ہم

”جانتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“

”آپ لوگ پیپرز فائل کر لو میں جب تک سلوی کو پیدائشی ٹیکہ لگاوا دیتی ہوں۔“ ثناء گلابی گدے میں چھوٹی

”سلوی کو لیے وہاں چلی آئی تھی۔“

”یہ ٹھیک رہے گا تو ثناء پھر آپ یوں کریں کہ ٹیکہ لگا کر ڈاکٹر شہلا سے سیل لیجے گا تاکہ وہ مزید کوئی

”ان کی میڈیسن لکھ دیں۔“

”جی بہتر زریں میں بس پانچ منٹ میں آتی ہوں۔“ ثناء نے بیڈ پر نیم دراز لیٹی زریں گل کو کہا۔

”اوکے ثناء بھائی آئی ویٹ۔“

”وہ تینوں ایک ساتھ ہی باہر نکل گئے تھے ابھی ان کو گئے ایک منٹ ہی ہوا تھا کہ کسی نے نہایت ہی زوردار

انداز میں بغیر دستک دیئے دروازہ کھولا تھا، زریں گل جوان لوگوں کے جانے کے بعد آنکھیں موندھے لیٹی تھی اس زوردار آواز پر آنکھیں کھولیں اور سامنے کھڑے جس شخص پر نظر پڑی لمحے بھر کے لیے جیسے ہر شے اس کی

آنکھوں کے سامنے گھومتی محسوس ہوئی تھی۔

”شمشیر۔“ لیو سے صرف یہی نام ادا ہوا تھا۔

”میں دوسری بات نہیں کروں گا۔“ اور پھر شمشیر نے اپنی بلیک جیکٹ سے پستل نکالی اور اس پر داغ دی۔

”نکل کی دو گولیاں ایک اس کے سر پر اور دوسری اس کے دل کی جانب اتار دی تھی۔ زریں گل کو ایک سانس کے

بعد دوسرا سانس بھی نہیں آیا تھا۔ وہ وہیں دم توڑ چکی تھی۔

”صبح۔“

”ڈیڈی“ غنوی نے راجیل آفریدی کے ڈھے ہوئے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ راجیل آفریدی نے اپنی جیبی آنکھیں صاف کی تھیں۔

”تمہاری ماما سلوٹی سے بہت پیار کرتی ہیں تم سے زیادہ ہم جو چار سال تک بے اولاد رہے سلوٹی کے گود میں آنے کے بعد ہمیں تمہاری خوشی کی نوید ملی تھی۔“ راجیل آفریدی نے غنوی کے سر پر دست شفقت رکھا تھا۔ غنوی نے راجیل آفریدی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں عقیدت و احترام سے تھام کر ہاتھ کی پشت پر بوسہ لیا تھا۔ اسی اثناء میں ملازمہ چائے کی ٹرائی کھینچی لے آئی تھی، غنوی نے چائے اپنے اور راجیل آفریدی کے لیے بنائی تھی، اسے اپنے ڈیڈی اور سب سے زیادہ اپنی ماما کو سنبھالنا تھا ان کی ہمت بندھانی تھی کیونکہ وہ تو اس شادی سے قطعی ایسٹم تھے۔

”ڈیڈی یہ شمشیر کون تھا؟“ چائے کا خالی کپ غنوی نے واپس ٹرائی میں رکھا۔

”زریں گل کے بچپن کا سنگیتر، ان کے خاندان میں جب لڑکی کسی کے نام کی انگلی پہن لے تو چاہے لڑکا کسی وجہ سے مر جائے وہ لڑکی ساری عمر اسی کے نام پر ٹیسی رہتی ہے اور زریں گل تو شمشیر کی ماگ تھی اور اس کا خاندان بھلا کیسے ہر داشت کر لیتا کہ زریں گل کسی دوسرے لڑکے کے بارے میں سوچے بھی مگر یونیورسٹی میں ہی فصیح اور زریں گل کی دوستی ہوئی دوستی کب محبت اور عشق و جنون میں بدلی ان لوگوں کو یہ خبر نہیں ہوئی۔ میں گیا تھا کوئی آغا جان اور اس کے بھائی زرخان ملک سے زریں گل کا رشتہ لینے بیچ کے لیے، مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ ان کے ہاں غیر خاندان میں شادی کرنے کے بارے میں سوچنا بھی گناہ سمجھا جاتا ہے مگر میں مایوس ہی لوٹا میری کوئی تادیل ان لوگوں کو قائل نہیں کر سکی، تو مجبوراً فصیح اور زریں گل نے یہ انتہائی قدم اٹھا لیا تھا، میں جانتا تھا کہ وہ اپنی عزت و غیرت کے لیے کس قدر حساس ہیں، غیرت کے نام پر خاندان کے خاندان، نسلیں ختم کر دی جاتی ہیں تو پھر زریں گل اور فصیح کو کیسے بخش دیتے۔ وہ لوگ اپنی ناکامی پر بچھڑ گئے تھے۔ کسی بھوکے شیر کی طرح بوسو گھٹتے ہوئے ان لوگوں تک پہنچ ہی گئے اور چند ہی لمحوں میں چند ہی پل میں اس روئے زمین سے ان کا نام و نشان تک مٹا دیا تھا۔ ان لوگوں کو پتا چل گیا تھا کہ اس دن زریں گل کے ہاں کسی نومولود بچے نے جنم لیا ہے وہ تو اس معصوم جان کے بھی خون کے پیاسے تھے۔

”تو وہ مردہ بچی.....“ غنوی کے دل و دماغ میں یہ سوال گردش کرنے لگا تھا۔

”جس وقت شمشیر زریں گل کو مار کے نکل رہا تھا گولی کی آوازیں کر میں اور ثناء تیزی سے زریں گل کے روم میں بھاگے تھے مگر جب تک وہ دم توڑ چکی تھی۔

”زریں گل۔“ پیچھے مڑ کے دیکھا تو آغا جان اپنے ملازم کے ہمراہ وہاں اندر داخل ہوئے تھے، اپنی لاڈلی بیٹی کی خون میں لت پت لاش دیکھ کر وہ بھی رو دیے تھے۔

”بہت سمجھا زرخان کو شمشیر کو گریہ جو ان خون کا اہال تھا، بدلہ لیے بغیر ٹھنڈا ہونے والا نہیں انتقام کی آگ نے دونوں کو اندھا کر دیا تھا میری بچی، میں تمہاری حفاظت نہیں کر سکا۔ یہ دشمنی ختم نہیں کر سکا اس بھڑکی ہوئی آگ کو نہیں بچا سکا جس کے دیکھتے ہوئے انگاروں کی لپیٹ نے تمہیں تمہاری خوشیوں کو گل لیا، مجھے معاف کر دو۔“ آغا جان نے زریں گل کا خون میں بھیگا چہرہ ہاتھوں میں لیا تھا۔

”مگر میرا تم سے وعدہ ہے تمہاری اولاد کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔“ آغا جان اٹھے اور یاس ہی کھڑے راجیل آفریدی کے پاس چلتے ہوئے آنکھیں پونے تھے اور ان کے پیچھے دیکھی سہمی ڈری سی شاد کو دیکھنے لگے اس کی

زرخان ملک شیر کی طرح زور سے دھاڑا تھا۔ فصیح آفریدی جو دستخط کر کے نکل رہا تھا پیچھے پلٹ کر دیکھ کر زرخان ملک پہل تانے کھڑا تھا، فصیح آفریدی نے لمحہ بھی نہیں لگایا تھا اپنی جیکٹ سے پہل نکالنے میں وہ اس چیز کو اپنے ساتھ رکھتا تھا کہ جانے کب ضرورت پڑ جائے اور آج اس کی ضرورت پڑی گئی۔

”جھے کیا لگا تو مجھ سے چپ جائے گا اسے اگر پاتال میں ٹھس جاتا تو وہاں سے بھی گھسیٹ کے آتا۔“ زرخان ملک کے لہجے میں اڑھوں جیسی زہریلی پھکڑ تھی تو کم دیکتے انگاروں کے شعلے فصیح آفریدی وجود سے بھی نہیں پھوٹ رہے تھے، اس بار گھر برابر کی تھی، زرخان ملک کا بے پناہ غصہ اور فصیح آفریدی کا جذبہ انداز، آج کیا ہونے والا ہے یہ سب جانتے تھے۔

”ارخان ملک میں اس تھکے کو آج ختم ہی کر دوں گا زریں گل کا ڈر خوف آج بالکل ختم ہو جائے گا۔“

”زریں گل کا ڈر خوف ہی نہیں آج وہ خود بھی ختم ہو جائے گی اس نے ہمارے خاندان کی عزت و غیرت خاک میں ملائی ہے، اس کا خمیازہ تو بھگتنا ہی ہے مرنے تو وہ اسی دن کی تھی جس دن اس نے حویلی سے قدم باہر نکالا آج تو بس قبر میں اس کو اتارنا تھا۔“ نفرت کی چنگاریاں ہر شے بھسم کرنے کو تھیں۔

”خبردار زرخان ملک جو زریں گل کا بال بھی پاؤں کا ہوا۔“ وہ زور سے چیخا تھا۔

”ہونہ۔“ اور پھر ایک گولی پہل سے نکلی اور فصیح آفریدی کا بازو پھیرتی ہوئی نکلتی چلی گئی تھی، جوش و جذبہ بارے جب برابر کا تھا، غصہ و غضب، جب عروج پر تھا تو دونوں کو کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

ایک گولی زرخان ملک کی جانب سے نکلی تو دوسری فصیح آفریدی کی پہل سے نکلی اور سیدھا اس کا سینہ پھا گئی، خون کا فوارہ ابل پڑا تھا۔ اسپتال میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا، ہر شخص کو نے کھدرے میں چھپے اس خون آشام منظر کو تک رہا تھا۔

”فصیح آفریدی۔“ پیچھے سے شمشیر کی چنگھاڑی گولی نے وہاں کے ماحول کو مزید سہا دیا تھا۔

اور اس سے پہلے کہ فصیح آفریدی کوئی کارروائی کرنا شمشیر نے اپنی گن میں سے سارا لوہا فصیح آفریدی کے جسم میں اندھیل دیا تھا، وہ وہیں ڈھیر ہو گیا تھا ختم ہو گیا تھا۔

”میں تیری نسل تک ختم کر دوں گا۔“ شمشیر نے بری طرح فرش پر پڑے لوہا فصیح آفریدی کو گھورا تھا۔

”کہاں ہے اس کی بیٹی آج ہی پیدا ہوئی ہے آج ہی مرے گی۔“

”سائیں یہ رہی مگر یہ تو مردہ پیدا ہوئی ہے۔“ آغا جان کے ملازم اس مردہ بچی کو دیکھنے چلے آئے تھے۔

”ہونہ۔“ شمشیر نفرت سے ہنکا رہا تھا۔

”اچھا ہوا مری ہوئی پیدا ہوئی ہے ورنہ.....“

”زرخان۔“ آغا جان تیزی سے بھاگتے ہوئے آئے تھے۔

گولی زرخان کے سینے پر لگی تھی، اس لیے وہ تادیر ہمت نہیں کر سکا اور چند سانسون کے بعد ہی دم توڑ دیا تھا۔ چند ہی گھنٹوں میں بہت سی یمنی جانیں موت کے گھاٹ اتار چکی تھیں، اپنا نام و نشان اپنی بچپان کو بچلی تھیں۔

☆.....☆

راجیل آفریدی کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں، اپنی بقی زندگی کا ایک ایک اوراق آج انہوں نے غنوی کے آگے کھول دیا تھا۔ ماضی کے درجوں میں جھانکتے ہوئے خود غنوی کا چہرہ بھی اشکوں سے بھیگ گیا تھا۔ اتنا غم اتنی تکلیف درد چھپایا ہے اس کے ماما ڈیڈی نے اس کا دل جیسے شدت غم سے پشما جا رہا تھا۔

گود میں گلابی کپڑے میں اس چھوٹی سی معصوم بچی کو دیکھنے لگے جس میں انہیں اپنی زریں گل کی شبیہ نظر آنے لگی تھی۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کے ثناء سے اس معصوم سی جان کو لے لیا تھا۔

”پلیز آغا جان! اس کو ہم سے الگ مت کریں میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔“ راجیل آفریدی نے اپنے دونوں ہاتھ آغا جان کے آگے جوڑ دیئے تھے۔ آغا جان نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اس معصوم پری کو دیکھا جو حالات سے بے خبر ہے مگر ہر کو پر سکون نیند سو رہی تھی جسے یہ نہیں معلوم کہ اس کی ماں مر چکی تھی جس کا باپ اسے دنیا میں چھوڑ کے جا رہا تھا۔

”آغا جان!“

ثناء کی تڑپتی آواز پر آغا جان نے ثناء کو دیکھا اور پھر اس بچی کے ماتھے پر پیار کر کے واپس ثناء کی گود میں ڈال دیا تھا۔

”یہ لو، ہماری زریں گل کی پرچھائی ہے اور ہم اپنی بچی پر برا سا یہ نہیں ڈالنے دیں گے۔ زریں گل کی تو حفاظت نہیں کر سکے مگر اپنی نواسی کو کچھ نہیں ہونے دیں گے۔ راجیل آفریدی آج سے اس بچی کی ذمہ داری ہم تمہیں سونپتے ہیں یہ تمہارے پاس ہماری امانت ہے۔ بہت جلد انشاء اللہ ہم اپنی امانت تم سے واپس لے لیں گے۔“ آغا جان نے نظر پھر کے اس معصوم سی بچی کو دیکھا۔

”اور ایک بات کا خیال رکھنا اس بچی کی ولدیت کے خانے میں فصیح آفریدی نہیں راجیل آفریدی کا نام ہونا چاہیے ہم نہیں چاہتے کہ وہ لوگ فصیح آفریدی کے نام تک بھی پہنچیں۔“

”جی آغا جان!“ راجیل آفریدی خوش ہو کر نام تم کرے کچھ نہیں جانتا تھا۔

”دین محمد۔“ آغا جان نے اپنے خاص وفادار ملازم کو پکارا جو پیچھے سر جھکائے دونوں ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

آغا جان کے پکارنے پر تیزی سے آیا۔

”صحنہ سائیں!“

”جاؤ جلدی سے ایک مردہ بچی کا انتظام کرو۔“

”جی سائیں۔“

”اور پھر شمشیر کو وہ مردہ بچی دیکھا کر ثابت کر دیا کہ فصیح اور زریں گل کی بیٹی بھی مردہ پیدا ہوئی ہے۔“ غنوی نے بغور اپنے باپ کی آنکھوں میں دیکھا تھا، جہاں بھائی کی جدائی کے گزرے دنوں کی یادیں تھیں۔

”اسی لیے تمہاری ماما چاہتی تھیں کہ ان کی بیٹی کے بیٹے سمیر سے سلوی کی شادی جلد از جلد ہو جائے تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے محفوظ رہے اسے آغا جان یہاں سے لے کر نہ جائیں مگر اچانک ہی ہارٹ اٹیک نے ان کو اسپتال پہنچا دیا۔ جس دن ثناء کو اسپتال میں ایڈمٹ کیا اسی دن اسپتال میں آغا جان سے ملاقات ہوئی وہاں وہ اپنے کسی دوست کو دیکھنے آئے تھے اور ہم سے ٹکرا گئے۔“

”ڈیڈی کیا سلوی جانتی ہے اپنی اس حقیقت کے بارے میں۔“

”ہم نے ضروری نہیں سمجھا کہ سلوی کو اس حقیقت کے بارے میں آگاہ کیا جائے۔“

غنوی کی نظروں میں سلوی کا چہرہ گھوم گیا تھا۔ یہ حقیقت یہ سچائی جس قدر خوش آئند تھی اتنی ہی کڑوی اور تکلیف دہ بھی تھی، وہ دونوں سگی بہنیں نہ سہی مگر سگی بہنوں سے کم بھی نہیں تھیں۔ سلوی اس کے چچا کی بیٹی تھی، یہ بہت اچھی اور خوشی کی بات تھی مگر وہ ساتھ ہی اب شہکاشہ ملک کی بیوی بھی تھی یہ تکلیف دہ بات تھی۔ وہ شہکاشہ

ملک جو آغا جان کے ساتھ راجیل آفریدی کے ہمراہ ان کے گھر پہلی بار آیا تھا۔ غنوی اور سلوی ڈرائنگ روم میں آئیں، دونوں نے آغا جان کو سلام کیا تھا۔

”ولیکم السلام جیتی رہو خوش رہو۔“ آغا جان نے دونوں کو خوش دلی سے جواب دیا اور دونوں کے سروں پر ہاتھ رکھا مگر سلوی کو اپنے سینے سے لگا کر اس کے سر پر بوسہ لیا تھا۔ اتنی انجیل ٹریسٹ غنوی کی سمجھ سے باہر تھی۔

”یہ شہکاشہ ہے ہمارا بڑا پوتا۔“ آغا جان نے سنجمل صوفے پر مغرورانہ اور شاہانہ انداز میں براہمان شہکاشہ ملک سے تعارف کرایا تھا۔ شہکاشہ ملک کے چہرے سے ہی نہیں اس کے ہر برادرانہ سے غرور چمک رہا تھا، صاف لگ رہا تھا کہ وہ وہاں زبردستی بیٹھا ہے۔

غنوی کو تو وہ بندہ ایک آنکھ نہ بھایا تھا، جس کا اظہار اس نے اکیلے میں سلوی سے کر دیا تھا۔

”چھوڑو ہمیں کون سی اس سے رشتے داری جوڑنی ہے۔“ سلوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تو اور کیا کلف لگا ہوا، اکثر تو دیکھو جیسے ایک کائنات کا بادشاہ ہو، کچھ سخت زہر لگ رہا تھا۔“ غنوی دل کھول کر اپنا غصہ اپنے دل کے پھپھو لے پھوڑ رہی تھی۔

”پاگل ہوئی ہے ہم بلاؤ کامت اپنا خون جلاؤ۔“ سلوی جانتی تھی غنوی کی طبیعت اور مزاج کو۔

”خون کیوں نہ جلاؤں تمہاری دیکھو میں نے سلام کیا جواب تک دینا ضروری نہیں سمجھا جیسے خدا نخواستہ ہم نے اس کی جائیداد چرائی ہو۔“

مگر خون کیا خشک ہوتا اس خون میں لہاں لو اس وقت اٹھا جب راجیل آفریدی نے خبر سنائی کہ آج شام تمہارا انکاشہ ملک سے ہے۔

”سلوی! انہیں منع کر دو صاف انکار کر دو تم حامی نہیں بھر گئی۔“ مگر غنوی کی نہیں سنی گئی بلکہ دونوں بہنوں میں ناراضی بھی ہو گئی تھی۔

سلوی کی غیر موجودگی بہت محسوس ہو رہی تھی بہت شدت سے یاد آ رہی تھی اس کی مگر اچانک وقت نے ایسا پلٹا کھایا کہ سلوی اتنی دور اسی اکڑ و کلف لگے شخص کے ساتھ کونسلہ چلی گئی تھی۔

☆.....☆

حویلی آگئی تھی، سورج الوداع کہہ چکا تھا مگر حویلی کو دہن کی طرح سجایا گیا تھا اس کی چھائیوں پر روشنی دور دور تک ہر شے پر پھیلی ہوئی تھی، ڈھول بجانے والے اس خوشی کو اپنے نزلے انداز میں پیش کر رہے تھے، رقص ہو رہا تھا شادیانے پر پشتو گیت گائے جا رہے تھے۔ گو کہ ہر شے بھللا رہی تھی اور کیوں نہ ہو حویلی کے بڑے بیٹے سردار شہکاشہ ملک کی شادی تھی، وہ کونسلہ اپنی بیوی لے کر آیا تھا، ہر بڑا بچہ خوشیاں مناتا تھا تجوروں کے منہ کھول دیئے گئے تھے، انواع قسم کے کھانے بنائے جا رہے تھے جس میں ان کی روایتی ڈش مشن کی کچی بھنی جا رہی تھی۔

بڑی سی بچا رو رک چکی تھی، جس میں سے سب سے پہلے شہکاشہ ملک ہی اتر اٹھا، دوسری سائیڈ سے آغا جان اترے مگر سلوی کو ابھی اترنے کے لیے منع کر دیا تھا۔ شہریل ملک مسکراتا ہوا نیچے اتر ا۔

”مجھے تو ڈر تھا بھایا کہ آپ چلتی ہوئی گاڑی سے چھلانگ نہ لگا دیں۔“

”کیا مطلب؟“ شہکاشہ ملک نے ناچھی میں اس کو دیکھا تھا۔

”کیونکہ جو اسپید آپ نے ابھی دکھائی ہے خدا نخواستہ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔“ شہریل ملک نے

مسکراتے ہوئے چھیڑا تھا۔

”بھایا۔“ وہ ذرا سا شہکشا ملک کی جانب جھکا تھا اور ہولے سے سرگوشی کی۔

”کو۔“ شہکشا ملک کو ایک آنکھ نہیں بھار ہا تھا شہنشاہ ملک کا چھیڑنا۔

”سلوٹی بھابی کیسی ہیں، اچھی ہیں نا۔“ خود ہی سوال کیا اور خود ہی جواب دیا تھا۔

”پورے رستے تمہاری بک بک برداشت کی ہے لیکن اب گر کوئی فضول گوئی کی تو یاد رکھنا اس مٹن بھی کی جگہ تم ہو گے۔“ شہکشا ملک کے چہرے پر غصے کی لالی دوڑی ہوئی تھی۔

”حد ہے آج تو تھوڑا رو مینک موڈ بنالیں۔“ وہ شرارت سے مسکرایا تھا۔

”تم ایسے باز نہیں آؤ گے روکو۔“ اور اس سے پہلے کہ شہکشا ملک اس کو گردن سے پکڑتا وہ نودو گیا رہ گیا تھا۔

”کہاں سے میری شہکشا کی دلہن۔“ بے بے گل اپنی ملازموں کے ساتھ وہاں آئی تھیں۔

شہکشا ملک کو وہاں مزید شہرناؤں بھر لگ رہا تھا، اس لیے وہ وہاں سے نکلتا چلا گیا تھا۔

بے بے گل سے تو اپنی بے پناہ خوشی سنہائے نہیں سنبھل رہی تھی۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کیا کچھ نہ کر دیں دنیا جہاں کی ہر خوشی سلوٹی کے قدموں میں ڈھیر کر دیں۔

”دھیرن میراں گل دھیرن۔“ آغا جان سمجھتے تھے ان کی خوشی کو ان کی بوڑھی آنکھوں میں جو پھوٹی رہتی تھی حویلی کے قوتوں کی روشنی بھی ماسٹر چر رہی تھی۔

”آغا صاحب اور کتنا صبر کروا نہیں گئے یہاں سے یہ آنکھیں پیاسی ہیں ترس رہی ہیں اپنی زیریں گل کی نشانی کو دیکھنے کے لیے۔“ ان کے ہر انداز سے بے پناہ بے صبری بے فراری ٹپک رہی تھی۔

”شش۔۔۔۔۔ آغا جان نے جلدی سے ان کے کتے بول رہا تھا رکھ دیئے تھے۔“

”آپ کو منع کیا تھا نا۔“

”معاف کر دیں آغا صاحب غلطی ہوئی مگر کیا کروں دل کھل نہیں رہا خوشی باتھوں سے نکلی جا رہی ہے۔“ آغا جان ہولے سے مسکرا دیئے تھے وہ اچھی طرح سمجھ سکتے تھے اور پھر مزید ان کا امتحان نہ لینے ہوئے گاڑی کی پچھلی سائیڈ کا دروازہ کھولا تھا۔

”آئیے سلوٹی بیٹی۔“ آغا جان نے ہاتھ آگے بڑھایا تھا، سلوٹی نے ان کو دیکھا اور پھر ان کا بڑھا ہوا ہاتھ اور پھر جھپکتے ہوئے ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

آغا جان کا ہاتھ تھامے وہ گاڑی سے باہر نکلی تھی۔

”ماشاء اللہ چشم بدور، نظر کا نور۔“ بے بے جان نے فوراً سے اسے اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

ایسی ٹھنڈک ایسا سکون جیسے سلوٹی کو نہیں اپنی لاڈلی زیریں گل کو اپنے سے سے لگا لیا ہو۔ وہی پر چھائی وہی خوشبو بالکل ہو بسواس جیسی۔ بے بے گل نے اس کو خود سے الگ کرنے کے بعد اپنی پتیلیوں میں اس کا سندس سا چہرہ بھر لیا تھا۔ سلوٹی کو جانے کیوں ان خاتون سے گلے لگ کر الگ سکون کچھ الگ ہی سرور سا ملتا تھا۔ دل جیسے بہت پرسکون ہو گیا ہو، ان کے نورانی چہرے میں اس کو ہلکی سی اپنی شبیہ محسوس ہوئی تھی۔ ان خاتون کی بڑی بڑی سرمنی آنکھیں بالکل اس کی جیسی تھیں، صاف شفاف سفید رنگ جس پر ہلکی سی جھریاں ضرور تھیں مگر پھر بھی الگ ہی نور تھا۔ الگ ہی اس چہرے سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ جیسے سلوٹی بنا پلک جھپکائے بس تنکے ہی جا رہی تھی۔

ہائے کیوں وہ اس نورانی چہرے کو اپنی آنکھوں میں بسا کر دل میں اتارنا چاہتی تھی، کیا خاص وجہ ہے کیا راز ہے

”سب سے بے خبر انجان بس تک تنکے ہی جا رہی تھی۔“

”لاؤ بھی جلدی سے کالے بکرے لے آؤ۔“ ملازمہ چارکالے کالے بکرے لے آئی۔

”چلو میری بیٹی ان پر ہاتھ رکھو یہ سب صدقے کے ہیں۔“

”جی۔“ سلوٹی ان مونے ٹنگڑے کالے بکروں سے ہمہ گئی تھی اس کا سہنا آغا جان محسوس کر چکے تھے اس لیے وہ آگے بڑھے اور اس کو اپنے سے لگا کر تھوڑا آگے بڑھے۔

”کچھ نہیں ہوگا میری بچی تم بس ان پر اپنا ہاتھ رکھ دو۔“ اور پھر سلوٹی کا ہاتھ پکڑ کے آغا جان نے باری باری پیروں بکروں کے سر پر ہاتھ پھیرا دیا تھا۔

”لاؤ بھی اب اپنی بیٹی کی نظر بھی اتاریں گے۔“ اور پھر تین چار ملازماں میں تھالی لیے چلی آئیں جن میں پیسے پکڑے وغیرہ تھے۔

”جاؤ یہ سب کچھ غریبوں میں تقسیم کر دو۔“

”آؤ میری بچی۔“

”ماہ رخ، لالہ جان، رانی گل، شمالہ، کہاں ہو تم سب چلو جلدی آ جاؤ۔“ بے بے گل نے اپنے سب رشتے داروں کے نام لیے جو لمبے بھر میں حاضر ہو چکی تھیں۔

”چلو بھی ہمارے شہکشا کی دلہن کو خوب جاسنوار دو۔“

”جی بے بے گل۔“ ساری کھلکھلائی ہوئی ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتی شرارتی جملے کئی آگے

”ہیں اور سلوٹی کو تھام لیا۔“

”آئیے دلہن!“ اور پھر ایک گھنٹے میں سلوٹی کو پیر کے ناخن سے سر کے بال تک پورا سجا دیا جس نے دیکھا شش عش کر اٹھا کوئی ایسا شخص نہیں جس نے سلوٹی کی تعریف نہ کی ہو، نہ ناگوار نہ پورن الگ الگ تھا جہاں بیو تین تھیں کوئی مرد نہیں آ سکتا تھا، اس لیے سب نے اپنے اپنے انداز میں خوش ہو کے خوشی کا اظہار کیا تھا۔

”ارے کوئی شہکشا کو بھی تو بلا کے لاؤ۔“ ایک خاتون نے شرارت سے دلہن کی سلوٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں ہاں شہکشا کو بلاؤ کب تک دلہن کیلی بیٹھی رہے گی۔“

”کسی کو کوئی رحمت یا تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے دولہا میاں آپ لوگوں کی عدالت میں حاضر

ندمت ہیں۔“ شہنشاہ ملک نے شہکشا کی چوڑی کلائی تھام رکھی تھی۔

”بڑی مشکل سے نوٹے میاں ہاتھ لگے ہیں جیسے ان کی نہیں کسی اور کی شادی میں شرکت کرنے آئیں ہوں۔“

”یہ آپ نے بالکل ٹھیک کام کیا۔“ ایک لڑکی بولی جو شہنشاہ ملک کی رشتے میں کزن تھی لالہ رخ۔

”ارے جناب ہم تو اس سے بڑے بڑے کام کر سکتے ہیں بشرطیکہ آپ کا تعاون درکار ہو۔“ شہنشاہ ملک نے پھر شوخی سے لالہ رخ کو دیکھا تھا۔

”مگر مجھے آپ کا کوئی تعاون نہیں چاہیے مسٹر شہنشاہ ملک۔“ وہ دودھ بولی تھی۔

”چلو تم نہ سہی کوئی اور سہی۔“ محفل گویا زعفران بن گئی تھی۔

”بہت ہی بے شرم ہے یہ لڑکا تو۔“ دور پرے کی ایک بوڑھی خاتون مسکراتے ہوئے بولیں۔

Poora Pakistan Raha Hai Bol Hashmi Ispaghool



• ہائید ہاشمی اسپغول
• ۱۰۰ فی فائبر کا استعمال رکھ
• معدے کو صاف
• بلڈ شوگر کا لیول برقرار
• کولیسٹرول کو کم اور دل کو صحت مند
• قبض سے دور اور نظام ہضم کو درست

Daily Lo Fit Raha

www.hashmisurma.com Hashmi Since 1971

”ارے آئی جان! اگر شرم کے پردے لے کر بیٹھا رہا تو بڑھ گئی میری نسل آگے اور مجھے تو کم از کم ایک نو تیار کرنی ہے۔“ چپکلے پر چپکلے چھوڑتا شہزیل ملک ان خاتون کے گلے میں بازو دراز کر گیا تھا۔

”ارے پرے ہو، ساری شرم لحاظ بھول گئے ہو۔“ وہ خاتون تو جھجکتی ہوئی اپنے شانے سے اس کا بازو نکال کر بے جان کے پاس آ بیٹھی تھیں۔ شہزیل ملک زور سے ہنس دیا تھا۔

”ارے آئی جان آپ تو یوں شرمگاہی ہیں جیسے خدا نخواستہ آپ سے تعاون مانگ رہا ہوں۔“ ہنسی کا جو فوارہ پھوٹا سو پھوٹا مگر آئی جان کی چپل ضرور شہزیل ملک کی خیر سگالی کر گئی تھی۔ شہکاشہ ملک بھی ہولے سے مسکرا دیا تھا۔ اور آپ یونہی دور کھڑے کھڑے مسکرائیں گے یہاں آئیں اور اپنی دلہن کے پاس بیٹھ کر مسکرائیں۔ شہزیل ملک نے شہکاشہ ملک کو پکڑ کر ایک جھٹکے سے سلوٹی کے برابر میں بیٹھا دیا تھا۔ شہکاشہ ملک کے اس طرح بیٹھنے سے اس کا چوڑا کسرتی شانہ سلوٹی کے نازک شانے سے ٹکرایا تھا۔

”تمہیں بھی تمیز نہیں آئے گی۔“ شہکاشہ ملک کے عنابی لبوں سے مسکراہٹ ایسے غائب ہوئی جیسے دودھ میں سے مکھی، سلوٹی کی موجودگی محسوس کر کے اس کے شریانوں میں لاوا سا دوڑا گئی تھیں جب کہ اس کے مقابل سلوٹی کا دل جیسے ابھی چلیوں کی دیوار توڑ کے باہر آ جائے گا۔ اسے سی کی اس ٹھنڈے روم میں اس کی ہتھیلیاں بھیگ گئی تھیں۔

”چلو رسم کرنا شروع کرو۔“ غائب نے باری باری منہ دکھائی دی تھی، بہت سی دعاؤں کے ساتھ، کچھ لاشرت بھرے جملے بھی کہتی نکلتی تھیں تو سلوٹی شرم سے پانی پانی ہو جاتی اس کا سر مزید جھک جاتا شرم وحیا سے۔

”میری کیا مجال جو میں انہیں کچھ دوں؟ وہیں کی وہیں۔“

”شرم تو آ رہی نہیں منہ پھاڑ کے مانگتے ہوئے یہ بڑا منہ کھنکھناتی ہے جھنڈے گاڑھے ہوئے ہیں۔“

”چلو شہزیل ملک کبجوں بھی مگر بھائیتم کبجی منہ دکھانا کم از کم کبجی سات بچوں کا چاچو ضرور بنانا سبھے، ہے نا لالہ رخ۔“ اس نے شوخی و شرارت سے مسکراتے ہوئے لالہ رخ کو نگاہوں سے گھرا دیا تھا۔

لالہ رخ کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا، اس کا وہاں سے ہٹ جانا ہی بہتر تھا، شہزیل ملک ہار ماننے والوں میں سے قطعی نہیں تھا۔

”بہت ہنسی مذاق ہو گیا چلو اب دلہن کو آرام کرنے دو۔“ بے بے جان کو احساس ہوا کہ سلوٹی بہت تھک گئی ہے۔

”ہاں اگل چلو بھائی! آخری رسم کو پایہ تکمیل تک پہنچاؤ۔“ شہزیل ملک کو بھی سلوٹی کی تحسُن کا احساس جاگا تھا۔

”کون سی آخری رسم۔“ شہکاشہ ملک کو انہی فضول رسوں نے چڑا دیا تھا۔

”یہی کہ آپ اپنے کسرتی بازوؤں میں سلوٹی بھائی کو اٹھا کے روم تک لے کر جائیں گے۔“ شوخی سے مسکراتے ہوئے اپنے چڑے بھایا کو دیکھا۔

”واٹ یہ کیا بکواس ہے۔“ وہ تو بیچ معنوں میں سلگ کر رہ گیا۔

”یہ کوئی بکواس نہیں میری جان ہمارے خاندان کی رسم ہے۔“ بے بے جان اپنے بازو میں لیے سلوٹی کو اس کے مقابل لائیں۔

”میں نہیں مانتا ایسی کوئی خاندانی رسم کو۔“

”نہیں بیٹا ایسا نہیں بولتے بدشگونی ہوتی ہے۔“ بے بے جان نے اس کے عنابی لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔
 ”اف..... اوہ شہکاشہ بھایا! آپ بھی کس قدر شرم رہے ہیں کچھ سبق اپنے بے شرم بھائی سے ہی سیکھ لیتے۔“ لالہ درخ نے اپنا پچھلا حساب چلتا کرنا چاہا۔
 ”مورے پر تو تم کیلا وجہ ہی ڈپینڈ کر رہی ہو بھایا کی شادی میں رسم اگر چھوٹے بھائی کو کسی لڑکی کو گود میں اٹھانے کی رسم ہوئی تو قسم سے سب سے پہلے ابھی تم ہی میرے بازوؤں میں ہوتیں۔“ سانسے بھی کوئی معمولی شخص نہیں تھا۔ شہزیل ملک تھا، لالہ درخ بری طرح گھور کے رہ گئی باقی سب کی دنی دنی ہنسی لگی تھی۔
 ”اور تمہیں میں اپنے بازوؤں میں بٹھا کر لے چلتا ہوں۔“ حرب نے شہزیل ملک کا کان زور سے پکڑ لیا تھا۔

”ارے باپ رے باپ مورے آپ۔“ شہزیل ملک کی لگی بندھ گئی تھی۔
 ”کتنی دیر سے سن رہا ہوں کب سے میری نیلگ کو تنگ کیے جا رہا ہے اب ذرا مجھ سے بھی دودھ ہاتھ ہو جائے۔“
 ”وہ تو میں مذاق کر رہا تھا ہے نارخ بھائی۔“ اس نے لالہ درخ کی جانب دیکھ کر تصدیق چاہی تھی مگر لالہ درخ سمیت سب زور زور سے ہنس دیتے تھے۔
 ”ہمارا خیال ہے تمہاری ٹھیک ٹھاک وراثت جتنی چاہیے۔“
 ”یاریہ کیا بات ہوئی شہکاشہ بھایا پچھائیں نا مجھے اس جن سے۔“
 ”حرب! میری فل سپورٹ تمہارے ساتھ کئے۔“ شہکاشہ ملک نے ہری جھنڈی دکھا دی تھی۔
 شہزیل ملک نے حرب سے اپنا کان چھڑایا اور تیزی سے بھاگا کیونکہ وہ جانتا تھا حرب کے ہاتھ لگنے کا مطلب واقعی اپنی شامت بلانا تھا۔ حرب اور لالہ درخ بھی اس کو پکڑنے اس کے پیچھے بھاگے تھے۔
 ”ان لوگوں کی یہ مستیاں تو رات گئے تک چلتی رہیں گم صلوئی کو بند و دم میں لے چلو۔“ بے بے جان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بے بے جان اس کے دونوں پاؤں صحیح سلامت تو ہیں۔“
 ”بس اب کوئی بحث نہیں۔“ ان کے لب دلیچے میں معمولی سی ختی آگئی تھی۔ اس لیے ہار مانتے ہوئے دلہن کے لباس میں متیداس نازک سے وجود کو اپنے کسری بازوؤں میں بھر لیا تھا۔
 ”اوہ..... اوہ.....“ شرارت بھرے نعروں پر اس نے کوئی کان نہ دھرے۔ ہاں چہرے پر زمانے بھر کی سختی کرنٹکی ضرورت تھی جو کوئی نہیں دیکھ سکا تھا۔

سب اپنا اپنا مذاق ضرور کر رہے تھے۔ شہکاشہ ملک کے حوالے سے اسے چھبڑ بھی رہے تھے مگر اس بات سے بے خبر کہ صلوئی کے دل کی حالت زیر و بم ہے ایک تلاطم ایک طوفان پر تھا اس کے دل میں، آندھی و تباہی کے جھکوں میں تھا اس کا وجود، شہکاشہ ملک اس کو نہایت ہی کوئی سخت جاگیر دار لگا تھا اس کو، وہ بھلا اسکے میں کیسے سامنا کرے گی۔ بیڈروم تک آنے تک وہ اپنے عقل و خرد کھوتی چلی گئی تھی، آنکھیں بند ہوتی چلی گئی تھیں۔ ذہن کی اسکرین پر ایک سیاہ پردہ چھا گیا تھا اور وہ بے حس بے درد بنا صلوئی کو یونی بیڈ پر ڈالے منہ پھیر کر وائش روم میں چلا گیا تھا۔

☆.....☆

”کشمالہ میری بچی صبر کر۔“ رانی گل اس بھری ہوئی شیرنی کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی مگر وہ کسی بنا پانی کی پتلی کی طرح اس کے ہاتھ سے لگی جا رہی تھی۔

”نہیں ہوتا صبر مجھ سے، شہکاشہ پر صرف اور صرف میرا حق ہے وہ میرا ہے تیس سال میں نے اس کا شدت انتظار کیا ہے کہ اب میں اس کی دلہن بنوں گی اس حویلی کی بڑی بہو ہوں گی مالک بنوں گی ایک سردار کی بیوی بنوں گی اور یہ حق مجھ سے چھین کر کسی اور کی جھولی میں ڈال دیا گیا کیوں۔“ جذباتی شور دیدہ ہر شے ہنس ہنس دینے والی ہواؤں کی طرح وہ بالکل کھری جا رہی تھی۔ سنبھالنے نہیں سنبھال رہی تھی۔ کمرے کی ہر شے اٹھا اٹھا پھینک رہی تھی۔

”آغا جان اور بے بے جان نے بہت غلط کیا میرے ساتھ نا انصافی کی ہے انہوں نے میرے ساتھ۔“ وہ پ رہی تھی۔ بلک بلک کر رو رہی تھی چیخ چلا رہی تھی مگر دل کو کسی طرح سکون نہیں مل رہا تھا۔
 ”کشمالہ میری بات تو سنو۔“

رانی گل نے اس کی کھری کشمالہ کو پکڑ لیا مگر وہ اس سرسرتی آوارہ ہوا کی طرح تھی جو ہاتھ ہی نہیں لگ رہی تھی۔ اس کا غصہ، غیض و غضب جاہ و جلال کیا کچھ نہیں تھا اس وقت کشمالہ کے اندر۔ رانی گل کی آنکھوں میں آنسو تھے اس سے بھی اپنی بیٹی کی یہ اجڑی کھری حالت دیکھ کر بھی مجبور تھی مگر وہ بھی مجبور تھی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ آغا جان کا فیملہ پتھر پر لکھی لکیری طرح تھا انہوں نے اگر کہہ دیا تو لازمی اس پر عمل ہوتا ہے کسی کو چوں کرنے کی اجازت نہیں تھی، سوال اٹھانے کی اجازت نہیں تھی مگر اپنی انکولی بیٹی کی جو یہ کھری اجڑی حالت دیکھ رہی تھی تو دل کر رہا تھا کہ جائے اور پوچھیے آغا جان سے بے بے جان سے کہ کبوں کیا انہوں نے یہ نا انصافی یہ زیادتی ان لوگوں کے ساتھ۔ اس قاتل کی بیٹی کو کشمالہ پر کیوں فوقیت دی۔
 ”مگر..... نہیں.....“

”یہ وقت ہوش سے کام لینے کا ہے جوش اور جذبات سے کام نہ لیتے بڑے بڑے ہیں کشمالہ کی طرح اگر وہ اپنی ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھی تو سب ہاتھ سے نکل جائے گا۔ شہکاشہ ملک ہاتھ سے نکل جائے گا جو ان کے ایک اشارے پر ہٹا تھا ان کی مانتا تھا اور سب سے بڑھ کر انہیں چاہتا تھا اور ان کی عزت کرتا تھا مگر اس حقیقت اور سچائی سے بھی وہ نہیں موڑا جاسکتا کہ رانی گل سے پیار ان کی عزت و احترام ایک طرف مگر آغا جان اور بے بے جان اس کی مزوری ہیں، جن میں شہکاشہ ملک اور شہزیل ملک کی جان بستی تھی۔

”کھیل کھیلنا ہوگا مگر بہت ہوشیاری اور چالاکی سے، شہزیل کے مہروں کی طرح ایک ایک چال بہت سنبھل کر اس سوچ سمجھ کر چلتی ہوگی کہ جیت صرف اور صرف اس کا اور اس کی بیٹی کا مقدر ٹھہرے۔“ رانی گل کا شاطرانہ مانع بہت سی کڑوی اور زہریلی سوچوں کے تانے بانوں میں الجھتا جا رہا تھا۔
 ”کشمالہ..... بس بہت ہو گیا۔“ رانی گل نے سختی سے اس کو جھجھوڑ دیا تھا۔

”ماں جان!“
 ”جپ۔“ رانی گل نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی تھی۔
 ”تمہیں شہکاشہ ملک چاہیے نا۔“

”جی میں نہیں رہ سکتی شہکاشہ کے بغیر، میں مر جاؤں گی۔ مجھے شہکاشہ چاہیے۔“ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ رانی گل نے اس کو خود سے بھیج لیا تھا۔

ایک بار پھر واش روم کے بند دروازے کی جانب دیکھا جہاں اندر سے شاور کے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی اس نے سکھ کا سانس لیا اور دروازہ کھولنے آگے بڑھا۔ شہکاشہ نے دروازہ کھولا جہاں رانی گل کھڑی مسکرا رہی تھی۔

☆.....☆

”میں تو سمجھا شاید اب تمہاری آنکھیں قیامت والے دن میدانِ جہنم میں کھلیں گی مگر میں غلط ثابت ہوا۔“

”ارے کیوں نہیں آئیں تـ“ وہ سائیڈ میں ہو گیا تو رانی گل اندر آگئیں اور ایک ہی بل میں ناصر ف پورے لمرے کا جائزہ لے لیا تھا بلکہ رات کا گزرا افسانہ بھی جان گئی تھیں۔

”تو یا آخر آغا جان اپنی ضد میں کامیاب ہو ہی گئے۔“

”ج۔“

”میں جانتی ہوں تم نے بہت کوشش کی ہوگی اس شادی سے انکار کرنے میں۔“
 ”جی رانی! پھر اگر اتنا جان کے آگے میری ایک نہ چلی اور اتنا مناسب کچھ ہو گیا۔“

”کوئی بات نہیں میں کچھ سمجھتی ہوں مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی کہ تمہارے بابا کے قاتل کی سبھی کو ہاں کیوں پیاہ کے لائے ہیں اور وہ کی اتنے شاندار پروٹوکول سمیت، اتنا شاندار استقبال آؤ بھگت کیوں، جیسے ہر دن کی چوٹی میں ہونا چاہیے اسے آپنا ہر گھر ہمارے سر پر کیوں بٹھایا جا رہا ہے۔“ رانی گل دھیرے دھیرے ہر اگلے لگی تھیں۔

”شہناشہ تم میری گود میں پلے بڑھے ہو میری نظروں کے سامنے ہی جوان ہوئے ہو بھلے ہی آج تم سردار شہناشہ ملک ہو، مگر آج بھی میرے لیے وہی چلوے سے بیٹے ہو جو میری آغوش میں چھپ کر مجھ سے ہر اچھی بات شیئر کرتے تھے۔“

”نفرت کرتا ہوں میں اس لڑکی سے جسے زبردستی میری زندگی پر مسلط کیا گیا ہے، آغا جان کی بات مان تولی۔ بلکہ اس سے آگے میں اس لڑکی کو کوئی حق کوئی خوشی نہیں دے سکتا۔“ اس کی سچی سچی ہونے لگی تھیں۔

”مجھے اپنی تربیت پر ناز ہے۔“

رائی گل نے رخ کو ترچھا کر کے اس کو دیکھا تھا، رائل بلیو خوب صورت سی کڑھائی والے جار جٹ کے
ٹٹ میں اس کی گوری رنگت گھل اٹھی تھی۔

”لمبخت سادگی میں بھی اس قدر سینیں ہے تو ہلکے سے ستھار میں تو دو آتشہ ہو جائے گا اس کا سن۔“ زانی ہل
نے نہایت نفرت سے سوچا تھا۔

میں باہر جا رہا ہوں، آپ اس کو سہرا جائیے۔ بیوہ یہ میرے ساتھ نہ گئے۔ وہ اپنے گھر کے دروازے پر کھڑی ہو کر رہ گئی۔

☆.....☆

”آرام سے۔“ راجیل آفریدی، شام کو سہارے سے گاڑی سے نیچے اتارنے لگے تھے۔ غنوی بھی جلدی سے دوسری سائیڈ سے نیچے اتری اور شام کو دوسری سائیڈ سے سہارا دیئے اندر بڑھنے لگے تھے۔

”راجیل!“ شام نے ہولے سے پکارا تھا۔

”ہاں شام کہو۔“ راجیل آفریدی جانتے تھے ان کا اگلا سوال کیا ہوگا۔

”آپ جانتے ہیں میں کیا کہنا چاہتی ہوں۔“

راجیل آفریدی نے شام کو بیڈ پر احتیاط سے لٹانے کے بعد بلیکٹ ان کے سینے تک ڈال دیا تھا۔ وہ بٹنے لگے تھے کہ شام نے راجیل آفریدی کا ہاتھ تھام لیا تھا، راجیل آفریدی بہت مشکل میں پڑ گئے تھے، جس کا احساس پیچھے کھڑی غنوی کو باخوبی ہو گیا تھا، وہ راجیل آفریدی کو مشکل سے نکالنے کو آگے بڑھی تھی۔

”میں کیا کہہ رہی تھی ڈیڈی! اما کی صحت یابی کی خوشی میں کیوں نہ پارٹی رکھیں گھر میں۔“

”گڈ آئیڈیا مانی جا بلیڈ۔“ راجیل آفریدی کا دل بے شک بہت اداس اور افسردہ تھا مگر صرف شام کی خاطر چہرے پر چھوٹی سی اور چھوٹی بٹائٹ لانی ضروری تھی۔

”کیوں شام! تمہارا کیا خیال ہے؟“ انہوں نے شام سے رائے لی۔

”سلوی کے بغیر۔“

”کیوں سلوی کے بغیر اما اور ہم نے کیا اس سے پہلے بغیر کسی فرد کے کوئی پارٹی منائی ہے جواب منائیں گے، ہم اس دن سلوی کو یوڈیو کال پر لے آئیں گے۔“ غنوی نے سارا مسئلہ حل کر دیا تھا۔

”اور اگر میں ابھی سلوی سے بات کرنا چاہوں۔“

”ابھی.....!“ غنوی تھوڑا گڑبڑاتی ضرور ان کی اچانک خواہش پر مگر بہت جلد ہی خود کو سنبھال بھی لیا تھا۔

”ہاں..... ہاں کیوں نہیں مگر اما اس وقت تو سلوی سو رہی ہوگی نا، آپ تو جانتی ہیں یہاں پاکستان میں دن نکلا ہوا ہے تو امریکہ میں رات ہو رہی ہوگی۔“

”وہ سب تو ٹھیک ہے مگر مجھے آج ہی سلوی سے بات کرنی ہے۔“ ان کے لب و لہجے میں ضد کا عنصر بہت نمایاں تھا۔

”اوکے، شام ہو جائے گی بات مگر ابھی تم آرام کرو اور سلوی کو غنوی بیٹا تم سے پیچھوڑ دینا، اب جاؤ اور دیکھو شام کے لیے سوپ تیار ہو گیا ہے تو لے کر آؤ۔“ راجیل آفریدی نے وہ ٹاپک ہی کھڑ کرنا چاہا۔

”جی ڈیڈی!“ غنوی وہاں سے نگاہ چراتی نکلی تھی، راجیل آفریدی شام کے پاس آئیٹھے تاکہ ادھر ادھر کی باتوں میں سلوی کا ٹاپک بھلا سکیں۔

☆.....☆

سلوی، رانی گل کے ہمراہ ناشتے کی ٹیبل پر آچکی تھی، گھر کے سارے ہی فرد بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے، سوائے شہکاش ملک کے وہ بغیر ناشتے کے ہی چلا گیا تھا۔

”شہکاش نے ناشتہ کر لیا تھا۔“ بے بے گل نے فکر مندی سے رانی گل سے پوچھا تھا۔

”پتا نہیں بے بے گل میں جب کمرے میں گئی تو وہ نکل رہا تھا۔“

”کوئی بات نہیں ابھی میں فون کر کے بلوالوں گا، آپ پریشان مت ہوئیے میرا گل اور جو سامنے ہے

اسے اپنے ہاتھ سے ناشتہ کھلائیے۔“ آغا جان نے اپنے سائیڈ پر بیٹھی سلوی کو پر شفقت بھری نظروں سے دیکھا تھا۔

”بھیا ابھی نا نہایت ہی بورنگ ہیں کم از کم آج کے دن تو سلوی بھائی کے ساتھ ناشتہ کر لیتے، مگر ان کا مونو صرف کام کام اور کام ہی پر چلتا ہے مگر سلوی بھائی آپ ٹینشن مت لیں آپ کا یوڈیو آپ کو بھایا کی کی محسوس نہیں ہونے دے گا۔“ ٹٹ ٹٹ سا شہریل ملک سلوی کو بہت اچھا لگا تھا، اپنے بڑے بھائی سے قدرے مختلف مزاج کا۔

شہریل ملک کی چلبلی باتیں اور چھیڑ چھاڑ کو کشمالہ اور رانی گل نے بغور دیکھا تھا اور انہیں جو اپنی شیطانی آنکھوں سے نظر آرہا تھا جو بال ان کا شاطرانہ و ماغ سوچ رہا تھا وہاں کسی کی بھی رسائی ممکن نہیں تھی فی الحال۔

☆.....☆

اور پھر دن یوں پر لگا کر اڑے کہ پتا ہی نہیں چلا۔ آج ان کی شادی کو پورے دو ماہ ہو گئے تھے مگر پہلے دن کی طرح سے آج تک سلوی اور شہکاش ملک کے درمیان ایک سردی جنگ چل رہی تھی۔ وہ سمجھ ہی نہیں پار ہی تھی آخر اس کے سخت رویے اور بے اعتنائی کی وجہ کیا ہے، کیوں وہ سلوی سے سخت نفرت کرتا ہے آج تک اس کا سرا نہیں مل پایا تھا، چلو وہ مان لیتی مگر اس کا رویہ سب کے ساتھ ایک جیسا ہونا تو صبر بھی آجاتا کہ شہکاش ملک کا مزاج ہی راسخ قسم کا بے زاریت والا ہے مگر اس نے دیکھا کہ رانی گل اور اس کی کزن کشمالہ سے بہت اچھی طرح اور

بہت بے باک ہیں اس کے بائیں کرتا ہے ایسی خوش مزاجی سے کہ لگتا ہی نہیں کہ وہ اس کے انداز کا کوئی حصہ بھی ہے، کمرے میں آتے ہی وہ ایسا ہو جاتا جیسے اس کے علاوہ یہاں کوئی اور ہے ہی نہیں۔ سلوی نے اگر اس سے بات کرنے کی

کوشش بھی کی تو وہ بری طرح جھڑک دیتا یا پھر اس طرح غلط انداز کرتا جیسے اس نے کسی اور کو مخاطب کیا ہو، وہ تو

تی ہی صدا کی خاموش طبیعت کم گوریز رو اپنے کام سے کام رہنے والی لڑکی اور پھر شہکاش ملک ٹھیک نہیں تو کیا ہوا

باقی تو سب بہت اچھے ہیں نا، آغا جان، بے بے گل، اس قدر خیال رکھتے ہیں اس کا اس کا فٹ کھٹ ساد پور

شہریل ملک اس کو اپنی مزید باتوں میں الجھائے رکھتا کہ چند لمحوں کے لیے وہ شہکاش ملک کی بے اعتنائی اس کا

سرد رویہ بھول جاتی مگر اس گھر میں جو سب سے پر اسرار سرد رویہ تھا وہ کشمالہ اور رانی گل کا تھا۔ وہ اس سے ملتی تو بہت اچھی طرح سمجھیں مگر جانے کیوں کبھی کبھی ان کی باتیں اسے الجھا دیتی تھیں پھر اس کا اس کا دلچسپ کچھ ایسا

رویہ جو اس کو سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

”ہاؤ۔“ شہریل ملک پیچھے سے آکر زور سے چیخا کہ وہ دوفٹ اوپر اچھل کر رہ گئی تھی۔

”شہریل کے پیچھے ڈرا دیا۔“ سلوی نے اپنے تیز دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ کے اس کو گھورا تھا۔ اس چوٹی میں

بہن تین لوگ تھے جو جھ معنوں میں سلوی کو نا صرف سمجھ میں آئے تھے بلکہ بہت اچھی دوسری بھی ہو گئی تھی شہریل

ملک سے۔

”کیا سوچ رہی ہیں بھایا کے بارے میں۔“ وہ وہیں دوسرے صوفے پر براجمان ہو گیا تھا۔

”ہاں..... نہیں..... نہیں تو.....“ وہ گڑبڑا کر رہ گئی شہریل ملک کے اچانک سوال پر۔

”ہاں..... نہیں.....“ شہریل ملک نے بغور سلوی کا چہرہ دیکھا تھا۔ سلوی نے شہریل ملک کا چہرہ دیکھا۔

”کچھ نہیں چھوڑو۔“ اس کی آنکھوں کی اداسی واضح طور پر شہریل ملک دیکھ سکتا تھا جیسے وہ بہت چھپانے کی

”میں جانتا ہوں بھایا کارویہ آپ کے ساتھ ٹھک نہیں ہے۔“ پیچھے کشمالہ اندر آتے آتے ٹھٹھک کے رک گئی تھی اور ان دونوں کے پاکیزہ اور مقدس رشتے کو کوئی اور نام دینی وہاں سے ہٹتی چلی گئی، کیونکہ باہر سے شہکاشہ ملک کی گاڑی کی آواز اس کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔ وہ تیزی سے باہر کی جانب بھاگی۔

”میں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے اصل میں وہ اپنے کام میں بہت بڑی رہتے ہیں بہت سی ذمہ داریاں ہیں ان کے کندھوں پر۔“

”اچھا اس بات سے تو میں بے خبر تھا۔“ شہنیل ملک ہولے سے اس کی بات گھمانے پر مسکرا دیا تھا۔

”کون سی بات۔“ وہ ناجی انداز میں دیکھنے لگی۔

”آپ واقعی بہت سیدھی ہیں سلوئی بھابی! اور یہ سادگی کچھ کام نہیں آئے گی ذرا سی ہوشیاری دکھائیں اگر نہیں آتی تو کشمالہ آپ سے سیکھ لیں۔“

”پاکل ہوئے جھکنا اگر ابھی انہوں نے سن لیا تو تمہاری خیر نہیں۔“ سلوئی نے نازکی سی مٹھی کا مکا بنا کر اس کے بازو پر جڑ دیا۔

”اور کیسے تو کیا دیکھیں بھابی! اس طرح ہنس ہنس کر ان سے کہیں لڑاتے ہیں کیونکہ وہ ہر دم اپ ٹو ڈیٹ بن کر رہتی ہیں، آپ بھی ذرا فارم لینے لیں تو کم از کم میری لٹائی بن جائیے۔“

”شہنیل! بدتمیز۔“ سلوئی نے شہنیل سے نکال کر اس کے اوپر مارا جسے اس نے نہایت بے شمار طریقے سے بچ کر لیا تھا۔

”کیا ہو رہا ہے یہ سب۔“ بھاری اور گھمبیر آواز پر دونوں نے داخلی دروازے کی جانب دیکھا۔ جہاں شہکاشہ ملک تیز نظروں سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ کشمالہ پیچھے ہٹ کر شہنیل ملک کو گھور رہی تھی جو اس کی ذات کے پرچے اڑا رہا تھا اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔

”کچھ خاص نہیں ہم تو آپ کی اور کشمالہ آپ کی تعریف کر رہے تھے۔“ وہ بھی صدا کا ڈھیٹا ڈھیٹا واقع ہوا تھا، ہنستا ہوا کھڑا ہو گیا۔ سلوئی نے اپنے اندر تک ان دو آنکھوں کی پتیلیوں کی گلی لپٹا لگا جیسے وہ ابھی نہیں بیٹھے بیٹھے جل کے خاکستر ہو جائے گی۔

”وہ تو مجھے نظر آ رہا ہے۔“ مضبوط قدم مارنے کے فرش پر دھرتا آگے بڑھا۔

”نہیں بھایا! آپ کو کچھ نظر نہیں آ رہا ہے تو اہم پوائنٹ ہے۔“ لمبی مذاق میں ہی وہ بہت کچھ جتا جایا کرتا تھا۔

”تو اب تم مجھے سیکھاؤ گے۔“ اس نے ذرا غصے سے شہنیل ملک کو دیکھا۔

”ارے نہیں، بھی یہ گستاخی تو کوئی باخوبی ایمان داری سے بھرا ہوا ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ شہکاشہ ملک سمجھا یا نہ سمجھا مگر کشمالہ ضرور سمجھ گئی تھی۔

”تم کہنا کیا چاہتے ہو کل کر کہو۔“ کشمالہ شہنیل ملک کو بھڑکانا چاہ رہی تھی اس کی ذات کی بھٹکے ہی اس وقت نفی ہوتی مگر کسی طرف داری ہی اس کی نفی کی جیت تھی۔ شہنیل ملک کشمالہ کو بہت اچھی طرح جانتا تھا بتا کچھ بولے وہ دو قدم آگے بڑھا تھا اور نفی میں ادھر ادھر سر ہلاتا مسکراتا ہوا باہر نکل گیا تھا، کشمالہ کا پلان نا کام ہو گیا تھا۔ وہ اندر ہی اندر جل بھن کر رہ گئی۔

”شہکاشہ۔“ آغا جان کی مصروف سی آواز پر اس نے وہاں دیکھا۔

”میٹا ذرا ادھر آؤ تم سے کچھ کام تھا اس زمین کا مسئلہ حل کرو آ کر۔“

”جی بہتر آغا جان!“ اس نے کشمالہ کو دیکھنے کے بعد صوفے پر بیٹھی سر کو جھکائے ناخن کھرچتی سلوئی کو غصے سے دیکھا اور آغا جان کے بیڈروم کی طرف بڑھ گیا۔

☆.....☆

سلوئی کا فون بج رہا تھا وہیں سے گزرتا شہنیل ملک کی نظر بڑی تھی اس پاس کوئی نہیں تھا، شہنیل ملک نے فون اٹھایا جہاں اسکرین پر کسی پیاری سی لڑکی کی تصویر چھلک رہی تھی اور پھر کال بھی وائس نہیں دڈیو تھی۔ شہنیل ملک کا جیس بڑھا کہ جب اسکرین پر اتنی پیاری ہے تو فیس نو فیس دیکھنے میں کیسی ہوگی۔ اسی لیے اس نے بجتے فون کو ریسیو کر لیا تھا۔

”کہاں تھیں سلوئی کتنی دیر سے فون.....“ نان اسٹاپ بوٹی غنوی کی زبان کنگ ہو کر رہ گئی تھی مگر تا دیر وہ چپ نہیں رہی۔

”کیا میں جان سکتی ہوں کہ سلوئی کا فون آپ کے پاس کیا کر رہا ہے؟“

”وہ انکپو نیٹ سلوئی بھابی شاید بچن میں یا بے محل کے پاس ہوں گی تو اپنا فون یہیں بھول گئیں۔“

”اور آپ نے فون کی سیو کر لیا، کسی نے میسر نہیں سکھائے کہ کسی کا پرسل فون نہ تو اٹھانا چاہیے اور نہ ہی ریسیو کرنا چاہیے۔“ غنوی نے ٹھٹھک جھانک سلگ کے رہ گئی تھی۔

”میں میسر تو کسی نے نہیں سکھائے ہاں کیا ایسا ہو سکتا ہے میں ہر روز میسر کی کلاس لینے آپ کو ویڈیو کال کر لوں۔“

”جسٹ شٹ اپ، جائیں اور سلوئی کو بلا لیں۔“

”ارے میں فیس بھی دینے کو تیار ہوں بتائیے۔“

شہنیل ملک کو یہ پیاری سی لڑکی بہت اچھی لگی تھی۔ دل جانے کیوں اس سے بات کرتے رہنے کو چاہ رہا تھا۔

”دیکھو مسٹر میرے منہ مت لگنا میں ذرا دوسرے مڑاؤں کی بات کر رہی ہوں۔“ وہ تا دیر اپنی لڑاکا فطرت کو دبائیں مکی تھی۔

”کوئی بات نہیں میں ایڈ جسٹ کر لوں گا۔“

”واٹ؟“ غصے کی شدت سے وہ سرخ ہو گئی تھی۔

”اگر ابھی میں وہاں ہوتی تو اچھی طرح تمہیں بتاتی کہ آئندہ مجھ سے فضول بات نہ کرے گی۔“

”تو پر اہم آپ کو یہاں لانے کے انتظام ہو سکتے ہیں۔“ ذومعنی انداز میں کہتے ہوئے وہ پر شوخ ہوا تھا۔

”یو.....“ غنوی نے شہادت کی انگلی اس پر اٹھا کر وارن کرنا چاہا۔

”خاکسار شہنیل ملک کہتے ہیں شہکاشہ ملک کا چھوٹا بھائی اور سلوئی بھابی کا پیارا اساد پور۔“

”جی مجھے اندازہ ہے تمہاری باتوں سے کہ تم ان محترم کے ہی نمونے بھائی ہو۔“

”ارے!“ وہ ہنس دیا۔

”ویسے تم بہت کیوٹ ہو۔“

”آپ سے تم پر آنے میں زیادہ ٹائم نہیں لگا تھا۔“

”مجھ سے زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے، تم سلوئی کو بلارہے ہو یا میں فون آف کروں۔“

”ارے نہیں پلیز خدا را فون آف مت کرنا تم سے بات کرنا اچھا لگ رہا ہے۔“

”اور جو میرا سچ تمہارے منہ پر پڑے گا تو وہ اور زیادہ اچھا لگے گا۔“

”میں اس کے لیے تیار ہوں مطلب تمہارا سچ کھانے کے لیے۔“ شہزہیل ملک بہت محظوظ ہو رہا تھا اس نٹ

کھٹ لڑائی سے۔

”دیکھ لوں گی تمہیں۔“ غصے سے اس کا چہرہ ہنسنے لگا تھا بس نہیں چل رہا تھا کہ موبائل سے نکال کر دھوکے

رکھ دے۔

”بالکل میری بھی یہی خواہش ہے کہ تم زندگی بھر صرف مجھے ہی دیکھو۔“ شرارت سے ایک آنکھ دہائی تھی،

غٹوئی کا غصہ ساتویں آسمان پر چا پہنچا تھا اس کے برداشت سے باہر تھا وہ لڑکا، اگر زیادہ دیر وہ اس کی بکواس سنتی

رہی تو یقیناً اپنا ہی فون توڑ دے گی۔ اس لیے لائن ہی کٹ کر دی۔ شہزہیل ملک دلکشی سے مسکرا رہا تھا۔

”لو میرا فون تمہارے ہاتھ میں ہے میں کب سے ڈھونڈ رہی ہوں۔“ سلوئی نے اپنا فون شہزہیل ملک کے

ہاتھ میں دیکھا تو وہیں پہنچ گئی۔

”جی آپ کا فون نہیں تھا اور کسی کا فون ابھی رہا تھا۔“

”ارے نہیں غٹوئی کا فون تو نہیں تھا۔“ سلوئی نے جلدی سے اپنا فون چیک کیا۔

”آئی تھینک وہی محترمہ تھیں ویڈیو کال پر۔“ شہزہیل ملک کے لبوں پر شریری مسکراہٹ تھی۔

”شہزہیل!“ سلوئی پہلی بار اس پر چیختی تھی۔

”تم نے کیوں ریسپیوکر کی کال۔“

اس کے چہرے پر پریشانی ہو دیدہ تھی جو شہزہیل ملک تو کم از کم نہیں سمجھ سکتا تھا۔

”ارے سلوئی بھابھی تو کیا ہوا آپ یہاں نہیں تھیں تو میں نے سوچا تھا تو آپ کی سسر کو۔“ سلوئی نے کچھ نہیں کہا

بس خاموشی سے اس کو دیکھنے کے بعد اپنا فون چیک کرنے لگی تھی اس کی سوچ یہ تھی کہ کیا کہیں ”ماما نہ ہوں“ ورنہ..... اور

اس ورنہ کے آگے وہ سوچ نہیں سکتی۔

”وہی سلوئی بھابھی آپ کی سسر آپ سے بہت الگ مزاج کی ہے۔“ شہزہیل ملک کے چہرے پر ابھی بھی

مسکراہٹ تھی جو غٹوئی سے بات کرنے پر تھی۔

”ہاں غٹوئی کی عادت مزاج مجھ سے بہت مختلف ہے۔“ اس کے چہرے پر بہن کا سوچ کر خوشی کی چمک دمک تھی۔

”اور مجھے ایسے مختلف مزاج والی لڑکی بہت پسند ہے۔“ اس کے انداز میں کچھ ایسا تھا کہ سلوئی نے نہایت چونک کر

اس کو دیکھا تھا مگر جب دوسرے انداز سے دیکھا تو دل بہت خوش ہوا تھا غٹوئی کے لیے شہزہیل ملک جیسا خوش مزاج لڑکا

بہت سوٹ کرے گا۔

”کہاں کھو گئیں؟“ شہزہیل ملک نے سلوئی کے سوچتے چہرے پر ہاتھ لہرایا تھا۔

”سوچ رہی ہوں مجھے کس سائیڈ کی فیور لینی ہوگی کیونکہ مجھے تو تم دونوں ہی عزیز ہو۔“ سلوئی کے چہرے پر دلکشی

مسکراہٹ تھی۔

شہزہیل ملک کا دل گلابوں سا کھل اٹھا تھا۔

”تو پھر آپ کو پوری طرح میری فیور لینی ہے ملائیں ہاتھ۔“ ان دونوں کی ذومعنی باتیں اور دلکشی کو پیچھے کھڑے

ملک نے نہایت غیض و غضب نظروں سے دیکھا تھا۔ اس کے ذہن میں جو شک کے بیج بو دیے گئے تھے وہ تباہ و

بنا جا رہا تھا۔ شک کو یقین کی زبان ملتی جا رہی تھی۔ دل میں سلوئی کے لیے نفرت اور شدید نفرت میں اضافہ ہوتا

تھا۔

”پتہ نہیں کون بندر تھا۔“ سلوئی نے تپ کر فون آف کر کے سائیڈ میں رکھ دیا تھا اور جیسے ہی کھڑی ہو کر پلٹی قدم جیسے

بین پر ٹھٹھک کر رک گئے تھے۔

”ماما!“

”انتابڑا جھوٹ مجھے انتابڑا دھوکہ دیا کیوں؟“ ثناء صدے کی حالت میں وہیں چیخ پر تیشی چلی گئی تھیں۔ غٹوئی تیزی

کے پاس آئی تھی۔

”تم لوگ نہیں جانتے تم لوگوں نے کیا کیا ہے وہ لوگ ظالم و جاہل ہیں وہ لوگ مارویں گے غٹوئی وہ لوگ سلوئی کو بھی مار

۔۔۔ جب ان لوگوں نے اس کے..... ثناء کو کچھ احساس ہوا تو وہ خاموش ہو گئیں اور غٹوئی کو نکلنے لگیں۔

”تمہارے ڈیڈی کہاں ہیں بلاؤ انہیں۔“ ثناء کھڑی ہو گئیں اور جیسے ہی باہر کو بڑھنے لگیں تو دروازے پر پہلے سے ہی

آفریدی ایستادہ تھے۔ ثناء نے ان کو شکایتی نظروں سے نکا تھا۔

”سب کچھ جاننے ہوئے بھی آپ نے سلوئی کو وہاں کیوں بھیجا ہے راجیل۔“

”سب کچھ جانتے ہوئے ہی میں نے سلوئی کو وہاں بھیجا ہے کیونکہ وہ آغا جان کی امانت تھی۔“

”مگر آپ بھول رہے ہیں کہ وہاں شہزہیل بھی ہے۔“

”جی مگر سلوئی از سر کل نہیں سلوئی پر اور شہزہیل ملک کی بیوی ہے۔“ سوال پر سوال اور دو بد جواب حاضر تھا۔

”آپ کو لگتا ہے شہزہیل ملک سلوئی کی حفاظت کرنا ہے گا۔“

”شہزہیل ملک کوئی چھوٹی شے نہیں تم بس انتا جان لو سلوئی پر کوئی بری نظر نہیں ڈال سکتا۔“

”میں ان لفظی باتوں پر یقین نہیں کر سکتی راجیل! بس میں انتا جانتی ہوں آپ نے ایک ماں کو دھوکہ دیا ہے اس سے

ان بولا ہے۔“ ثناء نے ناراضی بھری نظروں سے راجیل آفریدی کو دیکھا تھا۔ ثناء ہارے تھکے وجود کو لیے صوفے پر

اُٹ بیٹھیں۔ راجیل آفریدی کا دل ان کی حالت پر کھڑے کھڑے ہو گیا تھا۔ وہ کھٹے ہوئے آئے اور نہایت آہستگی سے

برابر میں براجمان ہو گئے تھے۔

”یقین رکھو ثناء سلوئی کو کچھ نہیں ہوگا۔ سلوئی کو آغا جان لے کر گئے ہیں اور انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ سلوئی

کو بچھڑی نہیں آئے دیں گے۔“ راجیل آفریدی نے ثناء کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں دبا لیا تھا۔

”ماما.....!“ افریدی غٹوئی بھی ثناء کے پاس آئی تھی۔

”ڈیڈی بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ہماری سلوئی کو کچھ نہیں ہوگا۔“ ثناء نے راجیل آفریدی کو دلکھی نظروں سے دیکھا تھا۔

”راجیل! وہ خون آشام منظر آپ بھول سکتے ہیں وہ قیامت خیز رات آپ فراموش کر سکتے ہیں مگر میں نہیں آج بھی

دل اور فہم کی خون میں لت پت لاشیں میری آنکھوں کی پتلیوں پر گھومتی ہیں جہی میں نے تہیہ کر لیا تھا زہر گل اور

سے وعدہ کر لیا تھا کہ سلوئی کی حفاظت خود سے بھی زیادہ کروں گی اس پر دنیا کے گرم تھپڑوں کی معمولی سی آج بھی نہیں

دووں کی مگر آپ نے تو میری پھولوں سی نازک بچی کو دھکی آئیں جھونک دیا۔“

ثناء کی آنکھیں مسلسل اشک بار تھیں چہرے سے اذیت جھلک رہی تھی شکوے گلے جھلک رہے تھے۔

”ثناء!! اگر اس طرح کرو گی تو میرا حوصلہ میری ہمت ہار جائے گی میں نے جو خود کو سنبھالا ہے سلوئی کو خود سے الگ کر

”جیسے میں تو..... ارے آپ نے نہیں سلوئی کو تو نہیں دیکھ لیا۔“
 ”کیونکہ اس حویلی میں اس کے علاوہ تو اور کوئی نیا چہرہ نہیں ہے۔“

”ہاں بولوشہنر!“، بمشکل اپنی ناگواریت پر قابو پاتے ہوئے شہسیر نے شہنار مل ملک کو دیکھا۔
 ”وہ ذرا اسلاڈا ٹرے اٹھا کے دے دیں۔“ شہسیر کی آنکھوں میں غصے کی ہلکی سی رمت تھی۔

”پاس ہی تو رکھی تھی خود ہی لے لیتے۔“ یہ بات ششیر صرف سوچ سکتا تھا۔

”سلوی بھا بھی!“

”ہاں.....“ وہ ہلکے سے چونک کر شہزاد ملکہ کو دیکھنے لگی تھی۔

”میں نے کھانا کھا لیا ہے اگر آپ نے بھی کھا لیا ہے تو پلیز مجھے ایک کپ گرم چائے مل سکتی ہے۔“

”ہاں کیوں نہیں۔“ وہ تو ویسے ہی یہاں سے اٹھنے کے لیے پرتول رہی تھی شہزاد کی فرمائش نے اس کو یہاں سے بٹنے کا بہانہ دے دیا۔ اس نے جلدی سے جیپز پیچھے کو کھڑکائی اور تیزی سے بگن کی طرف بڑھی اس کی اس تیزی سے جانے اور شہزاد ملکہ کی فرمائش پر فرمانبرداری کو شبکاشہ ملک نے شدت سے نوٹ کیا تھا۔ شک و شبہات کے سارے دروازے ایک ایک کر کے کھلتے چلے گئے۔

☆.....☆

”چناخ.....“ کمزور و نحیف ہاتھ کا تماچہ چونکہ ہلکا سا تھا مگر اس خاموشی کی فضا میں بھرپور گونجا تھا۔ صوفے پر بیٹھی رانی گل اور کشمالہ تو سناٹے میں رہ گئی تھیں۔ آج بہت عرصے بعد آغا جان کا غصہ عود کر آیا تھا۔ آج ساری سچائی کا پھل فاش ہو گیا تھا حقیقت کا ہر پردہ ان کی آنکھوں کے سامنے آشکار ہو گیا تھا۔

”پہلے تو مجھے صرف شک تھا وہ تم تو سوچا چھوڑو حالات کو تم اپنی عقلمندی اپنی سمجھداری سے قابو میں کر لو گے مگر تم خود ہی کھوٹے سکے نکلے تفت بے تم ہوئے۔“ سلوی کے بڑے سے ہال میں گھر کے سارے افراد جمع تھے۔ پانی سر سے گزر رہا تھا جیسی شہزاد ملکہ نے ہی آغا جان کو سب کچھ بتایا تھا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ آغا جان نے سب کو اکٹھا کیا تھا مگر سختی سے تاکید بھی کی کہ سلوی کو بے تک بھی نہیں پڑنی چاہیے۔

آغا جان کے تنقید لفظوں کے انگاروں سے شبکاشہ ملک کو لانا پورا وجود جھلستا ہوا محسوس ہوا تھا۔ آغا جان کی عدالت کے کنبہ سے میں وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے شرمندگیوں کی انتہا پہنچاؤں میں گھرا ہوا تھا۔

”تم نے سوچا چھوڑی گل نے سوچا تم نے وہ دیکھا جو رانی گل نے نہیں دیکھا۔“ یہ کہنا غلط نہیں کہ تم اندھے بہرے اور گونگے بلکہ ایک اپانچ والی زندگی گزار رہے ہو جس کی سوچنے سمجھنے کی حس دیکھنے بولنے اس کی آنکھیں کان زبان سمجھنے کچھ خود اپنے اختیار میں نہیں جس کا بے دریغ استعمال رانی گل کر رہی تھی۔ جس کی زندگی کا بیٹھوس کنٹرول رانی گل کے ہاتھ میں تھا۔“

آغا جان کا لب و لہجہ خاصا تشکیک آمیز تھا مگر تھا یہ کڑواچ جس کے گھونٹ گھونٹ میں کڑوی سچائی تھی جس نے رانی گل کو زمین کے اندر دھنسا دیا تھا۔

”سلوی بچی کو میں یہاں اس لیے تمہاری دلہن بنا کر لایا تھا کہ ہمارا بھی گناہوں کا کچھ قرض اترے دل کا بوجھ ہلکا کر دو شہزاد کم از کم زریں گل اور فصیح آفریدی کے آگے کھڑے ہونے کا حوصلہ تو ہو مگر نہیں تم نے تو ہمیں اور اپنی بے عقلی سے جیتے جی زندہ درگور کر دیا۔“ آغا جان کی نظروں میں بیٹے دنوں کا دکھ ہلکورے لے رہا تھا مگر ان کی باتوں نے شبکاشہ ملک کو زریں گل کو الجھا دیا تھا بے بے گل کی بوڑھی آنکھیں مزید اشکبار ہو گئی تھیں۔ شہزاد ملکہ اپنی جگہ سے اٹھا اور بے بے کے پاس آ بیٹھا اور ان کا سر اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ دکھ اور اذیت سے تو وہ بھی دوچار تھا کہ شبکاشہ ملک کی سوچوں اس کو اپنی ہی نظروں میں گرا دیا تھا۔ آغا جان چلتے ہوئے رانی گل کے پاس آٹھ رہے۔

”ہاں..... سلوی راجیل آفریدی کی نہیں بلکہ فصیح آفریدی اور زریں گل کی بیٹی ہے۔ اس دن جو خون کی ہوئی کھیل تھی۔ اس قیامت خیز منظر سے ہم نے چند گھنٹوں کی معصوم مٹھی سی سلوی کو بچا لیا تھا۔ اپنی بیٹی زریں گل کو گھونٹیں بچا پایا

نے کے پرتو کی حفاظت ضرور کی ہے وہ ایک امانت کی طرح ہم نے راجیل آفریدی کے پاس رکھوائی تھی۔“ آغا جان کی باتوں نے بھر گئیں۔ ان کے بھیلے ٹوٹے کھڑے لب و لہجے پر رانی گل کا چہرہ یکدم سے تاریک ہونے لگا تھا۔ ان سے لڑا گناہ سرزد ہو گیا تھا اپنی بیٹی کشمالہ کے پیار میں اس قدر اندھی پاگل ہو گئی تھیں کہ اپنی جیتی چھوٹی بہن زریں گل کی اپنی زندگی تباہ کرنے کے در پر ہو گئی تھیں اور اس سے بھی بڑا گناہ تو یہ کر بیٹھیں کہ اس معصوم پر الزام لگایا بہتان لگایا کہ وہ شہزاد ملکہ آپس میں انٹرنلڈ ہیں۔

دھچکا اور دھکا زبردست لگا تھا کہ وہ اتنا بے خبر رہا اور جانتا بھی کیسے اس نے کبھی سلوی کے قریب جانے کی کوشش بھی تو کی تھی اس کے سر و سپاٹ انداز سے سلوی ہمیشہ ڈری بھی خوفزدہ چڑیا کی طرح چوں بھی نہیں کر پاتی تھی۔

”تم نے کتنا سنگین بہتان اس معصوم پر لگایا ہے ایک لمحے کو بھی خیال نہیں آیا کہ تم کس کے بارے میں سوچ رہی ہو۔ تم نے نہ تو اتنا دہشت گردی ہو اس کے الزام لگا رہی ہو اس کے الزام تراشی کی معافی تو اللہ رب العزت کی عدالت میں بھی نہیں ہے۔ تم شہزاد ملکہ آپس میں انٹرنلڈ بھی کیسے دیا۔

یکدم سے ان کی آواز میں سختی اور تیزی آئی تھی غصے کے شرارے ان کی آنکھوں سے ان کے ہر ہر عضو سے پھوٹ رہے تھے۔ شہزاد ملکہ کی منہنگی نے رانی گل کی قوت گویائی پوری طرح سلب کر دی تھی بولنے کے لیے کوئی الفاظ نہیں۔ ان کی لبوں پر جھنجھکی تھی کے صاف ظاہر تھا کہ وہ رو رہی تھیں۔ آغا جان نے ایک عصبی تیز نظر رانی گل کے جھکے سر پر دیا اور وہ آپس شبکاشہ ملک کے پاس دو کمرے دھیرے دھیرے چلتے ہوئے آٹھ رہے۔

”دل تو شدت سے چاہ رہا ہے کہ ایک در در جھانپو اور تمہارے منہ پر ماروں۔ تم نے رانی گل اور کشمالہ کی بے وفائی میں مکمل ان کا ساتھ دیا۔ ان کے گناہوں کے گناہوں پر یقین کر لیا اور سلوی کو شک بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔“ آغا جان کی آنکھوں اور چہرے سے بڑھی چٹک رہی تھی حالانکہ لب و لہجے سے غصہ اور ناراضی صاف واضح تھی۔

”اور ہاں اب اگر تمہارے دل و دماغ میں شک و شبہات کے کوئی بونے ہوئے گئے ہیں جو آج تناور درخت بن چکے ہیں ان پھاؤں اور گرم گرم گرجھلا دینے والی ہواؤں میں کسی کا وجود خالص ہو رہا ہے دھیرے دھیرے کسی کی زندگی گھٹ گھٹ کر رہی ہے تو سب کچھ آج ہی کلیئر کر دیا جائے۔ ہر راز سے پردہ فاش کر دیا جائے۔ سب یہ بہت ضروری ہو گیا ہے کہ اس کے سامنے حقیقت کا ایک ایک پنہ کھول دیا جائے بہت ساری زندگیوں کے اودان تمہاری نظروں کے سامنے آنے

شبکاشہ ملک نے بمشکل اپنی نگاہیں اوپر کواٹھائی تھیں۔ آغا جان کے چہرے اور نگاہوں میں ہوا اذیت جو کرب جو غم و غماؤں شبکاشہ ملک کو دل سے شدت سے محسوس ہوا تھا۔ اسے اس پل اپنی زندگی سے اپنی سانسوں سے شدید نفرت ہو گئی تھی۔ آج اگر آغا جان بے بے گل کی آنکھوں میں آنسو تھے در در تھا دکھ تھا تو اس کی وجہ صرف وہی تو تھا۔

”زرخان ملک یعنی تمہارا باپ کا ہی صرف قتل نہیں ہوا تھا شروعات زرخان ملک کی جانب سے ہی ہوئی تھی گولی سب اپنے اس کی جانب سے نکلی تھی اس نے سلوی کے باپ فصیح آفریدی پر گولی چلائی تھی۔“ اور پھر ان بوڑھی اور کمزور لڑکی کی چٹپٹوں پر وہ قیامت خیز منظر کی فلم کی طرح چلنے لگا تھا۔ جسے وہاں ہال میں بیٹھے ہر آنکھ نے دیکھا اور ہر کان نے سنا۔ بیچارہ جیسا غم انہوں نے اپنے دل میں اٹھا رکھا تھا۔ جس کے زخم آج بھی تازہ تھے مگر شبکاشہ ملک کی حرکتوں کی وجہ سے ان زخموں سے لہو رہنے لگا تھا۔

”تم نے آج ہمیں تو ڈیا ہمارا ان کا اعتبار اعتماد سب چکنا چور کر دیا۔ زریں گل اور فصیح آفریدی کے سامنے ہی نہیں کرو یا بلکہ اس معصوم سلوی بیٹی کے سامنے نظر اٹھانے کے بھی قابل نہیں چھوڑا۔“ تھا کہ ماندہ سائب و لہجہ باری

ہوئی چال چلتے ہوئے وہ بے ہنگم کے برابر میں جا بیٹھے جھکے ہوئے کندھوں پر زندگی نے مزید بوجھ ڈال دیا تھا۔
 ”کشمالہ اور رانی گل الگ اپنی جگہ شرمندہ اور حیران تھیں۔ بیٹی کے اندھے پیار پاگل پن نے رانی گل کو سسر
 نظروں میں مجرم ثابت کر دیا تھا وہ خود کو بہت چھوٹا محسوس کر رہی تھیں۔ اپنی بیٹی کے پاگل پن میں وہ اس قدر اندھی ہو گئی تھیں کہ اپنے سنے ماں باپ کو دکھ دیا ان کی آنکھوں میں آنسو تھے تو اصل کردار بھی تو ان ہی کا تھا۔ کشمالہ کی
 شہکاش ملک کو وہ ہر صورت چاہے جا تا ہی طریقہ کیوں نہ ہو وہ اس کو کشمالہ کی جھولی میں ڈالنا چاہتی تھیں مگر وقت کی
 ابھی بھی ان کے ہاتھ میں تھی جسے وہ ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں۔ ابھی دیر نہیں ہوئی تھی سارے حالات وہ سن
 لیں گی۔ رانی گل کے بیوہ ہونے کے بعد یہی سب لوگ تھے ان سب لوگوں نے سنبھالا تھا اتنا پیار مان دیا۔ ان کی
 کشمالہ کی ہر خواہش اور ہر خوشی پوری کی۔ کشمالہ کو کبھی شہکاش ملک اور شہنیل ملک سے تم نہیں سمجھا۔ ہر ضرورت کا آگے
 سے آگے بڑھ کر خیال رکھا اور شہکاش ملک تو کس قدر چاہتا تھا ان کو انہوں نے کیا کیا بدلے میں کیا دیا ان کے اسٹے
 چاہت، عزت اور احسانات کے بدلے میں انہوں نے کیا کیا صرف دھوکہ۔ رانی گل اپنی جگہ سے کھڑی ہوئیں اور
 جان کے گھنٹوں میں جا بیٹھیں۔ دونوں ہاتھوں کو جوڑے سر کو جھکا کر زار و قطار رونے لگی تھیں۔ اپنی سنگین غلطی
 گناہوں کی معافی کی طلب کا نہیں۔

”سلوئی.....“ کسی کے کرنے کی دوا اور پھر کسی کی جج کی آواز۔
 ”ہاں میں بیٹھے ہر فرد نے پلٹ کر دیکھا تو ہر کوئی اپنی جگہ پھرا کے رہ گیا سناٹے میں رہ گیا تھا۔
 نیچے ماربل کے صاف شفاف چمکتے فرش پر سونے کی بڑی بڑی گچ کی اس کے چہرے کی رنگت خطرناک حد تک سفید
 ہوئی تھی، وہ اپنے سارے عقل و خرد گواہ بن چکی تھی جس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ وہاں بہت دیر سے کھڑی تھی جس نے
 لوگوں کی ایک ایک بات سن لی تھی، گرتی ہوئی سلوئی کی طرف سے تھوڑی سی جھلک بڑھتے تھے انہیں دیکھ کر لمبے بھر کے
 آغا جان پکرا کر رہ گئے تھے۔

ثناء، راجیل آفریدی کو دیکھ کر تو بے ہنگم کی آنکھوں کے گرد اندھیرا سا چھا گیا تھا۔
 ☆.....☆
 ”بس کریں ماما اب اور نہیں کھایا جائے گا۔“ سلوئی نے ثناء کا بڑھتا ہوا ہاتھ تھام لیا جو اس کو پیش کرنا کٹ کا
 کے کھلا رہی تھیں۔
 ”کیوں نہیں کھایا جائے گا ابھی کھایا ہی کیا ہے ایک سیب بھی پورا نہیں کھایا۔“ ثناء نے دھیرے سے ڈپٹا تھا۔
 ”اور یہ سارے فروٹس ختم کرنے کے بعد یہ چکن سوپ بھی تمہیں ہی ختم کرنا ہے۔“ غنوی ہاتھ میں ٹرے لیے
 دم میں آگئی تھی۔

”کیا.....؟“ وہ شاکل کی کیفیت میں دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔
 ”کیا..... کیا کر رہی ہو اپنی حالت دیکھی ہے، ویسے ہی کمزوری تھیں اب تو اور شارٹ ہو گئی ہو۔“ سلوئی گھور کے
 نے۔
 ”یہ لو اب یہ انگوڑی جلدی سے ختم کرو۔“ ثناء کو بے چارگی بھری نظروں سے سلوئی نے دیکھا تھا۔ مگر ثناء نے ایک
 سستی اور اپنے ہاتھ سے ایک ایک کر کے کھلاتی رہیں۔
 اسی اثناء میں بیڈروم میں شہنیل ملک داخل ہوا تھا بیڈ پر بیک کراؤن سے ٹیک لگائے سلوئی پر اس کی نظر پڑی
 سنے سے ساختہ بلند بانگ تھوڑے گور کو نہیں رکھا تھا۔

اس کی انٹری پر اور پھر اس کے جاندار تھوڑے کونوئی نے نہایت ناگوار بھری نظروں سے دیکھا تھا۔
 ”ثناء! آئی جی میں بہت خوش ہوں، ہم لوگ تو سلوئی بھابی کو بول بول کر تھک جاتے کہ کھائیں مگر مجال ہے جو بات
 لیں۔ بعض اوقات تو میری بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ چڑیا جیسی خوراک سے یہ وہ کیسے لیتی ہیں۔“ پر مزاج لب و لہجہ
 نہایتا ثناء کے برابر میں رکھی خالی چیئر پر بیٹھ گیا تھا۔
 ”اب ہر کوئی آپ کی طرح پیڑ تو نہیں ہے۔“ غنوی نے تکتے ہوئے جواب دیا تھا۔
 ”مگر میں نے سنا ہے آپ کو کنگ میں ماہر ہیں ہر روز نئی ڈشز میں کمال حاصل ہے۔“ اب پوری طرح اس نے
 اپنی گواہی نظروں کی گرفت میں لے لیا تھا۔
 ”ہاں تو اس سے آپ کو کیا مطلب ہے۔“

ایک تو اس کے شوخی بھری نظروں سے دیکھنا پھر اس کی ذومعنی بات پر وہ تپ کر شہنیل ملک کو دیکھنے لگی تھی جب کہ غنوی
 بااہت سلوئی اور شاکل شہنیل ملک کی ذومعنی بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں آ گیا تھا۔ دونوں ہی منہ نیچے کیے ہلکے
 ہلکے لڑنے لگی تھیں۔

”خیر مطلب دیکھو چھوڑیں اور یہ جو سوپ کب سے ہاتھ میں لیے بیٹھی ہیں مجھے نہیں لگتا سلوئی بھابی نوش فرمائیں گی
 لیے آپ کی محنت نہ ضائع کرتے ہوئے میں ہی اس سے بھر پور انصاف کر لیتا ہوں۔“ شہنیل ملک آگے بڑھا اور اس
 ہاتھوں میں پکڑی ٹرے سے چھ سوپ کا بادل نہایت ہی بے تکلفی سے اٹھا لیا تھا اور بنا کوئی بات کیے سوپ کو جھج
 پینے لگا تھا۔

”مشر شہنیل! انسان میں کچھ میرا بھی کچھ ہوتا ہے چائیں جو آپ میں تو کم از کم بالکل مفقود ہیں۔“ غنوی نے
 ایک لفظ چاکر کہا تھا بلکہ دیکھنے کا انداز بھی دیکھنے کا تھا کہ ابھی ثابت سالم ہی گل جائے گی۔
 ”جیسی دیکھو جہاں کھانے پینے کی بات ہو تو میں بالکل نکلتا نہیں رہتا۔“ سوپ کو حلق میں اٹھانے کے ساتھ ساتھ اس
 ہاتھ چرمی غنوی کو اپنی نظروں کی بھی گرفت میں رکھ لیا تھا۔
 ”اس کا ادراک تو مجھے اچھی طرح سے ہو گیا ہے۔“ بے عزتی کرنے کا وہ کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا

ہاتی تھی۔
 انہی آدھے گھنٹے پہلے ہی اس نے اپنے لیے اسپاسی میکرونی بنائی تھی اس نے بنا کے ٹیبل پر رکھا ہی تھا کہ شہنیل
 ”خوبو سو گھنٹا آیا اور بلا تکلف بنا اس کی اجازت اس کی پلیٹ سے آدھے میکرونی پیا ہے اسے نکال کر کھانے لگا غصہ تو
 بہت آیا لیکن ابھی جو چکن سوپ کی حرکت اس نے کی یہ بے تکلفی اس سے ہضم نہیں ہو رہی تھی
 شہنیل ملک بھی دھڑیل کا سر دھاتھا مجال ہے جو غنوی کی بد مزاجی کا رتی بھر بھی اثر ہوا ہو بلکہ انسا سلوئی اور ثناء ہی اس
 نہانے لگی تھیں۔
 ”ہونہہ۔“ ستواں ناک سیکر کے وہ اس کی طرف سے رخ ہی پھیر گئی جس پر شہنیل ملک ہولے سے ہنس دیا تھا۔

☆.....☆

رمضان آنے میں کوئی ایک ہفتہ رہ گیا تھا، جولی کے درود پوار رنگ روغن، فرنیچر، کرن، کارپٹ، شوپسز گویا ہر شے کو
 ہرے سے چھینچ کیا جا رہا تھا۔ شہکاش ملک نے اس بار اپنا بیڈروم خود ڈیکوریت کر دیا تھا، ماضی میں جو غلطیاں سرزد
 ہیں سو وہیں مگر حال میں وہ ان کی پرچھائی بھی اپنی اور سلوئی کی زندگی پر پڑنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ خوشی کا ایک ایک
 لالوئی کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ اس کی زندگی میں خوشیوں، چاہتوں اور محبتوں کے دیپ روشن کرنا چاہتا تھا، وہ جانتا تھا

وہ ابھی اس سے ناراض ہے مگر وہ ہر صورت اس کو ملنے لگا۔

”سلوٹی بیٹا!“ سلوٹی جو رمضان کے لیے کچن میں استعمال کیے جانے والی چیزوں کی لسٹ بناری تھی، بے کی ہلکی سی پکار پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔

”جی بے بے جان! بولے۔“ اس نے چہرے پر نرم مسکراہٹ سجائی تھی۔

”بچے یہ سب کیا ہے، نہ باتوں میں چوڑی نہ انگلی، نہ کانوں میں جھکے، گلا خالی، حوہلی کی بہویں ایسی نہیں ہیں۔“ بے بے گل کی آنکھوں میں نرمی کا تاثر تھا تو سمجھانے میں مٹھاس، حالانکہ وہ سب جانتی تھیں مگر گزری باتوں کے یا سوچ کر ہی خود کو نہ اذیت میں رکھنا چاہتی تھیں نہ چاہتی تھیں کہ سلوٹی کسی کرب سے گزرے۔ شہکاش ملک آنکھوں میں ٹھنسی مارنا محبت و چاہت کا سمندر بھی وہ دیکھ چکی تھیں۔ سلوٹی کی ناراضی بجا تھی مگر کسی کو تو فاصلہ پانا ضرور

”وہ..... بے بے جان وہ سب الماری میں رکھ دیا تھا میں نے۔“ وہ سر کو جھکا کر دم لہجے میں بولی۔

”چلو کوئی بات نہیں اب اٹھو شاباش جاؤ وہ سب الماری سے نکال کر پہنو۔“

”یہ مجھے وہیں رکھتی ہوں۔“ ان کی باتوں کے دوران ثناء بھی وہاں آکر بیٹھ چکی تھیں۔ بے بے گل کی باتیں کی دل کی باتیں تھیں۔

ثناء نے جڑ اور پین کھینچ کر اس سے لے لیا تھا۔

”جاؤ..... تم۔“

”جی۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی انکا نہیں کر سکتی تھی، دھڑکنے والی سمیت کھڑی ہو گئی ایک ماہ ہو گیا تھا اس کو اپنے شہکاش ملک کے بیڑ روم میں گئے، شہکاش ملک سے جو اس کے ساتھ کیا اچھا نہیں کیا تھا اس لیے وہ دل سے اس کو معاف

کرنے کے موڈ میں نہیں تھی، مگر اس وقت بے بے گل کی کمر کھانسی کھینچ کر گئی۔ شہکاش ملک ڈیرے پر گیا ہوا تھا رات سے پہلے اس کی واپسی ناممکن تھی اور ابھی شام کے چھ بجے وہ جلدی سے اپنی جیولری لے آئے گی۔ چھوٹے

چھوٹے قدموں کو اٹھاتی وہ بیڑ روم کے دروازے پر آٹھری گئی، آہستگی سے کھٹکھٹا کر دروازہ کھولا اور اندر داخل گئی، بیڑ روم کی پوری سیٹنگ ہی چیخ کر دی گئی تھی ہر شے نئی رکھوائی گئی تھی۔ علی گڑ کے بیڑ پر سرخ اور گولڈن پھولوں

والی بیڈ شیٹ بچھائی گئی تھی بیڈ کے برابر میں سائیڈ ٹیبل پر اس کی اور شہکاش کی شادی کی تصویر لگی تھی، گر لے اینڈ ہاٹ امتزاج کے کرنٹ، گرے وینز کا پت گوکہ ہر شے اس کی پسند کے مطابق رکھی گئی تھی۔

”مگر کیا فائدہ اب میرا دل مر چکا ہے ان سب چیزوں سے۔“ تکلیف دہ سوچیں اس کے گرد حصار باندھ گئیں ایک سسکتی ہوئی آہ بھری وہ وارڈ روب کی جانب بڑھی۔ اپنی جیولری ڈھونڈنے میں تھوڑی دقت تو ہونی گھر ل گئی، ایک

ویلوٹ بکس میں اس کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں، سلوٹی نے وہ بکس کھول کر اپنی گولڈ کی چیزیں نکال لی تھیں، اسی اثنا میں کسی نے دروازے کو کھولا تھا سلوٹی نے پلٹ کر دیکھا تو جیسے محسوس ہوا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا ہے اور ابھی

پایلوں کی مضبوط دیوار توڑ کر سینے سے باہر آ جائے گا۔ سامنے شہکاش ملک کھڑا تھا آنکھوں میں ایک جہاں آباد کیے دواز کو تک رہا تھا۔ آج کافی دنوں بعد دشمن جاناں کا دیدار نصیب ہوا تھا ورنہ اس کی موجودگی میں وہ غنڈی کے روم میں رہتی

”زپے نصیب آج دیدار یار توڑ کر سینے سے باہر آ جائے گا۔“ شہکاش نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا اور دروازے کو آہستگی سے بند کر کے لاکڈ لگا دیا۔ سلوٹی کی تو جیسے جان سوئی پر لنگ گئی ہو۔ شہکاش ملک آہستہ آہستہ چلا ہوا سلوٹی کے نزدیک آٹھرا تھا۔

”میں اپنی جیولری لینے آئی تھی۔“ سلوٹی نے بے ساختہ اپنی نظریں چرائیں، جو شہکاش ملک کی زیر نگین ہوں سے چھپی نہیں رہ سکیں۔

ب تک کسی کے روم میں قیام پذیر رہو گی آؤ اور اپنا بیڑ روم اور اپنا شوہر سنبھالو۔“ شہکاش ملک نے گہری نظروں سے دیکھا تھا، اس کے سرخ و سپید ابلے چہرے پر خون کی حدت کی وجہ سے پیش سی ٹھی اور چمکتی دودھیا پیشانی پر کی ٹھنسی بوندیں سی چمک رہی تھیں اور شہکاش ملک کوئی اتنا نادان نہیں تھا جو سلوٹی کی دل کی بدلتی کیفیت غیر ہونی

بات نہ پاتا۔

”جی بے بے جان! بولے۔“ اس نے چہرے پر نرم مسکراہٹ سجائی تھی۔

”بچے یہ سب کیا ہے، نہ باتوں میں چوڑی نہ انگلی، نہ کانوں میں جھکے، گلا خالی، حوہلی کی بہویں ایسی نہیں ہیں۔“ بے بے گل کی آنکھوں میں نرمی کا تاثر تھا تو سمجھانے میں مٹھاس، حالانکہ وہ سب جانتی تھیں مگر گزری باتوں کے یا سوچ کر ہی خود کو نہ اذیت میں رکھنا چاہتی تھیں نہ چاہتی تھیں کہ سلوٹی کسی کرب سے گزرے۔ شہکاش ملک آنکھوں میں ٹھنسی مارنا محبت و چاہت کا سمندر بھی وہ دیکھ چکی تھیں۔ سلوٹی کی ناراضی بجا تھی مگر کسی کو تو فاصلہ پانا ضرور

”وہ..... بے بے جان وہ سب الماری میں رکھ دیا تھا میں نے۔“ وہ سر کو جھکا کر دم لہجے میں بولی۔

”چلو کوئی بات نہیں اب اٹھو شاباش جاؤ وہ سب الماری سے نکال کر پہنو۔“

”یہ مجھے وہیں رکھتی ہوں۔“ ان کی باتوں کے دوران ثناء بھی وہاں آکر بیٹھ چکی تھیں۔ بے بے گل کی باتیں کی دل کی باتیں تھیں۔

ثناء نے جڑ اور پین کھینچ کر اس سے لے لیا تھا۔

”جاؤ..... تم۔“

”جی۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی انکا نہیں کر سکتی تھی، دھڑکنے والی سمیت کھڑی ہو گئی ایک ماہ ہو گیا تھا اس کو اپنے شہکاش ملک کے بیڑ روم میں گئے، شہکاش ملک سے جو اس کے ساتھ کیا اچھا نہیں کیا تھا اس لیے وہ دل سے اس کو معاف

کرنے کے موڈ میں نہیں تھی، مگر اس وقت بے بے گل کی کمر کھانسی کھینچ کر گئی۔ شہکاش ملک ڈیرے پر گیا ہوا تھا رات سے پہلے اس کی واپسی ناممکن تھی اور ابھی شام کے چھ بجے وہ جلدی سے اپنی جیولری لے آئے گی۔ چھوٹے

چھوٹے قدموں کو اٹھاتی وہ بیڑ روم کے دروازے پر آٹھری گئی، آہستگی سے کھٹکھٹا کر دروازہ کھولا اور اندر داخل گئی، بیڑ روم کی پوری سیٹنگ ہی چیخ کر دی گئی تھی ہر شے نئی رکھوائی گئی تھی۔ علی گڑ کے بیڑ پر سرخ اور گولڈن پھولوں

والی بیڈ شیٹ بچھائی گئی تھی بیڈ کے برابر میں سائیڈ ٹیبل پر اس کی اور شہکاش کی شادی کی تصویر لگی تھی، گر لے اینڈ ہاٹ امتزاج کے کرنٹ، گرے وینز کا پت گوکہ ہر شے اس کی پسند کے مطابق رکھی گئی تھی۔

”مگر کیا فائدہ اب میرا دل مر چکا ہے ان سب چیزوں سے۔“ تکلیف دہ سوچیں اس کے گرد حصار باندھ گئیں ایک سسکتی ہوئی آہ بھری وہ وارڈ روب کی جانب بڑھی۔ اپنی جیولری ڈھونڈنے میں تھوڑی دقت تو ہونی گھر ل گئی، ایک

ویلوٹ بکس میں اس کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں، سلوٹی نے وہ بکس کھول کر اپنی گولڈ کی چیزیں نکال لی تھیں، اسی اثنا میں کسی نے دروازے کو کھولا تھا سلوٹی نے پلٹ کر دیکھا تو جیسے محسوس ہوا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا ہے اور ابھی

پایلوں کی مضبوط دیوار توڑ کر سینے سے باہر آ جائے گا۔ سامنے شہکاش ملک کھڑا تھا آنکھوں میں ایک جہاں آباد کیے دواز کو تک رہا تھا۔ آج کافی دنوں بعد دشمن جاناں کا دیدار نصیب ہوا تھا ورنہ اس کی موجودگی میں وہ غنڈی کے روم میں رہتی

”زپے نصیب آج دیدار یار توڑ کر سینے سے باہر آ جائے گا۔“ شہکاش نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا اور دروازے کو آہستگی سے بند کر کے لاکڈ لگا دیا۔ سلوٹی کی تو جیسے جان سوئی پر لنگ گئی ہو۔ شہکاش ملک آہستہ آہستہ چلا ہوا سلوٹی کے نزدیک آٹھرا تھا۔

”میں اپنی جیولری لینے آئی تھی۔“ سلوٹی نے بے ساختہ اپنی نظریں چرائیں، جو شہکاش ملک کی زیر نگین ہوں سے چھپی نہیں رہ سکیں۔

گرفت آزاد کردی۔ سلوی نے موقع غنیمت جانا اور تیزی سے وہاں سے نکلتی چلی گئی تھی، شہکاشہ ملک تادیر اس نکتا چلا گیا تھا۔

☆.....☆

آج جاند نظر آ گیا تھا، کل پہلا روزہ تھا، لیکن میں سلوی اور غنویٰ سحری کی تیاری کر رہی تھیں سب کو ناپسند کو مد نظر رکھتے ہوئے سحری کے لیے ڈشز تیار کیے جارہی تھیں۔ بے گل کو ہلکی سی چپاتی کے ساتھ کباب پسند تھے تو آغا جان کو گیارہ پرت والا پرائیڈ تھا وہ بھی بھنے ہوئے فیے کے ساتھ کھانا اچھا لگتا تھا۔ ملک کو بالکل لاسٹ نوڈ اچھا لگتا تھا اس لیے ایک گلاس دودھ کے ساتھ دو بوائے اٹلے اسی طرح شام اور کے لیے بھی اس نے تیار کر دیا تھا۔

”سلوی“ دودھ بوائے کرتی غنویٰ نے سلوی کو دیکھا۔
”ہاں بولو“ مصروف انداز میں اس کو دیکھا کیونکہ وہ اس وقت شامی کباب تل کر ایک کاٹج کی میں رکھتی جا رہی تھی۔

”میرا خیال ہے یہاں سے دوپور کی کوئی خاص پسند نہیں ہوگی۔“
”مطلب؟“ سلوی نے سچی نظر سے غنویٰ کو دیکھا تھا۔

”مطلب یہ کہ وہ ہڑپوٹے ہر پچھڑپ کر جاتا ہے تو اس کے لیے کوئی خاص ڈش بنانے کی ضرورت ہے۔“ خود ہی کہہ کر خود ہی زور سے ہنس دی۔
”غنویٰ“ سلوی نے تنبیہ نظروں سے اس کو گھرا۔

”تو اور کیا جب دیکھو کچھ نہ کچھ کھا ہی رہا ہوتا ہے ملک ٹھوس ہی رہا ہوتا ہے، میرا نہیں خیال وہ رمضان ایک بھی روزہ رکھے گا۔“ اس نے برز بند کیا اور کاؤنٹر سے ٹک لگا کر کھڑی ہو گئی۔
”تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو۔“

”کیونکہ سلوی بھابی یہ مجھے بہت اچھے سے جانتی ہیں۔“ مسکراتا ہوا لیجان دونوں کی سماعت سے ٹکرا دونوں نے پلٹ کر دیکھا جہاں دروازے پر شہنیل ملک کھڑا دلچسپ نظروں سے غنویٰ کو ٹک رہا تھا۔ غنویٰ مسکراہٹ اس کے لبوں کے حوالے ہی سمٹ کر رہ گئی۔

”ہونہ۔“ غنویٰ نے کھڑی ستواں ناک چڑھا کر اس کی جانب سے رخ ہی پھیر لیا تھا۔ جب کہ سلوی ہلکے سے مسکراتی تھی۔ شہنیل ملک مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا اور ہلے ہوئے چلتا ہوا غنویٰ کے مقابل اٹھ رہا۔
”کیوں میں سچ کہہ رہا ہوں نامس غنویٰ کہ آپ مجھے بہت قریب سے جانتی ہیں۔“ وہ اس کو چھیڑنے لگا تھا، اس کی چیخ پر اور اس کے یوں ڈھٹائی سے پاس آنے پر غنویٰ نے اس کو کھانا جانے والی نظروں سے دیکھا جس کی گہری نظریں اسی کے چہرے کے گرد حصار باندھی ہوئی تھیں۔

”دیکھو زیادہ مجھ سے فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ غنویٰ بھناتی ہوئی اپنی انگشت شہادت اٹھا کر اس کو خنوارنگا ہوں سے دیکھنے لگی۔ وہ سامنے آ جاتا تو جانے کیوں غنویٰ کی ٹس ٹس میں لاداسا دوڑنے لگتا تھا۔

”میرا خیال ہے ابھی وہ وقت نہیں آیا۔“ اس کی ذمہ داری بات نے غنویٰ کو سر تاپا سا لگا کر رکھ دیا تھا۔
”یو!“ غنویٰ کے انداز میں سوچ جھٹلاہٹ اور غصے کی کیفیت نے شہنیل ملک کو بہت مزہ دیا تھا۔
”خادم کو شہنیل ملک کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے اگر آپ چاہیں تو مجھے صرف پیار سے شہزی بلا سکتے

”اس کے تپے تپے چہرے کو بغور نکتاؤ وہ حظ اٹھا رہا تھا۔“

”غل دیکھی ہے اپنی آئینے میں۔“ سلگتے ہوئے ترکا جواب حاضر تھا۔

”تنقید قریب میں آپ کی آنکھوں میں دیکھنے کا ارادہ ہے۔“ غنویٰ کے چہرے اور آنکھوں میں اشتعال،

اور ناراضی کے ملے جلے تاثرات کو نظر انداز کیے وہ اپنی ہی چیخڑ جھاڑ میں لگا ہوا تھا۔

”لیکچر لوں گی تمہیں۔“ غم و غصے کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ سختی سے دونوں ہتھیلیوں کی مٹھی بھینچے

”زی سے وہاں سے نکلتی تھی۔“

”یا اللہ رحم۔“ اس کی جلد بازی اور عجلت میں جانے پر شہنیل ملک اگر تیزی سے پیچھے نہ ہٹا تو تھینا زبردست

”از می تھا۔“

”باز آ جاؤ اپنی ان بچکانہ حرکتوں سے غنویٰ بہت جنگجو قسم کی لڑکی ہے تمہیں چھوڑے گی نہیں۔“

”ان سب کے دوران سلوی جو خالی ان دونوں کی ٹوک جھونک سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ غنویٰ کے جانے

”شہنیل ملک کی کلاس لینے کی تھائی۔“

”تو ڈیر سلوی بھابی آزاد ہونے کی خواہش بھی کس کا فر کو ہے۔“

”ہوں۔“ سلوی نے ”ہوں“ کو کافی لمبا کھینچا حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”لیا جو میں سوچ رہی ہوں ایسا ہی کچھ ہے۔“ خوشی تو اس کو بہت ہوتی تھی۔

”ہی آئی لو ہر۔“ اس نے گما جھک ہی اظہار کر دیا تھا۔

”اور اگر غنویٰ نے انکار کر دیا تو۔“

”خدا کے لیے سلوی بھابی آؤ رہے ہیں۔“ وہ ہلکا سا بے چین ہوا اور اس کی یہ بے چینی دیکھ کر سلوی ہلکے

”ہنس دی۔“

”اگر آپ لوگوں کے مذاکرات ختم ہو گئے ہیں تو سحری کا کچھ انتظام ہے۔“ اچانک سے گھمبیر اور بھاری

”نے ان دو کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی تھی، سلوی شہکاشہ ملک کی بھاری آواز پر پلٹ کر ضرور دیکھا مگر

”نادورانیہ چند لمحوں کا تھا، وہ کیبنٹ کی جانب بڑھی اور کاٹج کے برقی نکالنے لگی، شہکاشہ ملک کو اس طرح نظر

”آ گیا جیسے وہ یہاں سے ہی نہیں، البتہ شہنیل ملک کباب کی پلٹ لٹکاتے بھاری کی جانب بڑھ گیا تھا، شہکاشہ

”ایک خاموش نظر اس کے وجود پر ڈال کر رہ گیا۔“

☆.....☆

”کیا سوچ رہی ہیں میراں۔“ بے بے گل کسی بہت گہری سوچ میں غلطاں تھیں جہی آغا جان ہاتھ میں تینج

”ہاں چلے آئے تھے۔“

”یہی کہ یہ پہلا رمضان ہے جس میں کشمالہ اور رانی گل ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔“

وہ ایک ماں تھیں اپنی ساری اولادوں کے لیے ان کی محبت یکساں اور بے لوث ہوتی ہے۔ رانی گل اور

”مالہ نے بے شک جو سنگین غلطی کی تھی اس میں معافی اور درگزر کی کوئی گنجائش تو نہیں نکلتی مگر تھیں تو وہ ان کے

”کا حصہ کشمالہ کی خواہش اگر شہکاشہ ملک تھا تو اس میں کوئی برائی نہیں تھی مگر شہکاشہ ملک کو پانے اس کو حاصل

”نے کے جنون میں وہ بالکل اندھی ہو چکی تھی۔“

”رانی گل اور کشمالہ کا یہاں حویلی سے جانے کا اپنا خود کا فیصلہ تھا، ہم نے روکنے کی کوشش تو کی مگر اپنی غلطی

کی نشینی کا احساس انہیں جو یہ تھا اور اُس سوچا جائے تو اسی میں ہم سب کی بھلائی اور اچھائی ہے اور یہی شکر ملک اور سلوٹی بیٹی کی زندگی کے لیے بہتر ہے۔“ آغا جان نے نہایت سہولت سے ان کو سمجھایا تھا۔

”انشاء اللہ، آغا صاحب۔“ بے بے گل نے صدقِ دل سے اپنی بیٹی اور نو اسی کے لیے دعا کی تھی۔

”ارے جیتی رہیے خوش رہیے، سچی افطاری کے بعد گرم گرم سبز پنیر“

”مجھے تو برا آجائے گا۔ ایسا کہ جس سے تم کو کچھ نہ ہو۔“

اچھا یہ بھائی عطاء بین، سوئی اور بھریں سی کا عید کا پہلا دن میسا رہے گا۔ اے جان کے سب سے
انک سے لہا تھا۔

”تو بس ٹھیک ہے عید کے ساتھ ساتھ غنومی اور شہریل کی منگنی کی بھی تیاری شروع

دستک دے رہی تھیں۔

☆.....☆

شہر علی ملک کی فاعل میں بڑی تھا، شہر علی ملک اور شہکاشہ ملک کو باہر ممالک سے بہت بڑا ٹینڈر ملا۔

کی جس کی پیہر میں بی بی کی۔ وہ یہ کہ شاہ ملک کو لوگوں نے لے لیے فوج اٹھا ہی رہا تھا کہ کسی نے نہایت جارحانہ انداز میں اس کے بندوں کا دروازہ کھٹکھٹایا اور شہنشاہ ملک آتے ہوئے دیکھ کر بھیبتا ہوا کہ کون

”ہاؤڈیز یو۔“ تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھ سے منگنی کے لیے حامی بھرنے کی۔“ اس جنگجو سی

نہیں تھا۔

”مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سنی، تم سیدھے شرافت کے دائرے میں آ کر آغا جان کو منع کرو کہ تمہیں

”اوئے تم چاہی ہو یہ سبکی نہ ہو۔“ شہزاد ملک نے آہستگی سے اس سے اپنا سر بیان چھڑایا مگر ہاتھ

’چلو ٹھک سے تم مجھے کوئی آنک وصہ بتاؤ۔‘

’چلو بھیک ہے ہم مجھے کوئی ایک وجہ بتا دو میں انکار کر دوں گا۔‘

”یہ میچ کم نہیں کہ تمہارے بھائی شہکشاہ ملک نے سلوٹی کے ساتھ کسی قدر ناروا سلوک رکھا۔“

شاید غلط میری جان پر دھیان نہیں دیا تھا ورنہ پھر اس کی شامت آجانی تھی۔

باجل بھی نہیں جیسے پتا ہے ہم سلووی بھابی کا پاسنہ ہی نہیں جو اس بار سب میری ملک سے بہت سے

”تمہیں تو بتا ہے کہ آج کل سموٹی بھائی اور شہکاشہ بھی بائیں مارا خسی چل رہی ہے۔“

ان سفونی کے ساتھ جو چھ انہوں نے کیا ہے وہ کوئی اخلاقیات کے زمرے میں نہیں آتا۔“ پھر کتنا نکمرا جواب

”اے اوکے مگر اب حقیقت اور سچائی یہی ہے کہ شہکاشہ بھایا، سلوٹی بھابی سے نہ صرف بے حد محبت کرتے

”تو ان سب میں سے کسی کو کیا مرستی ہوں۔“ اس کے ہجے میں جھجھکا ہٹ بھی، وہ مجھ میں پارہی سی کہ احرا اس کی

”وٹھیک ہے میں ہی بتا دیتا ہوں وہ کہہ رہی ہیں کہ وہ بھی راحیل انکل اور شہناز آئی کے ساتھ واپس جائیں۔“

میں ہمیشہ کے لیے رہنے لگیں کہ ہلکے وہ شہکاشہ بھایا لومعاف بنی لڑیں گی۔ اس نے جلدی سے یہ جھوٹ

یہ بیبیات ہوں علوی ایسے یے سرنی ہے، ہر بابی کا بوا میں بن سرائ ہوں بیبا۔ اس کے دھرم کے

اس..... اس..... بھری..... کی بوسہ لیا تو یہ وہ بولا اچھا بس پرسوں اس کی تصویر بنائیں رہی۔

نہیں تو یہاں تک کہ وہ اس کو اس کی ساری ساری دنیا سے الگ کر دے۔

”باب بولو غنمی! سب خیریت تو ہے تا تم اتنی غصے میں کیوں ہو۔“ وہ اپنا کام چھوڑ کر اس کو دیکھنے لگی۔

”نوں شہر میں؟“

”بات کیا ہوئی پھر سے بھٹرا ہو کیا کیا؟“ سلوی نے اس کے انداز اس کے چہرے اور اگھوں سے یہی اخذ کیا۔

نہ پھر سے کوئی لڑائی ہوگئی ہے۔

”وہ کیا؟“ سلوی نے پوچھا۔
 ”یہی کہ حسین اور خوب صورت لڑکیوں کے پاس عقل نامی شے نہیں ہوتی۔“ وہ شریر لہجے میں بولتا ہوا
 سے مسکرا دیا۔
 ”کیا؟“ سلوی نے گھور کر دیکھا تو وہ مزید ہنستا ہوا باہر کی جانب نکلتا چلا گیا۔
 ”پاکل۔“ سلوی کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی اور لٹی میں ادھر ادھر گردن ہلائی ایسا ادھر کا کام نہانے لگی جو وہ
 ”لوٹوں کے آنے سے پہلے کر رہی تھی۔ اپنے شدہ کپڑوں کو دارڈروب میں رکھنے لگی تھی۔“
 ☆.....☆

”آغا خان۔“
 ”جی بیٹا بولو!“ آغا خان جو فرحت عباس شاہ کو پڑھ رہے تھے شہکاشہ ملک کی پکار پر اس کو دیکھنے لگے تھے
 ”ہاں ہاں میں کوئی نیوز پیپر تھا۔“
 ”یہ دیکھئے۔“ شہکاشہ ملک نے وہ نیوز پیپر ان کے آگے بڑھایا جسے آغا جان سوالیہ نظروں سے دیکھنے کے
 ہاتھ میں پکڑی بک سائیڈ میں رکھی اور شہکاشہ ملک کے بڑھے ہوئے ہاتھ میں پکڑا نیوز پیپر زتھام لیا تھا، آغا
 جان نے وہ نیوز پیپر نکال کر دیکھا اور جو سخی سامنے تھی دل کو دھچکا اور دھکا تو زبردست لگا تھا۔ خبر ہی کچھ ایسی
 ”شراب کے نشے میں دھت شمشیر خان گاڑی چلاتے وقت جان بحق۔ ایکسڈنٹ میں چہرہ اور جسم بالکل
 تباہ کر رہ گیا۔“
 ”شہکاشہ۔“ ان کے لہجے میں لیا تھا وہ غور ہی نہیں جان پائے۔
 ”یہ سچ ہے؟“ آغا جان۔“
 ”کیا سچ ہے؟“ اسی اثناء میں بے بے گل بھی اندر داخل ہوئی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں غنوی کا منگنی کا جوڑا
 ”باری بھی جوہ آغا جان کو دکھانے کے لیے لائی تھیں۔“ انہوں نے وہ نیوز پیپر بے بے گل کے آگے بڑھایا۔ بے بے گل نے منگنی کا جوڑا
 ”آپ بھی پڑھ لیں۔“ انہوں نے بعد وہ نیوز پیپر زتھام لیا تھا۔
 ”باری بائیس بیڈ پر آ سکی سے رکھنے کے بعد وہ نیوز پیپر زتھام لیا تھا۔“
 ”چلو جی جس تم جہاں پاک۔“ بے بے گل کو تو اس کے مرنے سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا البتہ دلی خوشی اور فانی

اور ضرور ملتا تھا۔
 ”سچ کہتی ہیں آپ، مکافات عمل اسی کو کہتے ہیں، انسانی جرم کر کے گناہ کر کے بھول جاتا ہے وہ سمجھتا ہے کسی
 انہی زندگی کی دور وہ اس کی سانسوں سے اگر چھین لے گا تو اس کا کوئی حساب و کتاب نہیں ہوگا مگر درحقیقت تو
 ہے کہ ہم سب کی زندگیوں کی ڈور ایک ہی کے ہاتھ میں ہے جس کی نظروں سے ہمارا کوئی عمل، فعل پوشیدہ نہیں
 ہے۔ وہ جو ہم سب کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ وہ سب جانتا ہے اس کو سب خبر ہے۔ اس لیے جرم
 نے والے کو ایک موقع دیتا ہے اس کی رسی ڈھکی بھی چھوڑتا ہے لیکن جب وہ نہیں سدھرتا اپنے گناہوں سے
 نہیں آتا تو وہی ہم سب کا پروردگار ایک جھگٹے میں ہماری زندگی کی ڈور کھینچ لیتا ہے اور اس گناہ گار کو وہ اذیت
 اب موت دیتا ہے جو ہم سب کے لیے عبرت کا نشان بن جاتا ہے۔“ آغا جان نے نرم لہجے میں کہتے ہوئے بے
 بے گل سے وہ نیوز پیپر لیا اور شمشیر کے رخ چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے نیوز پیپر کو لیٹ کر رکھ کر ایک

”تم پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ یہ کیا بودی سی شرط لگائی ہے تم نے کہ اگر میں تمہارے اس دیور سے منگنی نہیں کر
 گی تو تم شہکاشہ بھایا کو معاف نہیں کرو گی بلکہ ہمارے ساتھ شہر چلو گی۔“ اس کے لہجے میں ناراضی کے واضح
 تھے۔

”میں نے ایسا۔۔۔۔۔ اور اس سے پہلے کہ سلوی سچ اگل دیتی اس کی نظر غنوی کی پشت پر دروازے کے
 کھڑے شہزیل ملک پر پڑی جو دونوں ہاتھ جوڑے مدد طلب نظروں سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ سلوی جس
 سارے اعصاب اس بات سے جھنجھلا کر رہ گئے تھے یکدم سے ڈھیلے پڑ گئے اس کی ساری بات سمجھ میں
 تھی۔

”مجھے پتا تھا تم ایسی کوئی فضول گوئی کر ہی نہیں سکتی ہو یہ سب اس جنگلی کی ذہنی اختراع ہے۔“ غنوی
 آنکھوں میں شہزیل ملک کے لیے مزید غصہ بھر گیا۔
 ”نہیں غنوی! شہزیل نے جو کچھ کہا وہ سب سچ ہے۔“ سلوی نے پہلے شہزیل ملک کو گھورا پھر غنوی کو دیکھا
 لگی۔

”واٹ۔“ غنوی کو اپنی ساعت پر یقین نہیں آیا تھا۔
 ”دیکھو غنوی! تم جانتی ہو میں کس مزاج کی ہوں نہایت ہی ڈر پوک اور دوسری لیکن اگر تم ساتھ رہو گی
 شہکاشہ سے مقابلے کی ہمت پکڑی رہے گی وہ مجھے کچھ نہیں کہہ پائیں گے۔“ بے چارگی اور معصومانہ شکل بنا
 وہ غنوی کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔
 ”ابھی تک جو کچھ میرے ساتھ شہکاشہ نے کیا، کیا اگر تم ہوتیں تو میرے ساتھ ایسی نا انصافی ایسی زیادتی
 پاتی۔“

”قطع نہیں، میں اینٹ سے اینٹ بجادیتی ہوں۔“ شہکاشہ صاف کرتی جناب شہکاشہ بھایا کی کہ کبھی تم
 نظر بھی تم پڑا لے کی کوشش نہیں کرتے۔“ بہن کی محبت کلمہ ہے جو سچ مارنے لگی۔
 ”تو کیا گاڑی ہے وہ آگے میرے ساتھ برابر تاؤ غلط سلوک نہیں کریں گے۔“
 ”ایسے کیسے اب کچھ کر کے تو دکھائیں اچھی طرح منٹ لوں گی۔“ غنوی نے لہجے میں بولی۔
 ”تو پھر تم راضی ہونا؟“ سلوی کے لہجے میں خوشی کے رنگ تھے۔ تمہاری خاطر میں اس منگنی کے لیے جا
 بھر رہی ہوں ورنہ دنیا کا وہ کوئی آخری لڑکا بھی ہوتا تا تو بھی وہ میری چواں نہیں ہوتا۔ اس کو سلوی پر ترس آ
 تھا۔ وہ ہمیشہ سے اس کی ڈھال بنتی آتی تھی اس بار بھلا کیسے اکیلا چھوڑ دے۔
 ”اوہ مائی کیوٹ سسٹر!“ فرط جذبات سے وہ غنوی کے گلے سے لگی تھی۔

”اچھا اب چھوڑ دو۔“ وہ اس سے الگ ہوئی۔
 ”مما میرے لیے منگنی کا سوٹ لے کر آتی ہیں وہ ذرا دیکھ کر آتی ہوں۔“ غنوی اس سے الگ ہو کر با
 جانے والے راستے کی جانب بڑھی مگر اس سے پہلے ہی شہزیل ملک تیزی سے دیوار کی آڑ میں ہوا تھا، کہیں غنوی
 دیکھ نہ لے، اس کے جانے کے بعد وہ اندر آیا۔
 ”بھینکس بھینکس سلوی بھائی آئی پراؤ ڈ آف ہو۔“ شہزیل ملک کے چہرے اور آنکھوں میں خوشیوں
 چاہتوں کی برأت اتری ہوئی تھی۔ سلوی کو اتنی خوشی ہوئی تھی وہ ہلکے سے مسکرا دی۔
 ”ویسے بھائی ابھی تک سنا تھا آج دیکھ بھی لیا۔“

نہی آہ بھر کے شبہ کا شہ ملک کو دیکھا۔

”ششیر نے جو کچھ کیا اس کو اس کے کیے کی سزا مل چکی ہے دنیا میں تو اس نے اپنے کرموں کی سزا مل رہی ہے۔“
 ”تیرے میں اس کا کیا حساب و کتاب ہوگا یہ بھی اللہ اور اس کا معاملہ ہے۔ ہم تو صرف مغفرت کے حق میں ہیں۔“

”خیر اب ان سب باتوں کو چھوڑئے اور یہ دیکھئے غنوی بیٹی کا منگنی کا جوڑا اور گولڈن کی چوڑی۔“ بے بے
 ششیر نے ڈراپچیا نہیں لک رہا تھا، اس نے انہوں نے آغا جان کو ڈوکتے ہوئے وائٹ اینڈ گولڈن اجڑا
 اٹھا۔ وہی ٹائٹل ٹیوں اور وہ سب سے مزین فرائگ کھول کے دکھائی۔

”ماشاء اللہ بہت خوب صورت ہے۔“ آغا جان نے بے ساختہ لہجے میں کہا۔

”جی بے بے جان! واقعی آپ کی پسند لا جواب ہے۔“ شبہ کا شہ ملک کو بھی بہت پسند آئی تھی۔

”میراں۔“ آغا جان نے شبہ کا شہ ملک کو ایک نظر دیکھنے کے بعد بے بے گل کو دیکھا۔

”جی آغا صاحب!“ بے بے سے مصروفیت بھرت انداز میں کہا۔ ”کیونکہ وہ اب چوڑی باکس کھول رہی تھیں
 ”غنوی کے لیے تو ماشاء اللہ بہت خوب صورت سوٹ لائی ہیں، ہمیں بہت خوشی بھی ہوئی ہے۔“

”تو کیا ہم جان سکتے ہیں ہماری سلوی کے لیے کیا لائی ہیں آپ۔“

”آغا صاحب آپ کو کوئی شک ہے کہ میں اپنی سلوی بیٹی کو بھول سکتی ہوں۔“ بے بے گل دھیرے سے
 مسکرائیں بلکہ ان سے سوال کیا تھا۔

”قطعاً نہیں۔“ انہوں نے تیزی سے نفی میں ادھر ادھر گردن ہلائی۔

”تو بس آپ بے فکر ہیں، اب آگے سارا معاملہ شبہ کا شہ اور سلوی کا ہے۔“ بے بے گل کے چہرے اور
 آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی۔

”اوہ۔“ انہوں نے ”اوہ“ کو لمبا کھینچتے ہوئے شہر مسکراہٹ لیے پاس کھڑے شبہ کا شہ ملک کو دیکھا،
 چہرے کو جھکائے عنابی لہجوں پر مسکراہٹ سجائے سر کھجائے لگا تھا۔

”برخوردار تم تو بہت گئے شک۔“ آغا جان نے چابختی نظروں سے اس کو دیکھا۔
 ”اب آپ زیادہ جھگمت کریں میرے بچے کو دو دن بعد عید ہے اور شبہ کا شہ کے پاس صرف دو دن ہیں۔“

”جی۔“ وہ بے بے سے مسکرا دیا۔

”تو بیاں رک کر تاہم کیوں ضائع کر رہے ہو، جاؤ مٹاؤ ہماری سلوی بیٹی کو۔“

”جی۔“ وہ بے بے سے مسکرا دیا۔

”لائیں آپ تو دکھائیں چوڑی۔“ بے بے گل نے چوڑی باکس کھول کے آغا جان کو تنہا کیا۔

سلوی بچن میں انٹاری کی تیاری کر رہی تھی تقریباً سب کچھ تیار ہو گیا تھا۔

”ہو سکتا ہے آج عید کا چاند بھی نظر آجائے آج چاند رات ہو جائے۔“ پورے 9 روزے گزر گئے تھے مگر
 شبہ کا شہ ملک نے ایک بھی بار اس سے دوبارہ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی نہ ہی کوئی ایسی حرکت کی کہ وہ
 زنج، کوئی چڑنی، نہایت سکون سے گزرا تھا یہ تاہم اس کا گردل میں کہیں نہ کہیں ایک آس بھی امید کے دیئے روشن
 کیے وہ بچو انتظار تھی کہ شاید اب وہ آئے گا اس کو منائے گا۔ بے شک سلوی کے خیر میں خدا اور انام کی کوئی چیز

”وہ کیا؟“ سلوی نے پوچھا۔

”یہی کہ حسین اور خوب صورت لڑکیوں کے پاس عقل نامی شے نہیں ہوتی۔“ وہ شریر لہجے میں بولتا ہوا
 سے مسکرا دیا۔

”کیا؟“ سلوی نے گھور کے دیکھا تو وہ مزید ہنستا ہوا باہر کی جانب نکلتا چلا گیا۔

”پاک۔“ سلوی کے لبوں پر مسکراہٹ بکھرنی اور نفی میں ادھر ادھر گردن ہلائی اپنا ادھورا کام منہانے لگی جو وہ
 ان کے آنے سے پہلے کر رہی تھی۔ اپنے تہ شدہ کپڑوں کو وارڈروب میں رکھنے لگی تھی۔

”آغا خان۔“

”جی بیٹا بولا۔“ آغا خان جو فرحت عباس شاہ کو پڑھ رہے تھے شبہ کا شہ ملک کی پکار پر اس کو دیکھنے لگے تھے
 بے بے گل میں کوئی نیوز پیپر نہ تھا۔

”دیکھئے۔“ شبہ کا شہ ملک نے وہ نیوز پیپر ان کے آگے بڑھایا جسے آغا جان سوالیہ نظروں سے دیکھنے کے
 تھے۔ یہ نیوز پیپر ایک سائینڈ میں رچی اور شبہ کا شہ ملک کے بڑے ہوئے ہاتھ میں پکڑا نیوز پیپر زخمیام لیا تھا، آغا

خان نے وہ نیوز پیپر کھول کے دیکھا اور جو سرنی سامنے تھی دل کو دھچکا اور دھکا تو زبردست لگا تھا۔ خبری کچھ ایسی
 ”شراب کے نشے میں دھت ششیر خان کا ٹری چلا تے وقت جان بحق۔ ایک سیڈنٹ میں چہرہ اور جسم بالکل

”اوہ سر رہ گیا۔“

”شبہ کا شہ۔“ ان کے لہجے میں کیا تھا وہ خود ہی نہیں جان پائے۔

”یہ سچ ہے آغا جان۔“

”کیا سچ ہے؟“ اسی اثناء میں بے بے گل بھی اندر داخل ہوئی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں غنوی کا منگنی کا جوڑا
 چوڑی تھی جو وہ آغا جان کو دکھانے کے لیے لائی تھیں۔

”آپ بھی پڑھ لیں۔“ انہوں نے وہ نیوز پیپر بے بے گل کے آگے بڑھایا۔ بے بے گل نے منگنی کا جوڑا
 چوڑی باکس میں پڑا ہستی سے رکھنے کے بعد وہ نیوز پیپر زخمیام لیا تھا۔

”چوچو جس کم جہاں پاک۔“ بے بے گل کو تو اس کے مرنے سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا البتہ وہی خوشی اور ذہنی
 ”خیر اور ملا تھا۔“

”سچ بتی ہیں آپ، مکافات عمل اسی کو کہتے ہیں، انسانی جرم کے گناہ کر کے بھول جاتا ہے وہ سمجھتا ہے کسی
 نہ ہی زندگی کی ذور وہ اس کی سانسوں سے اُتر چھین لے گا تو اس کا کوئی حساب و کتاب نہیں ہوگا مگر حقیقت تو

یہ کہ ہم سب کی زندگیوں کی ذور ایک ہی کے ہاتھ میں ہے جس کی نظروں سے ہمارا کوئی عمل، فعل پوشیدہ نہیں
 ہے۔ وہ جو ہم سب کی شبہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ وہ سب جانتا ہے اس کو سب خبر ہے۔ اس لیے جرم

نے والے کو ایک موقع دیتا ہے اس کی رسی ڈھیلی بھی چھوڑتا ہے لیکن جب وہ نہیں سدھرتا اپنے گناہوں سے
 نہیں آتا تو وہی ہم سب کا پروردگار ایک جھٹکنے میں ہماری زندگی کی ذور کھینچ لیتا ہے اور اس گناہ کا رکو وہ اذیت

موت دیتا ہے جو ہم سب کے لیے عبرت کا نشان بن جاتا ہے۔“ آغا جان نے نرم لہجے میں کہتے ہوئے بے
 بے گل سے وہ نیوز پیپر لیا اور ششیر کے رخ چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے نیوز پیپر کو پلیٹ کے سائینڈ پر رکھ کر ایک

نہیں تھی مگر جو کچھ شہکاشہ ملک نے اس کے ساتھ کیا بے شک وہ ناقابل معافی تھا مگر ان کے درمیان جو محرم رشتہ تھا اس میں زیادہ دن کی دوریاں اور فاصلے بڑھادی ہیں۔ دن کے اجالے میں وہ لمحے بھر کے لیے بھلے ہی سب کچھ بھول جاتی کیونکہ اس کے پاس ثناء، غنوی بے بے جان، آغا جان سب ہوئے مگر رات کی تنہائی میں کیا کوئی جو اس کے ارد گرد گہرے سناٹے کے ساتھ گھپ اندھیرے کا بھی اس کے وجود پر راج رہتا، وہ اپنی زندگی کے بارے میں سوچتی کہ وہ اتنی اکیلی اتنی تنہا تھی۔ ابھی سب سوچوں کے تانے بانوں میں الجھی تھی کہ پتا ہی نہیں چلا کب کچن میں شہکاشہ ملک آگیا۔

شہکاشہ ملک نے کچھ بھی بولے بغیر اس کی نازک سرمریں کلائی تھامی اور اپنے ساتھ لیتا ہوا کچن سے نکلتا چلا گیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ شہکاشہ ملک کے ہمراہ اس کے بیڈروم میں تھی، سلوئی نے بے یقین نظروں سے اس کو دیکھا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولنے والی تھی کہ شہکاشہ ملک نے اس کے شکر فی ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔

”دشش.....“ اور پھر بیڈ سے وہ شاہراہ کے سلوئی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”اگر آج شاید چاند رات ہو جائے اور کل عید، جتنے بھی گلے شکوے ناراضی، غصہ، اشتعال جو بھی ہے تمہارے اندر میرے لیے وہ سب جائز ہے۔ جس کے لیے میں بہت شرمندہ اور نادم ہوں میری سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ میں نے ہمیشہ رانی پچھو کی نظروں سے دیکھا وہی سوچا جو انہوں نے کہا کراہ میں تھک چکا ہوں، میرے دل پر تمہاری محبت کی جو دستک تھی وہ میں بھی سن ہی نہیں سکا، تم نے تمہاری چاہت بھری محبت سے بگاڑنا اپنے انتقام میں جیسا کہ انداز آخر میں جو میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی پتہ نہیں اس کا بوجھ کیسے میرے دل سے اترے گا۔ معافی تملانی کے وہ لفظ میرے پاس نہیں ہیں جو تم سے مانگ سکوں لیکن ہرگز رتے دن ہرگز رتے لمحوں میں، میں یہ بات ثابت کر دوں گا کہ میری محبت میں تم بھی کوئی کمی نہیں پاؤ گی۔“ شہکاشہ ملک نے بغور ان گلابی آنکھوں میں تادریک جھانکنا تھا، جہاں کی سی ابھرنے لگی تھی۔

”میں آگے مزید کچھ کہہ کر تمہیں دکھائیں دینا چاہتا ہوں گلے کا انتظار کروں گا اگر تم نے میرا یہ دیا ہوا جوڑا پہن لیا تو میں سمجھ جاؤں گا میری آزمائش میرا امتحان ختم ہو گیا۔“

آگے مزید کچھ کہے وہ بیڈروم سے نکلتا چلا گیا، اس کے جانے کے بعد اس کی غیر موجودگی کا احساس شدت سے ہوا تھا، ان گلابی آنکھوں سے دو موتی ٹوٹ کر اس کے رخسار پر بہتے چلے گئے۔

☆.....☆

اسکائی بلیو اینڈ بلیو امتزاج کے چار جٹ کے ایمر اینڈری فینسی سوٹ میں اس کی پہلی رات کھل رہی تھی، بے بے جان نے رات کو ہی ایکسپٹ پویشن سے اس کے ہاتھوں پیروں پر مہمند گواہی تھی، قد آدم آئینے میں کھڑی وہ خود کو دیکھ رہی تھی یہی سوٹ گل اس کو شہکاشہ ملک دے گیا تھا جو اس نے آج عید کے دن اپنے نازک سراپے پر سجایا تھا، آج وہ بالخصوص شہکاشہ ملک کے لیے تیار ہوئی تھی دل سے ہر غلطی گلے و شکوے ناراضی وغصہ بھلا کے وہ اس کی طرف بڑھے گی، ہر بخش ختم کر دے گی، آج ہر آزمائش کا آخری دن ہے جانے دو چوں کا دھارا اور کہاں تک بہتا جب ہی کسی نے پیچھے سے اس کو پکڑا تھا۔

”یو آر سو سو بیوٹی فل۔“ سلوئی نے چونک کر آئینے میں اپنے پیچھے کھڑے عکس کو دیکھا جہاں غنوی پورے انتہام سے اس کو تھامے کھڑی تھی۔ سلوئی کے چہرے اور آنکھوں میں مسکراہٹ اور خوشیوں کے دیپ جل اٹھے۔

”ماشاء اللہ! اللہ ہر بری نظر سے بچائے رکھے میری بہن کو۔“ سلوئی پلٹ کر اس کو دیکھنے لگی۔ گولڈن اور

لبی آہ بھر کے شہکاشہ ملک کو دیکھا۔

”شمشیر نے جو کچھ کیا اس کو اس کے کیے کی سزا مل چکی ہے دنیا میں تو اس نے اپنے کرموں کی سزا پائی مگر روزِ محشر، قبر میں اس کا کیا حساب و کتاب ہوگا یہ بھی اللہ اور اس کا معاملہ ہے۔ ہم تو صرف مغفرت کے لیے دعا ہی کر سکتے ہیں۔“

”خیر اب ان سب باتوں کو چھوڑیے اور یہ دیکھئے غنوی بیٹی کا منگنی کا جوڑا اور گولڈ کی جیولری۔“ بے بے گل کو: شمشیر کا ذکر اچھا نہیں لگ رہا تھا، اس لیے انہوں نے آغا جان کو ٹوکتے ہوئے وائٹ اینڈ گولڈن امتزاج کی اٹھارہ گلی والی فلنگوں اور دیکے سے مزین فرائک کھول کے دکھائی۔

”ماشاء اللہ بہت خوب صورت ہے۔“ آغا جان نے بے ساختہ لہجے میں کہا۔

”جی بے جان! واقعی آپ کی پسند لا جواب ہے۔“ شہکاشہ ملک کو بھی بہت چہرہ آئی تھی۔

”میرا۔“ آغا جان نے شہکاشہ ملک کو ایک نظر دیکھنے کے بعد بے بے گل کو دیکھا۔

”جی آغا صاحب!“ ہلکے سے مصروفیت بھرے انداز میں کہا۔ کیونکہ وہ اب جیولری باکس کھول رہی تھیں۔

”غنوی کے لیے تو ماشاء اللہ بہت خوب صورت سوٹ لائی ہیں، ہمیں بہت خوشی بھی ہوئی ہے۔“

”تو کیا ہم جان سکتے ہیں ہماری سلوئی کے لیے کیا لائی ہیں آپ۔“

”آغا صاحب آپ کو کوئی شک ہے کہ میں اپنی سلوئی بیٹی کو بھول سکتی ہوں۔“ بے بے گل دھیرے سے مسکرائیں بلکہ التانان سے سوال کیا تھا۔

”قطعی نہیں۔“ انہوں نے تیزی سے نفی میں دھڑا دھڑا گردن ہلائی۔

”تو میں آپ بے فکر رہیں، اب آگے سارا معاملہ شہکاشہ اور سلوئی کا ہے۔“ بے بے گل کے چہرے اور آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی۔

”اوہ۔“ انہوں نے ”اوہ“ کو لمبا کھینچتے ہوئے شہکاشہ کو اس کے پاس کھڑے شہکاشہ ملک کو دیکھا، جو چہرے کو جھکائے عنابی لبوں پر مسکراہٹ سجائے سر کھانے لگا تھا۔

”برخوردار تم تو بہت گھنے نکلے۔“ آغا جان نے جاچتی نظروں سے اس کو دیکھا۔

”اب آپ زیادہ تنگ مت کریں میرے بچے کو دو دن بعد عید ہے اور شہکاشہ کے پاس صرف دو دن بچے ہیں۔“

”تو یہاں رک کر ٹائم کیوں ضائع کر رہے ہو، جاؤ مٹاؤ ہماری سلوئی بیٹی کو۔“

”جی۔“ وہ ہلکے سے مسکرایا۔

”لائیں آپ تو دکھائیں جیولری۔“ بے بے گل نے جیولری باکس کھول کے آغا جان کو تھمایا۔

☆.....☆

سلوئی کچن میں افطاری کی تیاری کر رہی تھی تقریباً سب کچھ تیار ہو گیا تھا۔

”ہوسکتا ہے آج عید کا چاند بھی نظر آجائے آج چاند رات ہو جائے۔“ پورے 9 روزے گزر گئے تھے مگر شہکاشہ ملک نے ایک بھی بار اس سے دوبارہ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی نہ ہی کوئی ایسی حرکت کی کہ وہ زچ ہوتی چڑتی، نہایت سکون سے گزارا تھا یہ ٹائم اس کا مگر دل میں کہیں نہ کہیں ایک آس بھی امید کے دیے روشن کیے وہ جو انتظار تھی کہ شاید اب وہ آئے گا اس کو مٹائے گا۔ بے شک سلوئی کے خمیر میں ضد اور اتانانام کی کوئی چیز



تبت ٹالکم پاؤڈر

اب 3 نئی خوشبوؤں میں دستیاب



کلاسیک



سلیکٹ



لکڑی

تبت ٹالکم پاؤڈر - صبح سے شام پہنچے پہنچے

آف وائٹ فل فینسی اٹھارہ کئی کی فراک پہنے نہیں گئے اس روپ میں بہت حسین لگ رہی تھی۔
”مجھے تو کتا ہے شہر میں آج منگنی کے بھائے ڈائریکٹ نکاح کی ہی خدمت کر بیٹھے۔“ سلوئی نے دلچسپ نظروں سے اس کے سندر چہرے کو دیکھتے ہوئے شرارت سے کہا تھا۔
”اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔“ غنوی کے سچے میں شرمیں سی مسکراہٹ تھی۔
”اوسے ہوئے۔“ سلوئی پر تو جیسے حیرتوں کے پہاڑی ٹوٹ پڑے تھے۔
”یہ ایک رات میں کیا کہنی ہوئی کہ مری شہزادہ ملک کی دیوانی ہوئی۔“ سلوئی نے سر و شانہ انداز میں شہنشاہ اس کو چھیڑا تھا۔
”یہ شہزادہ ملک کا جو ہے سلوئی بھابی، سر چڑکے بولے گا۔“ کیدم سے آتی شہزادہ ملک کی آواز پر دونوں نے دروازے کی سمت دیکھا تھا۔
وائٹ لٹھے کے شلوار کرتے پر گولڈن واسکٹ میں شہزادہ ملک حسن و وجاہت کا پیکر لگ رہا تھا، سلوئی نے دل ہی دل میں دونوں کی نظر اتاری تھی۔
”یا ہر سب انتظار کر رہے ہیں اور تم لوگ یہاں ہو۔“ لالہ رخ ان لوگوں کو ڈھونڈتی ہوئی یہاں تک آگئی تھی۔
”بس رخ بھابی ہم تیار ہو گئے، چلو غنوی۔“ سلوئی نے اس کو اپنے گھیرے میں لیا۔
”سلوئی بھابی! بیوں مجھے معصوم کی بددعا میں سمیٹتی ہیں۔“ انداز نہایت معصومانہ تھا۔
”کیا مطلب ہے۔“ سلوئی نے سوالیہ نظروں سے دیکھا اور یہی حال لالہ رخ کا بھی تھا۔
”مطلب یہ میری بھولی بھابی کہ جس کا کام اسی کو کرنے دیں۔“ وہ چلتا ہوا آیا اور سلوئی کا ہاتھ غنوی کے کندھے سے آہستگی سے بٹایا اور اپنا چوڑا بازو اس کے گرد جاکن کر دیا۔
”تو بے بے شرمی کے سارے ریکارڈ توڑے ہوئے ہیں آج اپنی منگنی کے دن تو اپنی بے شرمی کو تالا لگا دو۔“ لالہ رخ برجستہ بولی تھیں۔
”جی نہیں آج کا دن تو بہت اہم ہے میری زندگی کا، آج تو خوشیاں اور شرارتیں اپنے عروج پر ہوں گی۔“ وہ ہلکا سا غنوی پر دباؤ ڈالتے ہوئے بولا۔
”ڈرا دھیان رکھنا بڑوں کے سامنے۔“ لالہ رخ نے کہا۔
”جو کہ میرا خیال ہے ناممکن کی بات ہے۔“ سلوئی نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے اطمینان سے کہا تھا۔
”اب آپ لوگ باتیں ہی بناتی رہیں گی یا باہر بھی چلتا ہے۔“ شہزادہ ملک مسکراہٹ آمیز لہجے میں بولا تھا۔
”بالکل چننا ہے اور تم رہو یہاں سے میں خود غنوی کو باہر لے کر جاؤں گی۔“ لالہ رخ نے شہزادہ ملک کو ہلکے سے دھکا دیا اور غنوی کو اپنے سے لگا کر باہر نکلنے لگی۔
”یہ سراسر نا انصافی ہے، میں احتجاج کروں گا۔“ شہزادہ ملک کے لہجے میں جو بے بسی تھی اس پر سلوئی کا زور کا قہقہہ ابھرا تھا جب کہ لالہ رخ غنوی کو اپنے ساتھ لگائے مسکراتے ہوئے باہر نکل گئی تھی۔
”آپ اور بس لیں۔“ اس نے شکایتی نظروں سے سلوئی کو دیکھا۔
”اوسے سوری، ویسے سچ بتاؤ نا آخر کیا ہوا ہے۔“

”بچ بچ، یہ لڑکیاں بہت نرم اور خوب صورت دل کی ہوتی ہیں ذرا سی محبت اور توجہ سے پکھل جاتی ہیں غنویٰ جنگجوی مگر نرم دل کی ہے میری بے ساختہ محبت اور نظروں کی توجہ نے اس کو میرا کر دیا ہے۔“ شہزیل ملک کی نگاہوں میں چسب سے غنویٰ کا خوب صورت سراپا گھوم گیا۔

”اللہ ہمیشہ تمہاری جوڑی سلامت رکھے، آمین۔“

”اچھا نہیں، شہکاشہ بھائی اپنے بیڈروم میں ہی ہیں، وہ ابھی تک باہر نہیں آئے۔“ شہزیل ملک نے اشارے میں جو اس کو سمجھانا چاہا وہ سمجھ چکی تھی۔

حوالی کے بڑے سے لان میں سب جمع تھے سوائے شہکاشہ ملک اور سلویٰ کے، سلویٰ دھڑکتے دل سمیت شہکاشہ ملک کے بیڈروم میں کھڑی تھی، چہرے اور نگاہوں کو جھکائے وہ اپنے دل کی غیر ہوتی حالت پر کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہی تھی، دونوں مہندی لگے ہاتھوں کو آپس میں پیوستہ کیے وہ اپنی ہتھیلیوں کی رفتار کو سن رہی تھی، شہکاشہ ملک نہایت چابوت بھری نظروں سے اس کو بخور اور پیسے نیچے تک دیکھ رہا تھا، زیادہ دیر نہ ہو تو اس کے اندر برس گیا تھا یہ وہ ہستی تھی جو اس کے دل و دماغ پر راج کرتی تھی مگر اب وہ مزید اس کو آزمائش میں نہیں ڈالے گا۔ وہ آگے بڑھا اور اپنی کل کائنات، متاع حیات کو نہایت آہستگی سے اپنے اندر کسی قیمتی موتی کی طرح چھپا لیا تھا، سلویٰ کی ہلکی سی کھٹکی تھی۔

”دشش..... بس۔“ اس نے سلویٰ کی چمکتی پیشانی پر اپنے لب رکھ دیے۔

”اب ہرون، ہریل، ہرچھو ہار ہے جسے ہم دونوں کو خوشی خوشی جینا ہے۔“ اس نے سلویٰ کا خوب صورت مضمون چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں بھرے ان کا پی آنکھوں میں جھانک کر اپنے ساتھ کا یقین دلایا تھا۔ دونوں ایل ساتھ مسکراتے ہوئے باہر لان میں آئے تھے جہاں شہزیل نے کوخوب رنج کے سجایا گیا تھا۔

”لو آگیا وہ شہکار جس کا تھا سب کوشدت سے انتظار۔“ لالہ رخ کا مسکراتا لہجہ سب کو سلویٰ اور شہکاشہ ملک کی جانب متوجہ کر گیا۔

”تمہیں پتا ہے شہکاشہ شہزیل کہہ رہا تھا اگر شہکاشہ بھائی اور سلویٰ بھائی نہیں آئے تو وہ مٹگنی نہیں کرے گا۔“ لالہ رخ نے مزاحیہ سا ہنسنے چھوڑا تھا۔

”خدا کا خوف کریں لالہ رخ بھائی! خدا نخواستہ میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔“ شہزیل ملک نے فوراً سے پیشتر تردید کر دی تھی۔

”بڑے ہی بدتمیز یعنی بے شرمیوں کی طرح مٹگنی کر لیتے۔“ لالہ رخ نے بوئے گل سے طنز کیا۔

”لو میں تو نکاح کے حق میں ہوں ایسے موافقے زندگی میں بار بار تھوڑی آتے ہیں۔“ ڈھکیوں کا ڈھیٹ شہزیل ملک بڑی بے نیازی سے بول رہا تھا۔

”شہکاشہ بھائی اور سلویٰ بھائی کا کیا ہے کل منالیتا میں ان کو۔“

”اچھا اب یہ اہمیت ہے ہماری۔“ شہکاشہ ملک نے مصنوعی انداز میں گھور کے دیکھا تھا۔ وہ اچھی طرح اس کے کھلنے والے انداز کو جانتا تھا۔

”ارے میرے ڈشنگ بھائی!“ وہ اپنی چیز سے اٹھا اور تیزی سے شہکاشہ ملک کے کمرے کی سیڑی سے لگا تھا۔

”آپ کی اہمیت کیا ہے ہمارے لیے یہ کوئی ہم سے پوچھے۔“

”بد معاش۔“ شہکاشہ ملک نے اس کی پشت زور سے پیچھتی تھی۔

”بٹ بوائی گریڈ بھایا۔“ فرط جذبات سے اس نے شہکاشہ ملک کو دیکھا تھا۔

”جتنے بھی مسکے لگا لو بشر پاش کر لو، نکاح تو بھر بھی نہیں ہوگا۔“ لالہ رخ نے پھلجھڑی چھوڑی ہر کوئی ان لوگوں کی نوک جھونک سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

”میرا خیال ہے قاضی کو بلاوایا لیتے ہیں اب تو رخصتی ہی لے کر جائیں گے۔“ شہزیل ملک بڑے دھڑلے سے کہتے ہوئے بہت حق سے واپس غنویٰ کے برابر میں بیٹھا تھا۔

”کیا خیال ہے غنویٰ ڈائریکٹ نکاح کر کے رخصتی ہی نہ لے لی جائے۔“ شہزیل ملک نے کاہل ولائزر سے کچی آنکھوں میں جھانکا، غنویٰ نے بے ساختہ سلویٰ کو مدد طلب نظروں سے دیکھا۔

”شہزیل تنگ میت کرو میری بچی کو۔“ بے بے گل جو برابر میں بیٹھی اس کی شوخیاں دیکھ دیکھ کر نہال ہو رہی تھیں۔ ایک جھانپڑاس کے کندھے پر مارا۔

”لو بے بے جان میں تو فائدہ ہی چاہ رہا ہوں اچھا ہے شہزیل آنٹی اور راجیل اکل کا خرچہ بچے گا، کیوں شہزیل آنٹی۔“ سامنے کھڑی شہزیل کی تائید چاہی وہ سر کو جھکائے مسکرا دیں۔

”یہ ایسے ہی مخربان کاٹا ہے گا سلویٰ۔ تم انگوٹھیاں لے آؤ۔ بتاؤ ذرا غنویٰ کو بھی سہا دیا ہے۔“ لالہ رخ نے سلویٰ کو کہا۔

”اور ان محترمہ نے جو میری جان نکالی ہوئی ہے اپنے روپ سے ہٹ کر اتنے دلکش اور جان لیوا روپ میں سامنے آئے گی تو ہم تو ہیں ہی کمزور دل۔“ شہزیل ملک نے دلچسپ نظروں سے غنویٰ کو دیکھا، گولڈن اینڈ آف وائٹ فراک میں خوب سج دج کے اس کے دل میں تری جاری تھی۔

”تمہارے کمزور دل کی تو ایسی پٹائی ہوگی نا، غنویٰ کی شرم دیکھا وہ اس کی جھجکا خوب فائدہ اٹھا رہے ہو۔“ سلویٰ انگوٹھیوں کے باکس لے کر آگے بڑھی۔

شہزیل ملک کا اس دلکش ماحول میں جاندار قبضہ گونجا تھا۔

”یہ بھی آپ نے خوب کہی، میں تو سوچ رہا ہوں مزید فائدہ اٹھا لوں گی، غنویٰ سے کہتے ہوئے اس نے سلویٰ کے ہاتھ سے انگوٹھی کا باکس لے لیا، اس کا اشارہ جان کر وہاں بیٹھے سبھی مسکرائے تھے۔

”اب بے کاری باتیں چھوڑو اور غنویٰ کو انگوٹھی پہناؤ، کیونکہ اگر غنویٰ کے صبر و ضبط کا پیمانہ نہ ہو تو کیا تو اپنے فائدے کے بارے میں بھی سوچنے کی مہلت نہیں ملے گی۔“ سلویٰ نے ڈرانا چاہا، جس پر وہ ہلکے سے ہنس دیا۔

”وہی تم دونوں کی ڈریسنگ میچنگ لا جواب ہے۔“ لالہ رخ نے دونوں کی ڈریسنگ دیکھی۔ گولڈن اینڈ آف وائٹ ڈریس دونوں پر بہت سوٹ کر رہا تھا۔

”یہیں سے اندازہ لگائیں کہ ہم دونوں کے مزاج اور دل بھی ایک ہی جیسے ہیں۔“ وہ کچھ زیادہ ہی شوخ ہوا سب کی تالیوں کی گونج میں اس نے غنویٰ کو ڈانڈ ڈرنگ پہنا دی تھی۔ مبارک مبارک کے شور کی صدا میں چاروں طرف گونج رہی تھیں، ہر شخص خوشی منا رہا تھا، آغا جان اور بے بے گل نے ڈھیروں دعائیں اور طائف سے نوازا تھا۔ شہزیل ملک، غنویٰ کے کان میں دھیمی دھیمی سرگوشی کر رہا تھا، جس پر اس کا چہرہ مزید سرخ ہوا جا رہا تھا وہ خود میں کئی خود کو خوش قسمت تصور کر رہی تھی۔ کبھی بار اس کے دل پر کسی دستک دی تھی۔

سہیت زندگی

”آج تو حدی کر دی تمہاری بیٹی نے تم کیا پہلے مرد ہو جس نے دوسری شادی کی ہے تمہاری اولاد کے چوچھے ہی ختم نہیں ہوتے۔“ عامر شاہ پہلے تو چپ چاپ سنتے رہے شیم بیگم کی باتیں لیکن جہاں بات اولاد کی آئی انہیں فوراً شیم بیگم کو روکنا پڑا۔

”بچی ہے وہ اس سے تمہارا کیا مقابلہ کیوں اس کے پیچھے ہاتھ دھوکے پر جاتی ہو۔“

”واہ رے عامر جی بچی تو آپ ایسے کہہ رہیں ہیں جیسے کوئی 10 بارہ سال کی ہو معاف کیجیے پورے 26 سال کی ہونے کو ہے اور ہمارے خاندان میں اس عمر میں دو دو بچیوں کی اماکیں بن جاتی ہیں۔ بس اب بہت ہو گیا تم اب اس سے کوئی بات مت کرنا خدا کے لیے۔“

و نیزہ دوسرے کمرے میں اپنے باپ کی اپنی دوسری ماں سے یہ بحث سنتے سنتے ہی اپنی عمر کے 26 سال کو پہنچی تھی۔

”بس اب بہت ہو گیا میں کوئی مجبور یا لاچار نہیں ہوں پر جی لکھی سمجھدار لڑکی ہوں۔ کیا میں صرف اک شادی کے انتظار میں اپنی باقی کی صلاحیتوں کو ملایا میت سردوں بس اب بہت ہو گیا۔ آئے کوئی رشتہ میرے لیے وہ کیا انکار کریں گے میں خود ہی ان کو انکار سردوں کی میری بھی کوئی عزت نفس ہے۔“

☆...☆

انیا جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی ہر طرف خاموشی تھی۔ وہ سیدھا و نیزہ کے کمرے میں آئی۔

”کیا بات ہے اتنا سنا کیوں ہے؟ آج پھر کوئی لڑائی ہوئی ہے کیا؟“

”ہاں میری زندگی بس یہیں سے شروع ہو کر یہیں پر ختم ہو جاتی ہے۔ چھوڑو یہ سب تم سناؤ کیسے فرصت مل گئی آج بہن کی خبر گیری۔“

”کچھ نہیں بس مجھے اب اسے کچھ بات کرنا تھی۔“

و نیزہ کو شک ہوا۔

”کچھ نہیں میں تو بس وہ اک رشتہ لانی تھی۔“

”خبر دار اس کے آگے اک لفظ بھی کہا تو جیسے آئیں تمہیں مہربانی فرما کر تشریف لے جائیں۔“

”پر میری بات تو سن لو بہت اچھی بیٹی ہے۔“

”ہاں مجھے پتا ہے دیے مجھے اک بات سمجھ نہیں آتی ان رشتے ڈھونڈنے والوں کی انہیں پر جی لکھی لڑکی بھی چاہیے اور کم عمر بھی اب مجھے بتاؤ اک لڑکی M.A کر کے اپنی عمر بائیس سال تو نہیں بتا سکتی اور ویسے بھی مجھے لگتا ہے۔ میں نے M.A کر کے اپنا

☆...☆

عامر شاہ ایک مڈل کلاس فیملی سے تھے۔ جن کی چھ اولاد تھیں۔ انہوں نے بیوی کے انتقال کے بعد جوان اولاد کے ہوتے ہوئے بھی دوسری شادی شیم

بہت بڑا نقصان کیا ہے کیونکہ M.A کرنے کے بعد عمر زیادہ ہونے کے جتنے طے آپ کی امی حضور مجھے دیتی ہیں نا تو اس سے تو بہتر تھا میں گریجویٹ ہی رہتی۔“

”واہ واہ کیا بات ہے آج میری بہن کو یہ عمر کا کمپلیس کیسے ہو گیا تم تو بڑے فخر سے بتا سکتی ہو کہ تم اک پڑھی لکھی لڑکی ہو اور سیریسلی ابھی اپنی بکواس بند کرو تم اب کی دوسری شادی کے بعد اب اب کی زندگی میں تمہاری کوئی جگہ نہیں بچی۔“

”تو کیا میں بس اک ضرورت ہوں سب کے لیے جواب میری ضرورت کسی کو نہیں تو شادی کرو میری اور اگر وہاں بھی میری ضرورت کسی کو نہیں ہوئی تو پھر وہاں سے کہاں جاؤ گی یہی بتاؤ۔“

”بس اب چپ۔“ انیلا نے الگ الگ سے دھپ لگا کر کہا۔

”ایہ نہیں ہوگا اللہ تعالیٰ تیرے بہت نصیب کریں گے۔“

☆.....☆

آج گھر میں مہمان آنے تھے۔ انیلا صبح ہی اپنے سسرال سے آگئی تھی کیونکہ اسے پتا تھا کام کے پکڑوں میں ونیزہ ایسے ہی مہمانوں کے سامنے آجائے گی۔

”ونیزہ تم جاؤ جلدی سے فریش ہو جاؤ۔“

”نہیں ابھی کہاں سے کباب فرانی کرنے ہیں۔“

”دی بڑے میں نے پہلے ہی بنا دیے تھے۔“

”تم جاؤ میں دیکھ لوں گی سب۔“

”ارے میں نے کہا ناں جاؤ کپڑے میں نے تمہارے نکال دیے ہیں۔ وہی پہنا میں کچھ ناسنو اب تمہارے منہ سے جلدی جاؤ۔“

”تم بھی حد کرتی ہو۔“ ونیزہ اپنے روم میں فریش ہونے آئی تو اتنا فینسی سوٹ دیکھ کر برے برے منہ بنانے لگی چارو ناچار ڈریس لے کر واش روم

میں گھس گئی۔

”ونیزہ، ونیزہ۔“ انیلا چلائی ہوئی آئی۔

”تم ابھی تک ریڈی نہیں ہوئیں۔“

”انیلا! میں بالکل تیار ہوں اب کچھ بھی نہ

کروں گی۔ اتنا فینسی سوٹ پہن لیا بس۔“

”اچھا میری بہن نہیں ہو یہ ناپس بس کان

ڈال لو۔“ ڈریسنگ پر موجود ناپس کی طرف اشارہ کر کے

کہا انیلا میں سر پر دوپٹہ اوڑھوں گی کیا خاک نظر

آئیں گے جلدی کرو شاید وہ لوگ آگئے۔“ ٹھیک پانچ

منٹ بعد لاؤنج میں چائے لے کر آ جاؤ ٹھیک ہے

انیلا بولی۔ اتفاقی طور پر ونیزہ انہیں بہت پسند آئی تو

28 سال کا تھا اور پوسٹ بھی اچھی تھی۔ ونیزہ کو یقین

ہی نہیں آ رہا تھا اپنے آپ میں مگن رہنے والی اپنے

مطابق دنیا دیکھنے والی سانولے چہرے، کھڑے

نقوش والی لڑکی رضیہ بیگم کو پتا نہیں کیوں اتنی بھاگی۔

ونیزہ مہمانوں کے جانے بعد مگن سینے لگ گئی

انیلا نے اس کے پاس آ کر بہت خوشی سے بتایا۔

”آئی کو تم بہت پسند آئیں۔“ ونیزہ بغیر کسی تاثر

کے کہیں دوسرے میں مگن رہی تو انیلا نے دوبارہ اس

سے کہا۔

”کوئی فائدہ نہیں انہیں کو تو پسند آ ہی جاتی ہوں

مگر اوروں کو کوئی نہ کوئی ایسا کیون نہ نظر آ ہی جاتا

ہے۔ اس لیے میں تمہاری طرح کسی خوش فہم نہیں

ہوں۔“

”ونیزہ! تم اتنی ناامید کیوں ہو رہی ہو۔ سب

اتجھے کے لیے ہوتا ہے۔“

”ہاں جیسے اب تک ہوتا آ رہا ہے میرے ساتھ۔“

☆.....☆

رضیہ بیگم شانزے کو آواز دیتے ہوئے بولیں۔

”ارے او شانزے جلدی کر لڑکی والے آتے ہی

ہوں گے فہد آیا یا نہیں ابھی تک اس کو فون تو کر کہاں

رہ گیا۔“

”جی اماں! فون کیا تھا رستے میں ہیں بس آتے

ہیں گے۔“ اتنے میں فہد دروازے سے اندر

اُبلے ہوا۔

”السلام علیکم اماں جی!“

”چپتا رہے چل جلدی سے تیار ہو جا۔ مہمان

آتے ہی ہوں گے۔“ فہد ایک سرد آہ بھر کر فریش

ہونے چل دیا۔

”ونیزہ! بہت مبارک ہوا گلے مینے کی 17

تاریخ زکریٰ کی ہے بہت مبارک ہو۔“ ونیزہ کے

گلے لگ کر بولی۔

”ہاں آج میں خوش ہوں فائنلی میں اب ان

ب لوگوں کی زندگیوں سے نکل جاؤں گی۔ جو مجھے

نا پسند کرتے ہیں۔“

”تم پھر لیں بائیں کر رہی پوچھا چلو شاپنگ پر

جاتے ہیں۔“ آج ونیزہ کی مایوں بھی زرد جوڑے میں

بائیں سادگی میں بھی وہ بہت سبیل لگ رہی تھی۔ جو

نہی اسے دیکھ رہا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسی دفعہ دیکھ

رہا ہو۔

”مایوں میں تم اتنی حسین لگ رہی ہو۔ شادی

میں تو قیامت ہی ڈھاؤ گی فہد پر۔“ انیلا نے سرگوشی

میں ونیزہ سے کہا۔ بل آخر شادی کا دن بھی آ ہی گیا۔

وہ بھائی جو اپنی رنگینیوں میں جیسے اسے بھول ہی بیٹھے

تھے۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھنے کا خیال بالآخر انہیں

آ ہی گیا۔ سب سے گلے شکوے مٹا کر وہ پیادیں

سدھار ہی گئی مگر یہ کس کو پتا تھا کہ سفر زندگی تو اب

شروع ہوا ہے۔

☆.....☆

شانزے اسے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی فہد کے

روم میں چھوڑ گئی تھی۔ پھولوں سے بھری تیج پر وہ

گھونگھٹ نکالے بیٹھی اپنے ہاتھوں کی مہندی کو دیکھ

رہی تھی۔ رضیہ بیگم کی فرمائش پر اسے گھونگھٹ میں ہی

بٹھایا گیا تھا۔ دروازے کی آہٹ پر وہ سنبھل کر بیٹھ

گئی۔

فہد اندر آتے ہی واش روم میں گھس گیا۔ وہ باہر

آیا تو اپنے بیڈ پر بیٹھے اس وجود پر نظر پڑی۔ فہد بہت

ضبط سے ڈریسنگ کے سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گیا

اور بلا تہید باندھے بات کا آغاز کر دیا۔

”دیکھیں یہ شادی اماں جی کے اصرار پر کی گئی

ہے۔ میں ابھی شادی جیسی کسی ذمہ داری اٹھانے کا

خیال بھی اپنے ذہن میں نہیں لاسکتا تھا۔ میں زندگی

اپنے طریقے سے جینا چاہتا ہوں۔ بغیر کسی کی

مداخلت اور شراکت کے مجھے نہیں پتا آپ سمجھ بھی

رہی ہیں یا نہیں۔ جو میں کہنا چاہتا ہوں۔“ ونیزہ سر

جھکائے اس کی بات کو سننے کے ساتھ اپنے ہاتھ کی

لکیروں کو دیکھنے لگی۔ ونیزہ بغیر کسی احساس وجہ بات

کے صرف یہ ہی کہہ پائی۔

”کہ آپ کسی اور کو پسند کرتے ہیں؟“ فہد اس

کی بات پر چونک گیا۔ اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”نہیں میں ان سب خرافات سے دور رہا

ہوں۔ اور رہنا چاہتا ہوں۔ میں ابھی اپنا مستقبل

سیکور کروں گا۔ کچھ الگ کروں گا۔ اپنی زندگی کے

ساتھ اپنی جگہ لی میں تھوڑا تنہا پسند ہوں۔ اور اس تنہائی

میں کسی کو مداخلت کی اجازت نہیں دوں گا۔“ ابھی وہ

اپنی بات بھی مکمل نہیں کر پایا تھا۔ ونیزہ بیڈ سے اٹھ کر

سیدھا واش روم میں گئی۔ فہد بھی بغیر کسی تاثر کے

بیڈ پر جا کہ سو گیا۔ ونیزہ واش روم کے مرمر میں اپنا

گھونگھٹ خود اٹھاتے ہوئے آنکھوں میں ٹھہرے

آنسوؤں کے ساتھ بس خود کو ششے میں دیکھے گی۔

”تو ونیزہ شاہ یہاں بھی تمہاری کوئی ضرورت

نہیں۔ ہمیشہ اپنوں کی محبت پانے کے لیے خود تک کو

فراموش کرنے والی محبت کے معاملے میں یہاں بھی

خالی ہاتھ لوٹا دی گئی۔ بس بہت ہو گیا۔ آج کے بعد

میں کسی کی محبت پانے کے لیے خود کو خوار نہیں

کروں گی۔ میری ذات اتنی ازاں بھی نہیں اگر کسی کی

زندگی میں میری کوئی اہمیت نہیں تو مجھے اپنی اہمیت کسی کو جہتی بھی نہیں۔ آج کے بعد میں دوسروں کے لیے نہیں خود کے لیے جیوں گی۔ میں نے دعا کی تھی تاکہ جو لوگ مجھے ناپسند کرتے ہیں ان کی زندگی سے مجھے نکال دے لیکن مجھے اب کسی کی پسند نہ پسند نہیں بننا۔" واٹس روم سے نکل کر ڈریسنگ میں جا کر سا دوسرا کاشن کا سوٹ زیب تن کرتے بید پر سوئے اس وجود کو نیم نظر انداز کرتے ہوئے وہ صوفے پر سو گئی شانزہ کے آواز کے ساتھ دروازہ بھی تسلسل سے بجا رہی تھی۔ ونیزہ ہرگز برا نہ سمجھی۔ جلدی سے دوپٹہ اوڑھا اور دروازے کی طرف پئی۔

"am sorry! میری کچھ ہی نہیں سمجھی۔" بھی بھی معنی خیزی سے اس کا چاندنی ہوئی مسکرا کر بولیں۔

"کوئی بات نہیں جلدی سے فریض ہو کر آ جا۔" مہارن مٹی ناشتہ پروت کر رہی تھیں۔

"نہیں میں پانی منگ میں آئی۔" مٹھرا صرف آپ ہی نہیں آپ کے شاہرہ نامہ رنجی۔" مٹی بول گئی۔

وہ جلدی سے تھیں۔ فہمید پر چاٹ چکا تو۔ ونیزہ ونیزہ کوئی فوس ڈب ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ جلدی سے ایک کپڑا امبراہیڈی اور مٹھرا پہنا کالوس میں گولڈ کے ڈچس ڈاس کر جلدی سے دوپٹہ مڑا کر۔

تیار ہو کر صوفے پر بیچھے کے فہمید کا انڈر کوٹس کی۔ تھیں ہی فہمید تیار ہوا بیچھے پتے کے۔ مٹھرا سے تھیں۔

ونیزہ ونیزہ اس کے پیچھے چلی گئی۔ پونہ ن دوپٹہ فوسٹ فلو پر تھا۔ جلدی جلدی پیچھے تھیں۔ وہ لوگ تھیں۔ پاس چٹنی قوت شدید شہمندی ہوئی یگانہ

ماتے ان کے مہوں سب موزوں تھے۔ پونہ ن ماتے ماتے ہو کر ماتے تھے۔ پونہ ن اپنے ساتھ ہے

وہ لوگ نہیں پر تھی۔ ناشتے کے بعد ونیزہ ونیزہ کے ساتھ بیٹھے تھی۔

"ونیزہ واٹس روم میں فہمید جہتی ہیں۔" مٹھرا نے تھوڑی

ایکجہ سے تیار ہونا۔" کیوں بھی میں تو جیسے تیار ہوتی ہوں ویسے ہوں گی۔" انیلا نے ونیزہ کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ونیزہ! سب ٹھیک ہے نا؟" ونیزہ مسکراتے ہوئے۔

"ہاں بالکل سب کچھ ٹھیک ہے۔ بالکل میری زندگی کی طرح۔" کہتے ہوئے اپنے روم میں چلی گئی۔

شام میں رضیہ بیگم اور فہمید ونیزہ کو لینے آئے۔

ونیزہ نے سوچ اور پرانی یاد کی تھی۔ فہمید بیگم کی فوٹو پر نیا بھی کی ہوئی تھی کیونکہ اسے پتا تھا کہ وہ ایک دن کی دہشت سے ہی ڈر تیار کروائیں گی لیکن ونیزہ نے بھی نیا کو پہنچانے کے لیے بہت لمبے پر

پس سوچتے واٹس تیار ہوئی۔ رضیہ بیگم جانے کے بعد تعریف کرتے ہوئے۔

"بہت فائن تھا تمہارے میں۔" انیلا نے بتایا کہ۔

"نا مانا ونیزہ! وہ نہ بیا ہے۔" رضیہ بیگم حیرت سے فہمید پر دیکھتے تھیں۔

"آپ نے اس کی دکان سے کہا ہوا۔" مٹھرا نے نہیں کہا۔ مٹی میں نے خواہی اپنی خوشی سے

تیار کیا ہے۔" ونیزہ نے اس کی کوئی جھگڑا نہ کیا۔ جس نے بعد میں فہمید پر بیگم سے اجازت کے کر

ونیزہ کے ساتھ کھائیں۔

زندگی کے ان دنوں میں فہمید نے ونیزہ اور فہمید دوہرے کے ساتھ ہاں چٹنی کی طرح

رہتے تھے۔ شازب، مہارن، مٹی، مٹھرا، انیلا، شانزہ کے شہوہ است وہ ساری خاتونیں پانچہ ن کے لیے کیے کی سے مل رہی تھیں اور کیا چاہتے تھے۔ انھی

مرے میں بیٹھی یہ ہی سوچ رہی تھی۔ اتنے میں ان کے ہلکی سی دستک کے ساتھ اندر آ گئی۔

"اگرے بھابھی! آپ آئیے آپ کو نوک کر کے لے کی ضرورت نہیں۔"

"اگرے نہیں بھابی ہر انسان کی پرائیویسی ہوتی۔" اچھا تمہیں ایک خریدنی تھی چھو چھو اپنی پوری

انہی کے ساتھ ٹیکسٹ ویک اینڈ میں مل رہی تھی۔

وہ بولتے ہوئے کہا۔

"وہ بھابھی! یہ تو اچھی بات ہے۔ روٹی ملک لے کی گھر میں۔" ونیزہ نے خوش ہوتے ہوئے

"وہ بھابھی! یہ تو اچھی بات ہے۔ روٹی ملک لے کی گھر میں۔" ونیزہ نے خوش ہوتے ہوئے

"وہ بھابھی! یہ تو اچھی بات ہے۔ روٹی ملک لے کی گھر میں۔" ونیزہ نے خوش ہوتے ہوئے

"وہ بھابھی! یہ تو اچھی بات ہے۔ روٹی ملک لے کی گھر میں۔" ونیزہ نے خوش ہوتے ہوئے

"وہ بھابھی! یہ تو اچھی بات ہے۔ روٹی ملک لے کی گھر میں۔" ونیزہ نے خوش ہوتے ہوئے

"وہ بھابھی! یہ تو اچھی بات ہے۔ روٹی ملک لے کی گھر میں۔" ونیزہ نے خوش ہوتے ہوئے

"وہ بھابھی! یہ تو اچھی بات ہے۔ روٹی ملک لے کی گھر میں۔" ونیزہ نے خوش ہوتے ہوئے

"وہ بھابھی! یہ تو اچھی بات ہے۔ روٹی ملک لے کی گھر میں۔" ونیزہ نے خوش ہوتے ہوئے

طرف تھی جو زارو تھا ررونے میں مشغول تھی اپنے ہاتھوں کی پشت سے اپنا چہرہ صاف کر رہی تھی۔ فہمید چٹنا ہوا اس کے ساتھ جیسے ہی صوفے پر بیٹھ ونیزہ اتنی ہی جلدی صوفے سے کھڑی ہوئی۔ فہمید نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

"کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ۔" کچھ ہوا ہے کیا کیوں رو رہی ہو۔"

"میرا ہاتھ چھوڑیں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تھی میری بات شاید آپ کو سمجھ نہیں آئی۔ میں مریخی رہی ہوں تو مجھے ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔" فہمید جھٹکتے سے اس کا ہاتھ چھوڑ کر اس کے منہ مل کھا

ہو گیا۔

"مسئلہ کیا ہے۔" تمہارے ساتھ اور یہ بار بار اس پر جتا رہی ہو کہ ہاتھ مت لگاؤ پورا حق رکھتے ہوں۔ نہیں ہاتھ لگانے کا۔"

"اس نے کیا کیا ہے حق۔" ونیزہ نے ہلکی بات سن کر فہمید کے چہرے پر تھیں کی مسکرائی۔ ونیزہ کا

ہاتھ پکڑ کر غور سے قریب ہے اس کی مہم میں دوسرا ہاتھ ڈال کر اس میں سر کوئی کی آویزیں ہوں۔

"تم نے وہ بات مجھے ہی کی۔"

"چھوڑیں مجھے میں نے کہا چھوڑیں۔"

"اگ لگتی چلائی ہو تو۔"

"دور رہیں مجھ سے اب اسے وارنٹ دے۔"

رہی ہوں۔ جسے چاہ رہا ہے ویسے ہی چلتے رہتے ہیں۔ اگر آپ کو اپنی زندگی میں مداخلت و درہنسی تو مجھے بھی میری ایک میں کسی کی مداخلت سے باطل پسند نہیں درجہاں نہ اتنی ہی بات ہے۔ وہ سب سچ ہے

مجھے کوئی رات ہی درجہاں و درہنسی یہ تو آپ کا ہاتھ پر سے اسی وقت حق سمجھ دیا تھا۔ یہ کہہ کر وہ روم سے نکل گئی۔ فہمید نے ہاتھ دیکھ کر مسکراتا ہو بیٹھ گیا۔

کیا وہ کچھ الگ ہے دوسری لڑکیوں سے یہ تو پتا چل ہی گیا تھا مگر میرے ہاتھ لگانے سے وہ اتنا پرٹ ہوگی میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اماں جی کسی تو واقعی گرید ہو کچھ تو بات بھی ہی ونیزہ میں جو آپ نے مجھے مجبور کیا۔ آج دیکھ بھی لی اپنی ویزا اب ونیزہ فہد کو کس طرح ٹرسٹ کیا جائے دیکھتے ہیں ویسے میں بھی پاگل ہوں اسے آزمانے کے چکر میں خود ہی آزمائش میں پڑ گیا۔ مجھے اس کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ سب لڑکیاں اک جیسی نہیں ہوتیں۔“

☆.....☆
”دوسرے دن ونیزہ اپنا ایک تیار کیے اماں جی کے پاس آئی۔
”السلام علیکم اماں جی!“
”جیتی رہو میری بیٹی کہاں کی تیاری ہے۔“
”وہ اماں جی میں کچھ دن کے لیے گھر جا رہی ہوں۔“

☆.....☆
”اچھا بیٹی فہد کہاں ہے۔“
”وہ اماں میں ڈرائیو کے ساتھ جا رہی ہوں۔“
ونیزہ نے تھوڑا جینب کر کہا۔
”کوئی بات ہوئی ہے کیا فہد نے کچھ کہا ہے۔“
”نہیں اماں جی! میں بس انہیں پریشان نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ اک ہی چٹھی کا دن ہوتا ہے۔“
”کوئی چٹھی وئی نہیں اسے کہہ وہ تجھے چھوڑ آئے گا۔“

☆.....☆
”اماں جی! میں چلی جاؤں گی۔“
”بیٹی شوہر کی اجازت لے کر جانا ضروری ہوتا ہے۔ پہلے فہد سے پوچھ لے پھر ڈرائیو کے ساتھ چلی جانا ہے شک۔“
”رہنے دیں اماں جی! میں جا ہی نہیں رہی۔“
”کیا ہوا ونیزہ! کوئی جھگڑا ہوا ہے۔ کیا تمہارے“
”نہیں اماں! کچھ بھی نہیں ہوا اچھا آپ یہ

بتائیں آپ نے میڈیسن لیں۔“
”تو بات کو گھما مت بتا مجھے۔“
”اچھا میری پیاری اماں میں ان سے پوچھ جاؤں گی بس۔“
”ہاں بچہ ٹھیک رہے گا۔“ اماں جی مطمئن ہو گئیں۔

☆.....☆
ونیزہ، شانزے کے پاس آئی۔
”نہا بھی پلیز چھری اک مدد کریں گی۔“
”ہاں ہونو۔“
”مجھے گھر جانا ہے۔“
”کیا ونیزہ! میں نے تمہیں بتایا تھا اس ویک ایڈ پچھو کی فیملی آ رہی ہے۔ پلیز ان کو اکیلے سنبھالنا بہت مشکل کام ہے۔“ ونیزہ کی بات کرنے آئی تھی اور بھابھی اپنی ہی سائے جا رہی تھیں۔
”اچھا بھابھی! میں نہیں جا رہی۔“ شانزے نے اس کے چہرے کو اب غور سے دیکھا تو پوچھا۔
”فہد سے جھگڑا ہوا ہے کیا۔“ ونیزہ کو اک دم ہی غصہ آ گیا۔
”کیا اگر میں اپنے جیسے جاؤں گی تو کوئی بات ہوگی۔ جی جاؤں گی ویسے نہیں چاکنی کیا۔“
”یار! میں تو ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔ اتنا غصہ کیوں ہو رہی ہو۔“

☆.....☆
”سوری بھابھی!“ ونیزہ کہتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔
”اب کیا کروں! ونیزہ کیا تو ڈر کے بھاگنے والوں میں سے ہے۔ وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ بس تو ان کے سامنے ہی مت جا پرا لہم خود ہی solve ہو جائے گی ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ وہ خود سے بولی۔

☆.....☆
کل پچھو کی فیملی کو آنا تھا شانزے اور ونیزہ نے مکمل تیاری کر لی تھی۔ انہیں خوش رکھنے کی مگر وہ پچھو

نی کیا جو کسی چیز سے مطمئن ہو جائیں۔ ونیزہ آج بہت تھک گئی تھی۔ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔
”اف اللہ جی آج تو بہت تھک گئی ہوں۔ صبح جلدی بھی اٹھنا ہے چلو ونیزہ بی بی جلدی سے سو جاؤ۔“ ابھی وہ اپنے آپ سے باتیں ہی کر رہی تھی۔ واٹس روم سے باہر آتے فہد نے معنی خیزی سے کہا۔

☆.....☆
”اگر زیادہ تھک گئی ہو تو بیڈ پر سو جاؤ۔“ ونیزہ نے سوچ لیا تھا کہ مکمل نظر انداز کرنا ہے اس لیے جادو تان کو بیک کوئی جواب دیے فوراً لیٹ گئی۔ فہد منکراتے ہوئے بیڈ پر لیٹا۔
”مسٹر فہد! کرب تک۔“ آپ کو اس بیڈ پر اکیلے سونا پڑے گا۔“ بلند آواز میں کہتے ہوئے لیٹ گیا۔ ونیزہ نے چادر کو اوڑھ لیا۔
”فہد! کہاں تو بات کرنا گوارہ نہیں ہے۔“

☆.....☆
کار کے ڈائلاگ میں نہیں سننے والی ان کی طرف میں خود سے مخاطب ونیزہ محسن کے باوجود بہت محظوظ ہو کر سوئی۔ صبح پچھو کی فیملی اپنی دو بیٹیوں سمیت دوپہر کے کھانے سے پہلے موجود تھیں۔ رضیہ بیگم نے دوپہر کے کھانے پر خوب اہتمام کروایا کھانے بعد پچھو ونیزہ سے کہنے لگیں۔
”بچی کچھ زیادہ ہی کم نہیں بولتی جب سے آئی ہوں بہت چپ ہو۔“ ونیزہ نے اس طرح جراح کرنے سے گھبرا کر اماں جی کی طرف دیکھا۔
”رضیہ بیگم! ابھی نئی نئی شادی ہوئی ہے ناں اس لیے۔“

☆.....☆
”میں یہ ہی تو کہہ رہی ہوں کہیں سے بھی یہ نئی نو ملی دلہن تو نہیں لگ رہی۔ نہ ہاتھوں میں مہندی نہ ستارے والے کپڑے۔“ شانزے ہنستے ہوئے بولی۔
”ارے پچھو جان! اب یہ سب کوئی ہوتا ہے کہ

مہینوں تک دلہن بھی سنوری گھومتی رہے۔ زمانہ بدل گیا ہے۔“
”کچھ نہیں بدلے بی بی! کہاں ہے سویرا۔“ اپنی بیٹی کو آواز دیے لگیں۔
”جی امی! کیا ہوا۔“ سویرا جلدی سے آئی۔
”چل جلدی سے اپنی بھابھی کے مہندی لگا کتنے سونے ہاتھ لگ رہے ہیں۔“ ونیزہ نے جلدی سے کہا۔

☆.....☆
”نہیں پچھو جان! میں لگواؤں گی آرام سے۔“
”بی بی ہم نے جو کہہ دیا بس کہہ دیا۔ جا کے مہندی لگاؤ بس۔“ ونیزہ بے جا رگی سے شانزے کی طرف دیکھنے لگی جو مسلسل مسکراتے جا رہی تھی۔
”ہاں ونیزہ تم کام وام چھوڑو جلدی جاؤ مہندی لگواؤ۔“ ونیزہ کو اب سمجھ میں آیا شانزے نے پچھو کا ذکر اس کے سامنے بالکل صحیح کیا تھا۔

☆.....☆
سویرا ونیزہ کے روم میں اس کو مہندی لگانے کے لیے بلائی۔
”سویرا! ملکی سی مہندی لگانا مجھے مہندی کی اسمیل بالکل پسند ہے۔“
”بھابھی! آپ آرام سے بس یہاں بیٹھ جائیں۔ باقی کام مجھے پچھو کرنا۔“ سویرا نے اسے بیڈ پر بٹھادیا۔
”ارے سویرا یہاں نہیں صوفے پر بیٹھ کے لگا دو۔“

☆.....☆
”بھابھی! آپ کے پیروں میں بھی لگانی ہے۔ خاص امی نے تلووں میں لگانے کا کہا ہے۔“ ونیزہ سویرا کو دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔
”پیروں میں لگانا ضروری ہے۔“
”بھابھی! امی سے پوچھ کے آؤں۔“
”نہیں نہیں بس تم جلدی سے لگا دو۔“ سویرا نے ہاتھوں پر لگانے کے بعد پیروں کے نیچے نگلیہ رکھا۔

”اب بھی آپ لیٹ جائیں میں تھوڑی دیر میں پیٹ نہ دوں گی۔“ دو گھنٹوں کی محنت کے بعد سوئے ”اب تھک چکی تھی۔“

”بیٹے میں بھی اب تقریباً دو گھنٹے سے پیٹے آپ اس کو ریاضت کیجیے گا کوئٹہ میں چلتی ہوں۔“ سویرا کھتے ہوئے بولی۔

ونیزہ کی آنکھ حیرت سے کھل گئی آنکھ کھلتے ہی اسے عجیب سی آسٹیل آئی۔

”اف خدا یا میری آنکھ کیسے لگ گئی۔“ سامنے صوفے پر بیٹھے فہد پر چھپے ہی نظر پڑی اسے یاد آیا کہ وہ اس کے بیڈ پر لیٹ کر تھی۔ جلدی سے اٹھی تو دیکھا تھوڑوں میں مہندی لگی ہے۔

”یا اللہ اب کیا کروں میں۔“

”چھ پیلپ کروں۔“

”نہیں آپ بس سویرا کو بلا دیں۔“

”سویرا میں یہ کام نہیں کر سکتا اگر آپ کو میری ہینپ ورک رہے تو فرمائیے ورنہ آپ کی مرضی۔“ فہد نے اسی کے انداز میں کہا۔

”اگر میں نے نیچے پاؤں رکھے تو کارپٹ تو خراب نہیں ہوگا۔“ ونیزہ سوچنے لگی۔

”اگر آپ کو مجھ سے پرانا کم کیا ہے۔“

”یہی میں آپ سے پوچھوں تو کہ آپ کو کیا ہوا ہے یا میں آپ کے اس اچانک بدلاؤ کی وجہ جان سکتی ہوں۔ اتنی مہربانی مجھ پر اچانک سے کیوں۔“ ونیزہ نے اچانک سے اتنے سارے سوال کر دیے فہد سٹکراتے ہوئے بولا۔

”آج تم لگ رہی ہو ونیزہ فہد۔“

”تو سنئے جناب ہماری شادی سے صرف ایک ہفتہ پہلے ان جی نے بتایا کہ میری شادی ہو رہی ہے۔ اب تو اس بات کا غصہ تھا مجھے اور دوسری بات میں حقیقت میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی

وجہ میرا فریڈ سرکل ہے میرے زیادہ تر دوست میرے ہیں اور وہ جس طرح میرے لائف کو ریفرنس کرتے ہیں میں اور بھی بد دل ہو گیا۔ اس لیے میں نے سوچ کے میں شادی کے بعد بھی اپنی سب سے جیسے ہی زندگی گزاروں گا۔ اس لیے میں نے وہ سب کیا لیکن میں سب اچھا نہیں انور کرتا اس نام نہان بغیر مہینوں کے مجھے انور کرنی رہی۔ میں نے سوچا یہ تو اور بھی اچھی بات ہے لیکن پتہ نہیں کیوں تمہارا انور کیے جانا مجھے برا لگے لگا۔ میرا دل چاہنے لگا کہ تم مجھ سے بات کرو لیکن ونیزہ فہد بات تو دور کی بات ہاتھ لگانے پر بھی بدک جاتیں ہیں۔“ ونیزہ فہد کی بات سننے کے بعد اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”صرف اس وجہ سے کہ آپ کی لائف ڈسٹرب نہ ہو۔ آپ نے میری ذات کو ہی نظر انداز کر دیا اور ابھی تو صرف دو مہینے ہی ہوئے ہیں شادی کو مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے آپ کو متوجہ کرنے کے لیے ایسا کچھ کیا ہو جو آپ کو میری جانب متوجہ کرے۔ any ways ابھی آپ پلیز سویرا کو بلا دیں یا رہنے دیں میں خود ہی چلی جاؤں گی۔“

”تو کو نہیں واٹش روم تک جانا ہے میں چھوڑ دیتا ہوں۔“

”مجھے ہاتھ مت لگائیے گا کیونکہ آپ جتنی بھی وضاحت کر دیں۔ مجھے میری انسٹل یاد رہے گی۔“ فہد کی رائیں اک دم سے تن گئیں۔

”جب تم جتنی ہونا کہ ہاتھ مت لگاؤ گی چاہتا ہے کہ اک چھڑ منہ پر لگاؤں۔“ کہتے کے ساتھ ہی اسے اپنی ہاتھوں میں اٹھالیا۔

”اب اک لفظ بھی منہ سے نہ نکلے۔“

”مجھے نیچے اتاریں پلیز۔“

”واٹش روم بہت زیادہ دور نہیں لیکن دل چاہ رہا ہے تمہاری مہندی کے ساتھ تمہارا دماغ بھی دھواں دوں۔“

”آپ مجھے نیچے اتاریں ورنہ میں یہ مہندی کے کپڑوں میں لگا دوں گی۔“

”موسٹ ویلیم اسی یہاں آپ ہمیں ہاتھ تو اتاریں گی۔“ ونیزہ نے واقعی تھوڑی سوچی اور تھوڑی ہی مہندی فہد کی اس کاٹا بلیو شرٹ پر زور سے رگڑ

”اے کیا کر رہی ہو پاگل ٹری میری نئی شرٹ۔“ فہد نے جلدی سے واٹش روم میں چھوڑا ونیزہ نے روم کا دروازہ ناک کرتے ہوئے بولی۔

”اک بار نہیں بار بار کہوں گی کہ مجھے آئینہ ہاتھ ت لگائیے گا بھلے سے آپ میرے منہ پر پھینچ رہی ہیں نہ روم میں آپ سے نہیں ڈروں گی۔“

☆.....☆

رات کو کھانے پر سب ہی موجود تھے کھانے سے ان کے بعد سب ہی باتوں میں لگ گئے۔

”شانزے تمہارے ہاتھوں پر مہندی کا کلر تو اچھا آیا ہے لگتا ہے دیو راجی زیادہ ہی محبت سے ہیں تم سے۔“

”سویرا کل تم شانزے بھابھی کے مہندی لگانا دیکھیں گے کیا اچھا کر رہا ہے۔“ ونیزہ کی بات پر نے بیٹھے فہد کی بے ساختہ ہنسی سے سب ہی متوجہ ہوئے۔

”وہ میں یہ سوچ رہا تھا کہ کل پتہ لگے گا زبیر کی کا کہ وہ جتنی محبت کرتے ہیں بھابھی سے۔“ فہد نے جو دماغ میں آیا جلدی سے کہہ دیا۔ فہد کی بات پر بی بی ہنس دینے رات زیادہ ہوئی۔

”میں چلتا ہوں صبح آؤں گے لیے جلدی اٹھنا۔“ زبیر بھائی کے ساتھ فہد بھی اٹھ گیا۔ شانزے، ونیزہ، حمیرا اور سویرا کافی ٹائم تک باتیں کرتیں رہیں۔

”بہت ٹائم ہو گیا سب اپنے اپنے روم میں جاؤ۔“ صبح بھی اٹھنا ہے۔“ سب اپنے اپنے روم میں

چلے گئے۔ ونیزہ اپنے روم میں جان بوجھ کے دیر سے گئی تاکہ فہد اس کے آنے سے پہلے ہی سو جائے۔ جیسے ہی روم میں داخل ہوئی فہد کھڑا اسی کا ویٹ کر رہا تھا۔

”اتنا ٹائم لگاتے ہیں اگر تم اور پانچ منٹ لیٹ ہو جاتیں تو خود لے کر آ جاتا نہیں۔“ کہتے کے ساتھ ہی ونیزہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ونیزہ نے ہاتھ چھڑایا تو فہد نے زور سے ہاتھ چھینچا تو ونیزہ پوری اس کے سینے سے آگئی۔

”کیا بد تیزی ہے یہ۔“ فہد نے اس کی کمر کے گرد اپنے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

”میں نے کیا کیا؟“

”آپ پلیز میرے ساتھ اس طرح مت کریں۔ چھوڑیں مجھے ورنہ میں بابا کے گھر چلی جاؤں گی۔“

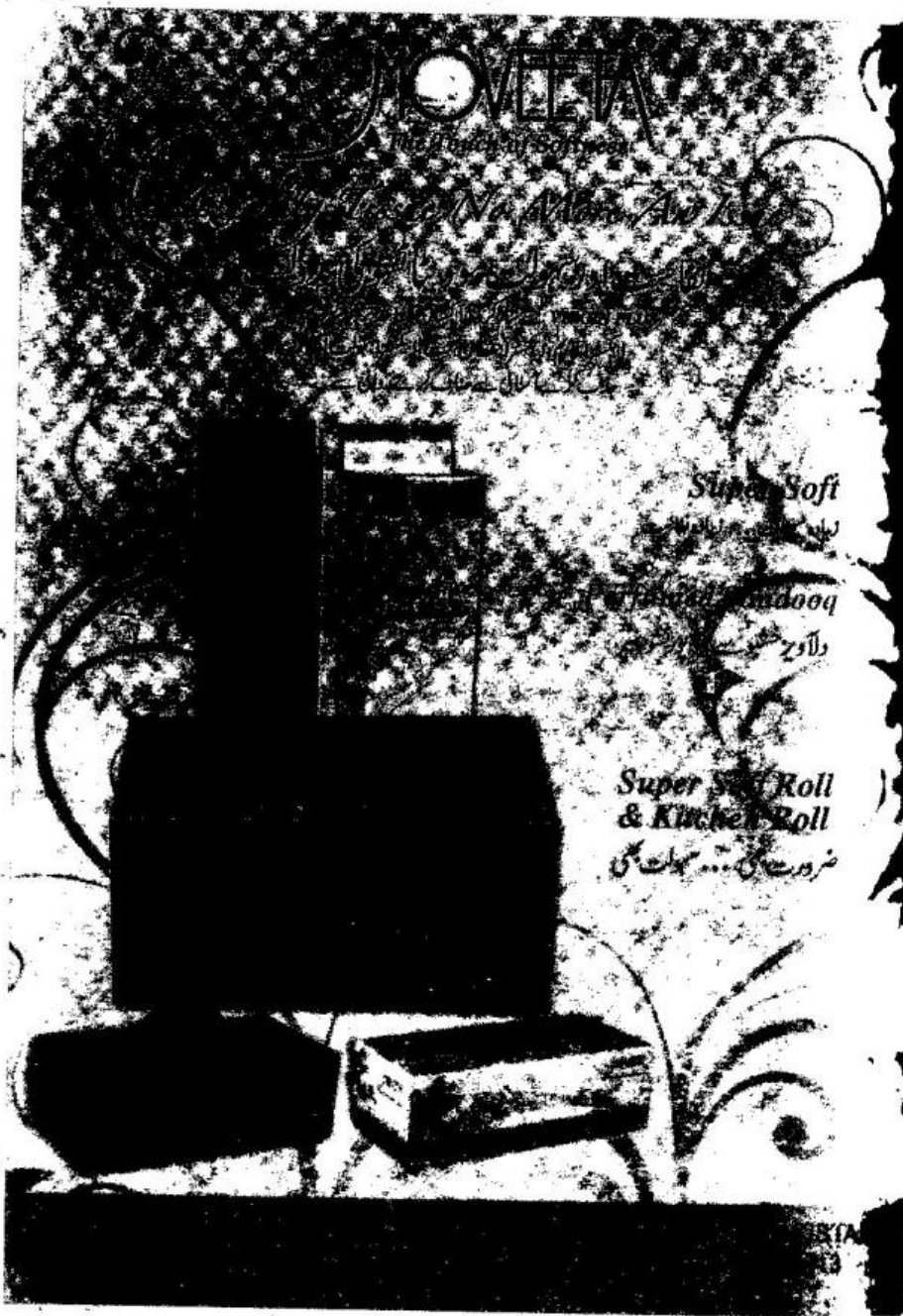
”پلیز فہد۔“ جیسے ہی فہد نے اپنے لب اس کے رخسار پر رکھے ونیزہ نے پوری جان سے فہد کو دھکا دیا۔

”ایک بار منع کیا ہے مت چھوئیں مجھے سمجھ نہیں آتی گیا۔“ فہد غصے سے اسی تیزی سے ونیزہ کا بازو پکڑتے ہوئے بولا۔

”جتنی بار سے منانے کی کوشش کر رہا ہوں اتنا ہی دماغ خراب ہو رہا ہے بہت شوق ہے نام کو میں تمہیں ہاتھ نہ لگاؤں تو آج کے بعد تمہیں ہاتھ لگانا تو دور کی بات دیکھنا تک بھی گوارہ نہیں کروں گا دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑتے ہوئے لائٹ آف کر کے بیڈ پر لیٹ گیا۔ ونیزہ صوفے پر گر گئی ہوئی۔ یا اللہ مجھ سے کچھ غلط ہو گیا کیا۔“ چہرہ ہاتھوں میں لے کر رونے لگی۔

☆.....☆

صبح جب ونیزہ کی آنکھ کھلی فہد جا چکا تھا۔ ونیزہ فہد کا پتہ نہیں کیوں انتظار کرنے لگی۔ شام میں فہد آیا تو



Super Soft Roll
& Kitchen Roll

ضرورت کی... سہولت بھی

باؤں میں چپل ڈالے پاگلوں کی طرح سر پٹ کرے کی طرف دوڑی۔ دروازہ کھولتے ہی وہ روم سے نکلتے فہد کے سینے سے جا لگی اور فہد کو زور پکڑ کر کہنے لگی۔

”پلیز آب مجھے طلاق مت دیجیے گا آپ کرنا ہے کر لیں لیکن پلیز مجھے چھوڑیے گا نہیں۔“ کے سینے میں منہ دیے زار و قطار رو رہی تھی۔ فہد بازوؤں سے پکڑ کر اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرے ہوئے بولا۔

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے اتنی ٹھنڈی کیوں ہو رہی ہو۔“ ونیزہ دوبارہ اس کے سینے سے لے ہوئے بولی۔

”پہلے آپ بتائیں آپ نے مجھے معاف کر دیا آپ جب تک مجھ سے اپنی ناراضی ختم کرنے کا فیصلہ نہیں کریں گے میں آپ کو ایسے ہی پکڑے رہوں گی۔“

”تو محترمہ کے ہوش ٹھکانے آ ہی گئے۔“

”ہاں اچھی طرح اب بتائیں معاف کر دیا۔“

”مہم اک شرط پر۔“ ونیزہ فوراً ہٹتے ہوئے بولی۔

”دہائیہ“

”جی جی بوم نے کہا اس پر ہمیشہ قائم رہنا۔“

”کس بات پر؟“

”ابھی تو تم نے کہا اب کو چھوڑنا ہے کر لیجئے گا۔“

وہ روم میں اس کے لیے چائے لے کر آئی۔ سائڈ ٹیبل پر چائے رکھ کے صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ کافی ٹائم ہو گیا فہد نے چائے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ ونیزہ ٹھنڈی چائے لے کر پیچھے آ گئی۔ ونیزہ بالکل اسی طرح رہ رہی تھی جیسے وہ چاہتی تھی فہد نے اس کو نوٹس کرنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ ونیزہ کی بنائی ہوئی نہ کوئی چیز کھاتا اور نہ کچھ اس سے لیتا۔ ونیزہ کو یہ بات بہت ڈسرب کر رہی تھی۔

”ونیزہ آج تک تو، تو صرف اک چیز کے لیے ہمیشہ تری ہے خالص محبت کے لیے اور وہ مجھے اس گھر میں ہر شخص سے ملی فہد سے بھی اور تو نے کیا کیا اس شخص کو ہی ناراض کر دیا۔ جس کی بدولت مجھے ان سب کی محبت مل رہی ہے اگر تو اس شخص کو محبت نہیں دے سکتی تو ان سب شخصوں کے لائق بھی نہیں ہے تجھے فہد کو منانا ہوگا۔ اپنی زندگی میں محبت کے اس خلاء کو بھرنے کے لیے تجھے فہد ہی کی محبت دیکر رہے۔“ آج ونیزہ اپنے ضمیر کی عدالت میں کھڑی تھی۔

”ہاں مجھے فہد کو ہر حال میں منانا ہوگا۔“

☆.....☆

ونیزہ ہر طرح سے کوشش کر رہی تھی۔ فہد سے بات کرنے کی لیکن فہد کوئی موقع ہی نہیں دیتا۔ وہ جب بھی کمرے میں بات کرنے کی کوشش کرتی کبھی خود کو لیپ ٹاپ میں بڑی ظاہر کرنا یا لائٹ آف کر کے سو جاتا دن رات اسی طرح گزر رہے تھے۔ ونیزہ نے ہر ممکن کوشش کی فہد سے بات کرنے کی مگر فہد کوئی نوٹس ہی نہیں لیتا تھا۔ ونیزہ بہت پریشان ہو گئی تھی کہ

کیسے منائے فہد کو اس نے پھر سب اللہ پر چھوڑ دیا پھر اپنی فیملی کے ساتھ ہفتہ بھر رہیں پھر واپس چلی گئیں۔ اک دن رات کے کھانے کے بعد شانزے

اور ونیزہ بیچنی دی لاؤنج میں کافی دیر تک باتیں کرتیں رہیں۔ باتیں کرتے کرتے ونیزہ کی آنکھ پتہ نہیں کب لگ گئی۔ ونیزہ نے خواب میں دیکھا کہ فہد اسے طلاق دے رہا ہے۔ ونیزہ ہڑ بڑا کر اٹھی بناء

عشق کی دولت و ہمدردی

نوشہ افسانہ کا خاصہ

آنکھوں پر عجب سے تعلق رکھتی ہے۔ چار پہلوؤں میں اس کا نمبر دو ہوا تھا۔ وہ سب میں حسین تھی۔ خود سے
پتہ اپنے والدین اور بہنوں کی خوشی کا سوچتی تھی۔ عمری میں ہی اس نے گھر کی تعلیمی دور کرنے کے لیے

مرنا شروع کر دی تھی۔ اپنے لیے خریدی چیزیں بہنوں کے پسند آجائے پر نہیں دے دیتی تھی۔ وہ اپنی روتی
آنکھوں سے نہ جڑتی اس نے ٹھان لیا تھا کہ وہ کبھی ہمیشہ بند سے شادی کر کے اپنے گھر والوں کی زندگی
کا سہارا بنے گی۔ دونوں چھوٹی بہنیں اس پر یگانہ چڑھتی تھیں۔ اس سے بڑی درختوں کی آنکھوں سے جھٹی رہتی تھی۔ وہ
کادوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔ قدوس صاحب جو آنکھوں کے والد ہیں اولاد پریندہ ہونے پر اپنی
بہنوں کو ساری زندگی ہاتھیں سناتے رہے۔ انہیں آنکھوں کا کاج جانا پسند نہیں تھا۔ باجروہ آنکھوں کے پار (جو اس
میں ہی گھولا ہوا تھا) اور گھر کی عورتیں ہونے پر گھر میں بیٹے بچانے کی خاطر اس کے پاس آتی تھیں کہ وہ ہم
میں بہترین کام کرتی تھی) اور کوچنگ سے منے والی آمدنی کے گھر کا تیس تو قدوس صاحب کی ناہیلا چاہتی
تھی۔ آنکھوں بھی ان کی جی جی کی زندگی رہتی تھی۔ طرمان ولی جدی پیشی رہیں ہے۔ Perfection اس کی
ہی ہے۔ ذرا بھی غصے سے برداشت نہیں خواہ وہ چیز اسے جی ہی عزیز کیوں نہ ہو۔ وہ اپنے گھر سے جتن

فصل نمبر 17



ی عزیز از جان بیوی پر تہمت لگا رہی ہو، بالفرض میں مان بھی لوں کہ تم سچ کہہ رہی ہو تو تم بھی ماضی یاد کرو، تم
 وہاں سے بھائی کا نشان نے خود شرط لگا لی تھی آئینہ کو ٹپ کرنے کی اور تم لوگ افسوس کرتے رہ گئے تھے کہ یہ تم
 وہاں کو بے وقوف بنا گئی۔ تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ آئینہ بد کردار ہے۔ جب تم لوگ اس سے شرط لگا سکتے ہو تو کیا یہ تم
 وہاں کو ہر انہیں سکتی؟

"She is een player!" اور افسوس کے تم لوگ ہار گئے۔"

آئینہ بقیہ وق رہ گئی تھی۔ عرشان ولی کی کیا کہہ رہا تھا۔ اپنے بازو پر اس کے ہاتھ کا بڑھتا دباؤ اور اس کے لبوں
 نکلنے والا ایک ایک لفظ آئینہ کو تھیر میں جتلا کرتا جا رہا تھا۔ آئینہ کی حالت دیکھ کر زویا جیسی شاطر کھلاڑی جان
 لی تھی کہ وہ سچائی کے بعد خوفزدہ ہو گئی ہے، اس نے سچ چھپا رکھا ہے۔ عرشان ولی بھی سچ جان کر اس کو خود سے
 ہنسک دے گا لیکن وہ تو مزید اس پر اپنی ذات کا مان دکھا رہا تھا۔ الٹا ہی اثر ہوا تھا۔

"اگر تمہاری بیوی اتنی ہی سچی ہے تو پوچھو اس سے، کیسے اس کے جھوٹ کا انعام تمہارے لیے صورت دیا تھا۔
 مایہ ناز نہیں ہوگی۔"

باقی نگاہ سے متوجہ ہوتے وہ آئینہ پر ہنس رہی تھی۔ آئینہ تو مارے شرم کے نگاہ پھیر گئی۔ عرشان ولی کے
 سے سرسرا خون سمٹ گیا۔

"آئینہ چاہے تو وہی پھر میں سودیت لوں گا سکتی ہے کیونکہ وہ تمہارے سچے سچے اس کی غربت کے منہ پر مارا تھا۔
 اب کہ آج یہ تم سے کہیں زیادہ مالدار ہے۔ لیکن نہیں آئینہ تمہاری طرح پستی میں نہیں گرے گی۔" عرشان ولی
 ہنستے ہوئے بھڑکا رہا تھا۔

"زویا جی کچھ جھڑپیں پر پڑتے ہیں اور کچھ دھڑپیں۔ تم نے اپنی اوقات تو جسم پر ہی دکھائی ہوگی لیکن
 ہر کے پھڑکی گونج تمہیں ساری زندگی محسوس ہوگی کہ جس سے تم محبت کی آج تک بھیک مانگتی رہیں۔ وہ
 جس اسی آئینہ کے لیے پاگل ہے۔ تمہاری نظریں میں حقیر ہے۔ آئینہ کی نظریں میں میرے پہلو میں ہے اور تم۔"

وہ ذرا کی ذرا کرنا نظریں زویا کے عجیب و غریب حلیے پر نہیں۔ اس کی نظریں کی حقیر پر زویا کو آگ لگ گئی
 تھی۔ آئینہ تو کچھ بولنے کے قابل ہی نہیں تھی۔ وہ سن ہوتے دماغ سے عرشان ولی کی باتیں سن رہی تھی وہ کس
 نہانی سے اس کی پیشی کا مقدمہ لڑ رہا تھا کہ مقابل کھڑی زبان دراز زویا ساکت رہ گئی تھی۔

"کیا میں؟" زویا پھنکارا۔
 "تم آج بھی محروم، میری توجہ کی بھیک مانگتی پھر رہی ہو۔" اسے اچھی طرح سے آئینہ دکھا کر وہ ساکت کھڑی
 زور کو بازو کے حصار میں لیے آگے بڑھ گیا تھا، زویا کا وجود جلتی بھٹی میں گر گیا تھا۔

☆.....☆

یعنی افریاد صاحب کے اصرار پر رک تو گئی تھی مگر ماہ پارہ کو دیکھ دیکھ کر اس کا ضبط جواب دے رہا تھا وہ جس
 طرح تسخراڑاتی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں اس کی خاموشی پر ہنس رہی تھیں۔ یہ سب سچی کی برداشت سے
 نہیں زیادہ تھا کھانے پینے کی چیزوں کو ٹیسٹ سے زیادہ اس نے کبھی اہمیت نہیں دی تھی مگر اب وہ کچھ بھی
 ماننے پینے پر کوشش ہو جاتی تھی۔ اس میں کچھ ملا ہوا تو نہیں ہے؟ انجانے میں اس کے ساتھ اتنا برا ہو چکا تھا
 کہ وہ اب ڈرنے لگی تھی۔ اسے لگ رہا تھا وہ ایک ہی سچ پر سوچ سوچ کے پاگل ہو جائے گی۔ تب ہی چند دن
 لیے میکے جانے کی پیلینگ کرنے لگی جسے دیکھ کر شاہ میر گھبراتے ہوئے کچھ اور سمجھا تھا۔

کمرے کی زینت بنا دیتا تھا مگر خود سے جدا کرنا گوارا نہیں تھا۔ عرشان ولی وجاہت کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ وہ بے
 ہمدرد دل رکھتا تھا۔ ماہ پارہ بے حد تک چڑھی اور ماڈرن خاتون ہیں۔ عرشان ولی کی والدہ محترمہ، افریاد صاحب
 پارہ کے مزاج کے بالکل برعکس بہت اچھے انسان ہیں۔ ماہ پارہ اور افریاد صاحب کی تین اولادیں ہیں۔ اما
 بڑی بیٹی ہے جو اپنے شوہر راجیل اور تین بچوں کے ساتھ شارجہ میں رہتی ہے۔ راجیل لالچی انسان ہے۔ اسرار
 پارہ کی طرح تنگ مزاج ہے۔ اسرار سے چھوٹا سا میر ہے۔ محنتی، شاہ میر کی بیوی ہے جسے کسی صورتی کے باعث
 ماہ پارہ جلی جی سناٹی تھیں۔ محنتی کی شادی کو پانچ سال ہو گئے تھے وہ ابھی تک بے اولاد کی کا شکار تھی۔ محنتی سلیجے مزاج
 کی لڑکی ہے۔ ماہ پارہ کی بیٹ فریڈ واصف کی دو اولاد ہے۔ کا شان اور زویا۔ کا شان بھنورا واصف انسان ہے
 فٹ اس کا سن پسند مشغلہ ہے۔ زویا تک چڑھی لڑکی ہے۔ وہ عرشان ولی کو پسند کرتی ہے۔ اس کی نظر کرم حاصل
 کرنے کے جتن کرتی رہتی ہے۔ تینوں بچپن سے دوست ہیں۔ آئینہ نے زویا سے بڑے بچپن کے دوست کی دوستی کی تھی
 کا شان کی صورت میں محروم زندگی سے جھکا رہا حاصل کرنا چاہتی تھی۔ زویا نے کا شان کو چھوٹا کر دیا تھا کہ وہ آئینہ
 فٹ کر کے دکھائے تو وہ استاد مان لے گی۔ کا شان نے چھوٹے بچوں کو لایا تھا جلد ہی اس نے آئینہ سے دوستی کر لی
 اسے سوٹ اور سیل فون گفٹ کیا۔ جدید اسارٹ فون استعمال کرنا آئینہ کو مشکل لگ رہا تھا۔ عرشان ولی، کا شان
 اس کی حرکتوں پر بے نقط کی سناٹا ہوتا تھا۔ اسے ان لڑکیوں پر غصہ آتا تھا جو کا شان کا شکار بنتی تھیں۔ وہ اپنی محبت
 اور جذبے اس کے لیے سمجھا لے بیٹھا تھا جو صرف اس کی ہوتی۔ ولید عرشان ولی کا بیٹ فریڈ ہے۔ (اب آپ
 آگے پڑھیں)

☆.....☆

"مسز عرشان ولی! وہاں ریش! زویا کی آنکھوں میں زمانے بھر کا حقیر سمٹ آیا تھا۔ آئینہ کو اتنے منٹے
 میں دیکھ کر وہ پہلے ہی چوکی تھی۔ اسے لگا تھا وہ ریش میں جلتے جلتے یوں ہی عرشان ولی کے قریب آگئی تھی لیکن
 عرشان ولی نے جس طرح اسے تھام کر اپنے پہلو میں کھرا کر کے تعارف کروایا تھا، اس سے زویا کی آنکھیں
 اٹلنے کو بے تاب ہو گئیں۔

آئینہ جس قیامت کی گھڑی کے نہ آنے کی دعائیں کرتی رہی تھی، وہ گھڑی بالآخر آئی گئی تھی۔ اس کی سانسیں
 اٹکنے لگیں۔ وجود بے جان ہونے لگا عرشان ولی کے بازو کا گھیرا ہوا ہوتا تو کچھ عجیب تھا وہ فرش پر بے ہوش پڑ
 ملتی۔ اس کا ٹھنڈا ہوتا وجود عرشان ولی کو تشویش میں مبتلا کر کے اس کے بازو کو جتن سے تھامنے پر مجبور کر گیا۔ اسے
 دونوں کے انداز پر حیرانگی ہو رہی تھی۔

"بہت خوب، تو داد دوں آپ کی پسند کو....." قریب آتے ہوئے زویا نے تسخراڑے انداز میں تالی بجاتی تھی
 عرشان ولی، آئینہ کے بے جان وجود کو اپنے حصار میں لیے زویا کے انداز کو تنبیہ کی سے دیکھ رہا تھا۔

"مجھے شکرا کرتی ہوں اس چال باز لڑکی کا انتخاب کیا جس نے امیر بننے کی خواہش میں کا شان کے ساتھ وہ
 گزرا۔" زویا نے زہرا گل دیا تھا۔ آئینہ کے وجود پر پہلی طاری ہو گئی تھی۔ وہ بھی چھٹی آنکھوں سے زویا
 چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ آج بھی اتنی ہی مغرور اور صہمندی تھی اس کی نظر پہلو میں موجود حصار میں لیے عرشان
 ولی پر نہ اٹھ سکیں۔ نگاہیں اتنی بہت ہی نہ ہوئی۔

"تم تو کہتے تھے بڑی با کردار بیوی لاؤ گے پھر..... اس بچہ کا انتخاب کیسے کر لیا ہے تم بدل گئے تمہارا
 چوہا؟" زویا منہ بھر بھر کے باتیں سن رہی تھی۔ "موت کو ٹھکرائے جانے کا غم نہیں بھولتا۔ وہ زخمی ناگن کی طرح
 پیچھا لے لیتی ہے، تمہارا بھی یہی حال ہے زویا۔ تم آج تک مجھ سے انتقام لینے کے لیے بے چین ہو، اس

”جی! ڈیڈ نے کہا تھا تاہم ان کے آنے تک کوئی فیصلہ نالو۔ تم بھی مان گئی تھیں۔ پھر کہاں جا رہے متوجس نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔“

”میں چند دنوں کے لیے ممبئی کی طرف جا رہی ہوں۔ آئی ہو تب تک پاپا لوٹ آئیں۔ یہاں رہا ہے۔ چند دن سکون سے رہنا چاہتی ہوں۔“

پینک مرتے اس نے فرسٹریشن بھرے انداز سے کہا۔ وہ ذہنی طور پر بے حد مضرب لگ رہی تھی۔ بھی روکنا مناسب نہ سمجھا۔ اس خیال سے کہ شاید چند دن انہوں کے درمیان رہے اس کا موڈ بہتچ ہو جا چکی تھی لیکن شاہ میر کو اس کی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جانتا تھا۔ جتنی مٹنے بہت مہرے کر رہی تھی۔ اسے میر کے ساتھ ہی سکون ملتا تھا لیکن آج دو روز ہو گئے تھے۔ جتنی لوٹ کر نہیں آئی تھی۔ جانے کیا بات انتہائی فیصلہ کر گئی تھی۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ شل ہو چکا تھا مگر کوئی بھی سہرا ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بھی آفس سے آکر پور ہو رہا تھا۔ تب ہی ممبئی کو کال کر گیا۔

”میں پور ہو رہا ہوں، سب تک آؤ گی؟“ رشی سلام دعا کے بعد وہ فوراً مدے پر آ گیا۔

”دو دن ہی تو ہوئے ہیں۔“ جتنی نے حیرانی سے کہا۔

”سو داٹ؟ یونو میں نہیں رہتا کیا اور سیرم جا کے مینکیشن بھی ہو چکی ان پانچ سالوں میں۔“ وہ جھنجھلا رہا تھا۔

”پانچ سالوں میں ایسی صورت حال بھی پیش نہیں آئی۔ عادت ڈال لو اگر تم نے میری الگ گھر کی پوری نہیں کی تو ہم دونوں کو ہمیشہ کیا ہی رہنا ہوگا۔“ جتنی کا یا سیت بھر اچھے آخر میں خشک ہو گیا تھا۔

”شٹ اپ جتنی! جودل میں آ رہا ہے بول دیتی ہو۔ کچھ بتاتی بھی نہیں ہو۔“ وہ چڑا۔

جتنی خاموش ہی رہی۔ ایک ماہ پارہ کے علاوہ اسے کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ شاہ میر کا رویہ بھی اس ساتھ بہت اچھا ہوتا تھا۔ اتنے سال اولاد نہ ہونے کے باوجود شاہ میر نے آج تک اسے موردِ ازار نہیں کیا تھا۔ اولاد کی خواہش اس کے دل میں بھی لیکن وہ جتنی سے ذکر کر کے اسے دیکھ نہیں کرتا تھا۔ وہ ہی اکثر دولا چیک اپ کی بات کر کے زور دینا ہوجاتی تھی۔ وہ اسے سمجھا تھا۔ اللہ کے کاموں کی مصلحت پر بہلنا تھا۔

”میں کل آؤں گا آفس سے تمہیں پک کرنے، تیاری رکھنا اگر زیادہ فرسٹر ہو رہی ہو تو فاران کا ایک رکھ لیتے ہیں۔ منظور ہے؟“

جتنی چپ ہو گئی تھی۔ شاہ میر نے دوبارہ کہا تو اس نے بے دلی سے ہائی بھر لی کہ شاید فاران ٹرپ سے اسے موڈ چنچ ہو جائے۔

☆.....☆

جس طوفان کے آنے سے وہ خوفزدہ تھی، لرز رہی تھی کہ آیا تو سب کچھ تمہیں نہیں کر دے گا۔ وہ اتنی خاموشی آ کر چلا بھی گیا کہ آنسو رکوا تب یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ جیسے خواب کی کیفیت میں تھی۔ عرشان ولی نے اس طرح زویا کو Silent Slap مارا تھا۔ اس کا دفاع کر رہا تھا۔ آنسو سے بنا بدگمانی جتائے، بنا غصہ کیے وہ زور خوش ہونے کے موقع سے محروم کر گیا کہ وہ کچھ جانتا نہیں۔ اس کے انداز نے زویا کو یہی باور کروایا تھا کہ ساری حقیقت سے آگاہ تھا اور اسے منہ کی کھائی پڑی تھی۔

راستے بھر خاموشی رہی، اس کے لرزتے وجود کو نرمی سے فرنٹ سیٹ پر بٹھا کر اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ شاید اب وہ لعن طعن کرے۔ غصہ کرے، چلائے آنسو اس خوف سے لرزتی رہی تھی اور جب کئی عرصے گزرے

لاہری اپنا سفر تیزی سے کرتی رہی تو عرشان ولی کی خاموشی کا خوف آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے بہنے لگا۔ ندی میں کبھی اتنی شرمندگی نہیں ہوئی تھی جتنی اس وقت، اس گھڑی محسوس رہی تھی۔ وہ یقیناً اچھی لڑکی نہیں تھی۔ اس نے اپنا نصیب خود کھنے کے لالچ میں اپنے دامن پر داغ لگا لیا تھا اور اسے اتنا ہی اعلیٰ کردار کا نفس ہوا تھا جس نے اس کی زندگی کے رنگوں کو بدل کے رکھ دیا تھا۔ بنا کچھ کہے عرشان ولی نے خاموشی سے ٹشو کی طرف بڑھائے تھے۔ وہ چند ثانیے اسے دیکھتی رہی تھی۔ اس پر ایک نگاہ ڈال کر عرشان ولی نے نظریں اونٹ پر جمادیں تھیں۔

لہر آگیا تھا۔ اسے اترنے کا اشارہ کر کے وہ بھی اتر آیا تھا۔ اتنا خاموش سفر آج سے پہلے ان کے درمیان نہیں ہوا تھا۔ آنسو بہا شکلِ روم تک آئی تھی۔ اس کی ٹانگیں بے جان ہو رہی تھیں۔ ٹانگوں میں مزید کڑھار پہنے کی محسوس نہ ہوئی تو وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ عرشان ولی کف لکس نکالتے ڈرائیونگ سر میں اس کے وجود کو دیکھ رہا زویا کو دیکھ کر وہ جس قدر بے جان ہو گئی تھی اس نے عرشان ولی پر سب کھول دیا تھا۔ تب ہی اس پر اپنی آنکھیں ڈال کر اس نے آنسو کے وجود کو بکھرنے سے بچا لیا تھا۔ زویا کے سامنے چھوٹا پڑے نہیں دیا تھا۔ وہ اپنی آنسو بھاری آنکھوں میں عرشان ولی اس تک آیا تھا۔

”جب جان کی بات ہے تو دل کا نشان فیلٹی فرینڈ ہیں۔ تب بھی تم نے سچ نہیں بتایا کیوں؟“

وہ اس کے سامنے نرم لہجے میں انتشار کر رہا تھا۔ ورنہ اس کی سماعت تو کھن گرج کی منتظر تھی۔ وہ مزید شدت رونے لگی۔ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

”مافی میں تم نے جو کیا، کیوں کیا؟“ اس نے سوال نہیں کر رہا لیکن میرے ہزار بار کے کہنے کے باوجود تم نے اسے اتنی بڑی حقیقت کیوں چھپائی؟“ اس کے سامنے دبا دبا غصہ جھلکے لگا تھا۔ مزید چپ رہتی تو شاید اور بوجھتی۔

”ڈر گئی تھی۔ آپ جو ذرا سی بدنامی پاس نہیں رکھتے۔ جب میرے بارے میں جانتے کہ خوش حال زندگی لائی ہیں، میں نے چند دن نادانی میں گتوائے ہیں تو کہیں آپ مجھے محسوس دیں۔ صرف اسی خوف سے چپ ل۔“ وہ وقت بول گئی۔

”میں پرمیشن کا قائل ہوں اور مجھے تم سے دیوانوں کی طرح محبت ہے۔ دونوں میں سے مجھے کسی ایک کو چننا ہے۔ آج میری زندگی کا اصل امتحان ہے۔ تم نے تو عرشان ولی کی کمزوری بن کر اسے ہلا کر رکھا۔“ وہ نے خود یہ ہنسا تھا۔ آنسو رکوا اس کی ہنسی بہت دل شکن لگی۔ اس کے اندر جیسے بھا بھڑ جل رہے تھے لیکن بظاہر اپنی سچ سے ہلا کر پرسکون ظاہر تھا۔

”دونوں صورتوں میں ہار میری ہے۔ مجھے قبول ہے کہ مجھے ایسی لڑکی چاہیے تھی جس کی زندگی میں کبھی کوئی درد نہ رہا ہو لیکن.....“

وہ ذرا دیر کر کہہ رہا تھا۔ اس کی خاموشی پر آنسو کا دم جیسے اگلنے لگا۔

”حیرانگی تو مجھے اس بات پر ہو رہی ہے کہ ساری حقیقت جان کر بھی میں تم سے نفرت کا جذبہ اپنے اندر محسوس نہیں کر رہا۔ وہاں تمہارے لیے بے پناہ محبت ہی ہے۔“

میری نظر میں نہ ہی تمہاری عزت میں کمی آئی لیکن ایک پن کی چھیر رہی ہے۔ اندر ایسا کیوں ہوا؟ قصور تمہارا نہیں میرا ہے جو میں نے آج تک تم سے پوچھا نہیں کہ تمہاری زندگی میں کوئی مردہ چکا ہے یا نہیں؟“ اسے مورد

الزام ٹھہرانے کی بجائے وہ بڑی آسانی سے سارا الزام اپنے کھاتے میں ڈال گیا۔ آنسو رساکت اسے دیکھتی رہی۔
”میں نے بار بار دعویٰ کیا مجھے تم سے محبت ہے اور اب اسی دعویٰ کو ثابت کرنے کا وقت آ گیا ہے۔“
”Amazing“ وہ جیسے پھر خود پر ہنسا۔

آنسو کو بڑا عجیب لگا۔ اس نے دزدیدہ نظروں سے رینجکٹ روم کے دروازے کو دیکھا تھا۔ وہ ذہنی طور پر
تھی کہ وہی اس کا ٹھکانا تھا۔ عرشان ولی اس پر چیخ چلا نہیں رہا تھا مگر اس کے لہجے سے دیکھ عیاں تھا۔
اعتبار، مان، محبت کو بہت ٹھیس پہنچی تھی۔
وہ اوش روم میں بند ہو گیا تھا۔ جنکھوں میں فریش ہو کر واپس آیا تو آنسو کو سابقہ انداز میں دیکھ کر دوبارہ
کی طرف آیا۔

”میں آپ کے پاؤں چپو کر معافی مانگنے کو تیار ہوں۔ پلیز میری پہلی بھول سمجھ کر معاف کر دیں۔“
سامنے ہاتھ جوڑتی وہ اس کے پیر کی طرف جھکنے لگی تھی۔ عرشان ولی نے اس کے دونوں شانے تھام کر اسے
سے روکا تھا۔

”اگر تم نے ایسی ویسی حرکت کر کے خود کو میرے سامنے دوبارہ جھکایا تو شاید میں کوئی انتہائی فیصلہ کر لوں
اس کا لہجہ ایک دم برقرار چلا تھا۔ آنسو ایک دم سے ہٹھک گئی۔ وہ بہت سنجیدہ لگ رہا تھا۔
”سو جاؤ آرام سے۔“ اسے سونے کا مشورہ دے کر وہ نکیہ اور جادو اٹھانے لگا۔

”یہ!“ وہ اس کے انداز پر توتوتی ہو کر چیخوں کی طرف اشارہ کر گئی۔ اسے لگا وہ سزا سناتے لگا ہے۔
”جب قصور میرا ہے تو سزا نہیں دینا۔“ عرشان ولی کے کاز کو ٹھیس لگی ہے۔ بے سکونی طور
گی۔ تم ریلیکس ہو کر سو جاؤ۔“ نکیہ اور جادو ریل میں آئے وہ آگے بڑھ گیا۔ اگلے ہی لمحے رینجکٹ روم کا دروازہ
کھول کر اندر جا کے دروازہ بند کر گیا تو لاک کی کھٹ کے ساتھ آنسو کا دل بھی دھک سے رہ گیا۔ آنکھیں پھٹی
پھٹی رہ گئیں۔

کر دوڑوں اربوں جتنی خوبیوں والا شخص محبت کے آگے خود کو بے چارہ ثابت کر گیا تھا۔
وہ شخص اوروں سے واقعی بے حد جدا تھا جو اسے سزا دینے کی بجائے اسے سزا جوڑ کر گیا تھا۔ آنسو
آنسوؤں میں ایک بار پھر روانی آ گئی۔

☆.....☆

”کہاں تھیں تم میں کب سے تمہارا ویٹ کر رہا تھا۔ ایک رانگ نیوز ستانی ہے۔“
زویا غصے سے بھری گھر میں داخل ہوئی تو کاشان کو اپنا منتظر پا کر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ دماغ اتنا گھوم گیا
کہ اس نے آتے ہوئے آج کی ساری شوٹ ہی کینسل کر دی تھی۔

”سناء رانگ نیوز، پھر میں تمہیں شاکنگ نیوز سناؤں گی۔“ اس نے لفظ چبائے۔
”کیا وہاں بڑی غصے میں لگ رہی ہو؟“ کاشان کو تشویش ہوئی۔
”تم بولو، تمہارے پاس کون سی نیوز ہے۔“ اس نے خود کو کپوز کیا۔

”تمہیں وہ دھوکے باز آنسو یاد ہے۔ میں نے اسے آئس بار میں دیکھا۔ بڑی سی گاڑی سے نکلتی تھی لیکن
ہی گنوا سی ٹیلی ٹی وی جو تینا اس کی ہوگی چالا کو ماسی نے پاپی لیا سب کچھ۔ پھانس لیا ہو گا کسی کو۔“
کاشان نے زویا کو دیکھا اس کے ذکر کرنے پر بھی زویا کا کوئی رد عمل سامنے نہیں آیا تھا۔ جس پر اسے تعجب

الاور زویا کا خون اس بار پھر آنسو کے ذکر پر اٹھنے لگا۔

”عرشان ولی کو پھانس رکھا ہے اس نے۔ مسر عرشان ولی بن چکی ہے۔“ زویا نے سانپ کی سی پھنکار سے کہا۔
”Oh! No I can't believe this!“ کاشان شاکد ہو کر اسے دیکھتا رہا۔

”ابھی مل کر آ رہی ہوں، دونوں سے بڑے فخر سے تعارف کروا رہا تھا عرشان۔“ اس کا روم روم سلگ رہا تھا۔
”تم نے ذلیل نہیں کیا کہ یہ وہی لڑکی ہے۔ کہاں گئی اس کی پارسانی کی کہنیاں؟“ کاشان کو حیرانی ہوئی۔
”سنا آئی ہوں۔ التا ذلیل کر دیا کہ میں اس کی توجہ کی ابھی تک بھکارن ہوں اور وہ زندگی بنی بیٹھی ہے۔ اور
تو یہی ہے کہ ہمارو مجھے ہی ہوئی ہے۔“ آخر میں وہ زور درج ہوئی۔

”Don't be silly!“ اپ سیٹ نہ ہو۔ ابھی تو جھپٹی باری کی سزا نہیں ملی تھی اسے اور اس نے تمہاری جگہ
منانے کی گستاخی کی اب تم دیکھنا میں کیسا کھیل کھیلتا ہوں۔“ کاشان کا شاطر ذہن کچھ سوچنے لگا تھا۔

☆.....☆

میری چاہت کی بہت لمبی سزا دو مجھ کو
کرب تنہائی میں جینے کی دعا دو مجھ کو
حال بے حال ہے تاریک ہے مستقبل بھی!
بن پڑے تم سے تو ماسی میرا لا دو مجھ کو

عرشان ولی کے رینجکٹ روم میں بند ہونے پر وہ کئی لمحے شاکد رہی لیکن جب حواس آہستہ آہستہ بحال
ہوئے تو اسے معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔
وہ بھاگ کر گئی تھی لیکن تب تک دروازہ بند ہو چکا تھا۔ اس نے عالم دیوانگی میں دروازہ بجایا لیکن اندر سے
وہ جواب موصول نہیں ہوا۔

”عرشان۔“ دروازہ بجاتے وہ مسلسل آواز دینے لگی تھی۔
”عرشان پلیز دروازہ کھولیں۔“ اسے پکار پکار کر اس کا گلا دھنے لگا تھا۔ جانے اس تک آواز نہیں جا رہی تھی یا
وہ جان بوجھ کر اس کی آواز سننا نہیں چاہ رہا تھا۔ چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ دروازے سے لگ کر بیٹھی چلی گئی
تھی۔ وہ اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہی تھی لیکن سننے والا کوئی نہیں تھا۔ عرشان ولی کو رینجکٹ روم میں بند دیکھ
اس کا جگر ٹک رہا تھا۔ سزا کی حق دار تو وہ بھی مگر وہ اپنے لیے سزا جوڑ کر گیا تھا۔

صبح عرشان ولی نے دروازہ کھولا تو اس کے وجود کو جھٹکا سا لگا، جنوں میں حواس جاگے تو اس نے بے ساختہ سر
اٹھا کر عرشان ولی کو دیکھا۔ وہ بھی اسے دروازے سے لگے دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ وہ ساری رات بند دروازے
نے کی بیٹھی رہی تھی۔ یہ اس کے چہرے سے ظاہر تھا۔ وہ بے ساختہ جھک کر اسے دونوں شانوں سے تھام کر اٹھا
یا۔ بیڈ پر بٹھاتے مقابل بیٹھ گیا۔

”سوئی کیوں نہیں؟“ چہرے پر آئے بالوں کو کان کے پیچھے کرتے استفسار کر رہا تھا۔
”آپ کیوں نہیں سوئے؟“ آنسو اس کی آنکھوں کے گلابی ڈوروں کو بے خودی سے دیکھ رہی تھی۔ ہمیشہ
ناتازہ رہنے والا متصل اور پڑ مردہ لگ رہا تھا۔

”شاید اب کبھی نہ سو سکوں۔“ وہ آزار دہی سے مسکرایا۔
”لیکن تم سو جایا کرنا۔“

اس کے انداز پر آنسو کا دل ایک بار پھر کر لانے لگا۔ بجائے غصہ، لعن طعن، ڈانٹ ڈپٹ اس کے دھجیاں کھیرنے کے وہ اس سے نرمی برت رہا تھا۔ وہ تڑپ اٹھی۔
 ”مجھے ڈانٹ لیں، مار لیں، جتنا برا بھلا بولنا ہے بول لیں لیکن اپنے ساتھ ایسا سلوک نہ کریں۔ ہوں، مجھے سزا دیں..... میں ساری زندگی آپ کی ڈیقلیڈ چیزوں کے ساتھ گزار لوں گی، ابھی گلہ نہیں کرنا کیونکہ کردار میرا دغا دار ہے۔“

وہ حقیقت پسندی سے اعتراف کر کے اپنے لیے سزا کی خواہش گارتھی۔ عرشان ولی کا یہ انداز، سب کچھ کے بعد بھی ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اس سے شدید محبت کرتا تھا۔ وہیں اس انداز پر وہ اپنی ہی نظروں میں گر رہا تھا۔ وہ ڈانٹ ڈپٹ کر بھڑاس نکال لیتا تو اس کی خلش بھی کم ہو جاتی مگر وہ تو اس سلسلے میں کوئی بات ہی نہیں کر دے کوئی تفتیش نہیں۔ کوئی تہمت نہیں۔

اور وہ مزید بڑھتا ہوا ہو رہی تھی احساس جرم اسے کھانے لگا تھا۔ اس کے ملول چہرے پر نظر ڈالتے عرشان نے مسکراتے ہوئے اس کی باتیں سنی تھیں۔

”وہ جگہ کہاں سے لائیں کہ ہمیں ڈانٹ ڈپٹ سکوں، تمہیں مار سکوں؟ تمہارے معاملے میں بالکل واضح ہوا ہوں۔ کوئی تمہیں ٹھٹھی نگاہ سے دیکھے یہ سوچ کر ہی اس کی آنکھیں نکال دوں گا، پھر تم پر ظلم کیسے کروا دے دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔ آنسو کی سسکیاں نکلنے لگی تھیں۔ کیسا شخص تھا وہ۔“

”آئندہ سے ساری رات دروازے سے لٹک کر بے آرام ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری ہر دستک انتہائی فیصلہ کرنے پر مجبور کر دے گی۔ رات بھی میں نے بہت ضبط کیا ہے۔ اب سے ایسا کرو گی تو اس کے عرشان ولی کا مردہ وجود ہی نکلتے دیکھو گی اور میں بار بار فیصلہ نہیں کرتا۔“

اس کے بے لگ لہجے اور انتہائی فیصلے کا سن کر آنسو کے آنسو ٹھک گئے تھے۔ وہ سہم کر اس کی شکل دیکھ لگی۔ ساری رات گئی جاگتی آنکھیں، ستا چہرہ ظاہر کر رہا تھا کہ آنسو نے اسے کس کرب میں مبتلا کر دیا تھا۔ حقیقت جان کر اس نے آنسو کا مورال زویا کے سامنے ڈاؤن ہونے نہیں دیا مگر خود خشک چوں کی طرح کھڑ گیا تھا۔ یقین، پرنیشن کی موت پر خود اذیت میں گھر گیا تھا لیکن اس سے بات کر کے ہونے نہ لہجے میں سختی آئی تھی لفظوں میں کھدرا ہٹ نفرت کا شائبہ بھی نہیں تھا۔

”بھری پہلی اور آخری غلطی سمجھ کر معاف کر دیں پلیز۔“ وہ بے ساختہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ گئی۔

”پھر بھی دوبارہ یہ حرکت نہ کرنا میرے سامنے۔“ سرزنش کرتے وہ اس کے جڑے ہاتھ کھول گیا۔

”جیسا بولیں گے ویسا کروں گی۔ بھول جائیں اس واقعے کو میرا یقین کریں میں نے کوئی اخلاق سے ہوئی حرکت نہیں کی بس فون پر باتیں اور چند ملاقاتیں۔“ عرشان ولی نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا تھا۔ چہرے پر سختی آ گئی تھی۔ آنکھیں مزید گلابی ہونے لگیں۔

”پھر بھی ان باتوں کو مت دہراتا میرے سامنے۔ ورنہ شاید میں خود پر ضبط کھو کر کچھ کر جاؤں۔“ وہ سختی باور کردار ہاتھا۔

”آپ بھول نہیں سکتے۔“ التجا یہ انداز تھا۔

”نہیں!“ دو ٹوک لہجے میں کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اپنے کپڑے نکالنے کے لیے وارڈ روب کی طرف بڑھ گیا۔
 ”ناشتے پر سب ویٹ کریں گے، تم بھی اٹھ کے فریش ہو جاؤ، پھر ناشتے کے بعد سونا جانا تاکہ فینڈ پوری ہو سکے۔“

بے نکال کر دوش روم کی طرف جاتے وہ اسے ٹاٹل لہجے میں کہہ رہا تھا۔ بظاہر اس کے انداز میں کوئی اعتراض نہیں آ رہا تھا لیکن ایک سردہری کی دیوار آنسو کو خود پر گرنی محسوس ہو رہی تھی۔

☆.....☆

”جہاں ہوتی ہو تم جو خشک ہی نظر نہیں آتی تمہاری تو۔ میں تم سے ایک بات کرنا چاہ رہی ہوں۔“
 ناشتے کی میز پر خلاف معمول زویا کو دیکھ کر واصفہ کو خوشی ہوئی۔ ماڈلنگ میں آنے کے بعد سے وہ مزید سخت لہجے کرنے لگی تھی جس کی وجہ سے کم ہی کھانے کی میز پر نظر آتی تھی۔ اس کی صبح ہی دین چڑھے ہوتی تھی۔ جو کچا کھانا پینا ہوتا تھا ملازم روم میں پہنچا دیتے تھے پھر گھر سے جو کتنی تورات تک ہی لپٹی تھی۔ ایسے میں واصفہ کا کئی دن اس سے سامنا ہی نہیں ہوتا تھا کہ واصفہ کی اپنی بھی سوشل سرگرمیاں تھیں۔

”ابھی بھی کیا خاص بات ہے؟“ ناشتا کرتے ہوئے کا شان نے دچسبی ظاہر کی۔ جس پتی زویا بے توجہی بنتی ان کے بولنے کی منتظر تھی۔

”عرشان کے حوالے سے بات کرنی تھی۔“ کا شان کے جیم لگاتے ہاتھ ایک پل کور کے اس کی نظر بے اختیار زویا پر اٹھی تھی۔ عرشان کا نام سنتے ہی اس کی ساری بے توجہی اڑن چھو ہو گئی تھی۔

”ماہ پارہ سے بات ہوئی تھی پھری، میں نے بہت گلہ کیا، عرشان کی شادی کے حوالے سے وہ بہت معذرت رینی تھی۔ اسے بھی اپنی بہو پتھر نہیں عرشان کی ضد پر بیاہ تو لائی ہے مگر وہ آج بھی چاہتی ہے کہ زویا کی شادی شان سے ہو جائے۔ رہی پہلی بیوی تو اس کا کیا ہے ایک بار شادی ہو جائے تو زویا اسے خود طلاق دلا دے گی۔“ واصفہ کہہ رہی تھیں اور کا شان زویا کی شکل دیکھنے لگا۔

”پاپان تو یہ بھی بڑا سولہ ہے س۔ آنسو کی حقیقت جان کر عرشان ولی نے بھلے تمہارے سامنے بھرم رکھا ہو۔“

”نہیں سب اس کی نیچر بہت اچھے سے جانتے ہیں۔“
 آنسو اب تک رینجیٹ روم کا حصہ بن چکی ہوگی۔ ہمیں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ دونوں کے رشتے میں دراڑ تو پہلے ہی آ گئی ہوگی اور جب ماہ پارہ آئی ہمارے ساتھ ہوں گی تو پھر کتنی پرسنٹ کام تو ویسے ہی بن گیا، کیا کہتی ہو؟“

کا شان ہر اینگل سے سوچ کر زویا کی رائے جاننا چاہ رہا تھا۔ زویا کا انداز پر سوچ ہو گیا۔

”یہ سچ تھا کہ اسے عرشان ولی جیسا ہم سفر چاہیے تھا مگر اس خواہش کے ہاتھوں اب تک اس کی جتنی بے عزتی ہو چکی تھی وہ جتنا ذلیل کر چکا تھا اسے عرشان ولی سے نفرت سی ہونے لگی تھی۔ وہ اب اسے ہر حال میں نیچا دکھانا چاہتی تھی۔“

”ایگری اچھا پلان ہے۔ مجھے اب عرشان ولی سے شادی کرنے کا کوئی شوق نہیں لیکن اب میں وہ بھی کروں گا اور نکاح کے بعد جلد ہی اس سے طلاق لے کر اسے نیچا دکھا کر چھوڑ دوں گی۔“ وہ چھنک رہی۔

”اسے نیچا دکھانے کے لیے اپنی ذات کو داغدار کرنا کیا یہ مناسب رہے گا؟“ کا شان کا انداز پر سوچ تھا۔ زویا کی نسبت وہ کم جذباتی تھا۔

”مجھے بس اس سے انتقام لینا ہے۔ خواہ کتنا ہی نقصان ہو، پروا نہیں۔ ماما آپ ماہ پارہ آئی تھی سے بات کریں۔ میں راضی ہوں۔“

اس لہجے میں کہتے اس نے واصفہ کی طرف دیکھا۔ جو کب سے ہونٹ کی طرح ان دونوں کی شکلیں دیکھتیں

لیوں بنانے کا آرڈر آفس سے دے رہے۔“ ہلکے پھلکے انداز میں کہہ کر اس کا اندیشہ غلط کرنا چاہا اور اس میں کافی مدد تک کامیابی بھی رہی۔

”ہاں ضرور پوچھو، جب وہ تمہارے لیے آفس میں بیٹھ کر فکر مند ہے تو تمہارا بھی فرض بنتا ہے۔“ جمنی مسکرا کر مازم کی طرف متوجہ ہوئی جو ناشتے کی ٹرائی کھینچتا چلا آرہا تھا۔

”میں نے اپنا ناشتا بھی تمہارے کمرے میں منگوا لیا، تمہیں برا تو نہیں لگا۔“ بڑے لوگوں کی یہ اضافی خوبی دوتی تھی کہ وہ ایک دوسرے کی پرائیویسی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں داخلے پر انہیں اجازت لینا پڑتی تھی۔

”کبھی باتیں کر رہی ہیں بھابی۔“ جمنی کے سامنے کسی چیز سے انکار کر کے اسے بولنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ فریش ہو کر آئی تو جمنی اس کی منتظر تھی۔ وہ بنانا شتے کے چلا گیا تھا۔ نوالہ اس کے حلق میں پھنس رہا تھا۔ نکلین گولہ کسی بھی شے کو آسانی سے اندر اترنے نہیں دے رہا تھا۔

☆.....☆

ابھی تو قید ہیں جذبوں کی آندھیاں دل میں ہمارا ضبط جوڑنا تو قیامت ہوگی!

سیل فون لگا ہوں کے سامنے کئے وہ کمرے سے اسکرین کو گھورے جا رہا تھا۔ اسکرین کئی ٹاپے روشن رہ کر اندھیرے میں گم ہو جاتی تو انگوٹھا دبا کر وہ اسکرین کو پھر سے جتنے پر مجبور کر دیتا۔

Contacts کھولے وہ کب سے لسٹ کو نظر سے ہٹا دیتا۔ بھابی کے نام پر جمنی گئی تھیں۔

”اوکوئی شرم ہوئی ہے، کوئی حیا ہوتی ہے۔“ سنا تھا لوگ سادی کے بصر بدل جاتے ہیں تو نے تو پروف کر دیا۔

نہ کال کرتا ہے نہ آفس آتا ہے۔ ابھی بھی بھابی نے چیزوں کی لسٹ تیار کی تھی کہ گھر آتے ہوئے لینے آتا۔

وہ شرارت سے کہتے کرسی چنچ کے بیٹھ گیا۔ عرفان ولی نے مسکراتے ہوئے اس کی آغوش میں مزاج پر خوشگوار اثر ڈالا تھا۔

”بڑے غور سے سیل فون دیکھ رہا تھا۔ بتا کیا کیا منگوا یا ہے بھابی نے۔“ وہ چیخ رہا تھا۔

”میری بیوی ایسی نہیں۔“ وہ سائیڈ لے گیا۔

”اوہو! حضور دن ہی کتنے ہوئے ہیں وہ دن بھی آہی جائے گا۔“ چڑایا۔

”چلو جی آیا تو بتاؤں گا۔“ اس نے مزہ لیا۔

”حضور بھی آفس کا بھی چکر لگالیا کیجیے، بھابی نے آفس کیا چھوڑا آپ بھی چاند ہو گئے۔ ویسے سوچ رہا ہوں پارٹنرشپ سے تمہارا نام نکال کر بھابی کا ایڈ کر لوں، کم از کم وہ آفس آ کر وہاں کے معاملات تو دیکھیں گی اور اسی بہانے آپ بھی چکر لگائیں گے۔“ ولید انکھیں نیچا رہا تھا۔ وہ مسکرا دیا

”ٹرائی کر لو، آفسور مان گئی تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، ہاں پھر تمہارا لگہ بھی دور ہو جائے گا کہ میں آفس کا چکر نہیں لگاتا۔“ اس نے ہامی بھری۔

”لگا نا..... لاک کر دوں؟“ ولید کفر کرنا چاہ رہا تھا۔

”شوق سے۔“ اس نے مہر لگا دی۔

ان کی بات کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”پہلے مجھے یہ بتاؤ، آفسور کا کیا معاملہ ہے۔ تم لوگ جانتے ہو عرفان کی بیوی کو؟“ واصفہ حیرانی سے کہہ رہی تھیں۔

”کاشان انہیں آفسور سے جڑا واقعہ سنار تھا اور واصفہ کا منہ کھلتا جا رہا تھا۔

زویانے آفسور اور عرفان ولی سے ہوئی ٹیڈی کھڑک کا قصہ بھی سنا دیا۔

”اگر ایسا ہے تو سمجھو جیت لینی ہے نکاح ہو جائے تو تم شخص انتقام کے لیے طلاق مت لے لینا۔ آفسور کو طلاق دلوانا۔“ واصفہ سبق پڑھا رہی تھیں۔

”میں اسے بھی طلاق دلاؤں گی پہلے بعد میں خود بھی لے لوں گی تاکہ عرفان ولی ساری زندگی یاد رکھے کہ اس نے کسی زویا کو ٹھکرایا تھا۔“ وہ ضدی ہوئی۔

”یہ کیا بے دوتی ہے۔ میں کہہ رہی ہوں۔“

”نام! آپ کے جتنا کہا ہے اتنا ہی کر دیں۔ بلا وجہ مدد ریاضہ نہیں۔ میری زندگی میری مرضی۔“

زویانہ گواہی سے انہیں تیز لہجے میں ٹوٹی کرسی سے اٹھ کر تک کرتی چلی گئی تھی۔

☆.....☆

”آفسور طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟“ شاہ میر کے اصرار پر جمنی لوٹ آئی تھی۔ لیکن حتی الامکان ماہ بارہ کا سا کرنے سے گریز کر رہی تھی۔ اس لیے وہ ناشتے کی میز پر نہیں گئی تھی۔ دیر تک سوئی رہی۔ شاہ میر نے بھی زور نہیں دیا تھا۔ وہ ناشتا کر کے آفس چلا گیا تھا۔ مکی کے جتنے کوائسے لیے ناشتا بنانے کا کہا تو وہ آفسور کا ناشتا بنانا نظر آ جمنی کو حیرانگی ہوئی۔ آفسور تو سب کے ساتھ ہی ناشتا کرتی تھی۔ اپنی غیر حاضری پر اسے امید تھی کہ اسے نہ پکارا آفسور اسے بلائے ضرور آئے گی لیکن جب اسے نہ ہوا تو وہ صبح کے دہائی کے شاہ میر سے سب کو معقول وجہ بتا دیا ہوگی۔ تب ہی آفسور نہیں آئی لیکن ابھی خبر ہوئی کہ اس نے خود ہی ناشتا بنائیں کیا۔

اس وقت عرفان ولی نے آفس سے شیف کو کال کر کے آفسور کا ناشتا ہارڈ کر کے اس کے روم میں پہنچانے کا خاص ہدایت کی تھی۔ استفسار پر خبر ہوئی کہ عرفان ولی بھی بناء ناشتے کے چلا گیا تھا۔

جمنی حیران ہوئی آفسور کے پاس آگئی۔ آفسور سیدی ملی چھت کو دیکھ رہی تھی۔

”دلیٹی رہو۔“ وہ جمنی کو دیکھ کر سیدی ہونے لگی تو وہ ٹوک گئی۔ اس کا رویا روپا چہرہ جمنی کو تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔

”کیا ہوا ہے؟ اتنی متشعل کیوں لگ رہی ہو؟“ جمنی تشویش سے پوچھ رہی تھی۔

”طبیعت ٹھیک نہیں ہے بھابی آئیں بیٹھیں۔“ اس نے مسکرا کر خود کو میوز کرنا چاہا۔ بے شک جمنی بہت پر خلوص تھی مگر وہ اپنی ذات کی خامی اس پر بھی عیاں نہیں کر سکتی تھی۔ تب ہی ٹال گئی۔

”میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلو، مجھے تم ٹھیک نہیں لگ رہی۔“ جمنی محبت و فکر مندی کے سلسلے جلتے تاثرات سے گویا تھی۔

”ارے نہیں، اب اتنی بھی طبیعت خراب نہیں کہ ڈاکٹر کے پاس جاؤں۔ بس سر میں درد ہے۔ میڈیسن لے لوں گی۔“ وہ اسے بہلاتے لگی۔

”تم دونوں کی کوئی لڑائی ہوئی ہے؟ عرفان بھی بنانا شتے کے گیا ہے اور آفس سے شیف کو تمہارے لیے تیار کر کے روم میں پہنچانے کی ہدایت کر رہا ہے۔“ وہ نارمل لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

”سورہی تھی۔ بے آرامی کا خیال کر کے نہیں جگا یا ہوگا۔ پوچھتی ہوں خود ناشتا کر کے نہیں گئے تو میرے

”اوکے ڈن میں جلد ہی بھائی کو راضی کرتا ہوں مگر نہ جانا۔“ تنبیہ کرنے لگا۔

”پہلے کب سکرا ہوں کسی بات سے؟“ وہ جیسے چوتوں سے دیکھنے لگا۔

”آنور Depand ہے وہ جو فیصلہ کرے۔“ اس نے اس پر چھوڑ دیا واپس ہلانے لگا۔

”پہلے تو آؤ کر۔“ میں سچ ساتھ کرنے کے ارادے سے آیا ہوں کہ کافی وقت ہو گیا ساتھ لے کر۔“

ریٹیکس ہو کر بیٹھ گیا۔ عثمان ان کا کام اٹھا کر لے آؤ کر کرنے لگا۔

”یہی چل رہی ہے شادی، کتنے بھگڑے ہوئے بھائی سے؟ قسم سے یہ لڑکیاں جب تک مجبور، منگیتر اور آدمی کو بھاؤ دے دے کرساتویں آسمان پر پہنچا دیتی ہیں اور بیوی بنتے ہیں زمین پر پڑ دیتی ہیں۔“ ولید دل انداز میں کہہ رہا تھا۔ وہ ہنس دیا۔

”تیرا بھی یہی حال تو نہیں؟“

ولید مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ عثمان ولی کو اس کے انداز پر ہنسی آنے لگی۔ اسے آنور کا محبت بھرا انداز یاد آنے لگا۔ شادی کے بعد وہ پہلے سے کہیں زیادہ محبت کرتی تھی۔ خیال رہتی تھی۔ رات ہی تو ساری رات دروازے سے لک لک کر آؤ کر دیتی تھی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”کلی!“ ولید متاثر ہوا۔

”اور سناؤ تمہارے دوستوں کا کیا حال ہے؟ کاشان کیسا ہے؟ شادی میں بھی نہیں آیا تھا۔ کوئی بہتری آئی اس میں یا ابھی بھی فلٹری ہے؟“ کافی ناظم ملنے کے بعد ولید معمول کے لہجے میں اس سے جڑے لوگوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا اور وہ جس نے ولید کی آمد پر خود کو میز پر کیا تھا وہی نام دوبارہ سن کر اس کی کینٹی سلکے لگی تھی۔

”یہ تم کیسی فقیر ہو اٹھالائی ہو ماہ پارہ جس کے نہ سسٹن کا لانا ہے نہ کردار کا کہاں گئی عثمان کی پرنسپل پر سنا لئی۔“

واصفہ ماہ پارہ کو آڑے ہاتھوں لیے بیٹھی تھیں۔ دونوں ہی کا سن فریڈ کے چار انوائسڈ تھیں اور انہیں دیکھنے ہی واصفہ شروع ہو گئی تھیں۔ ان کے انداز پر ماہ پارہ چونک گئیں لیکن جب واصفہ روایا اور کاشان سے ملنے والی معلومات بڑھا چڑھا کر انہیں سنائے لگیں تو ماہ پارہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

”مجھے امید نہیں تھی کہ تم ایسی دو لکے کی چڑاسی کی بیٹی کو بہو بنا لو گی۔“

”امید تو مجھے بھی نہیں تھی کہ میرا ہروں جیسا بیٹا کسے کی کان میں گھس جائے گا۔ آنور تو مجھے پہلے ہی ناقابل برداشت لگتی ہے لیکن اس کی بد چلتی کی کہانی سنا کر تم نے مجھے مزید نفرت پر مجبور کر دیا ہے۔ جانے عثمان کی آنکھوں میں کون سی پٹی بندھی ہے جو انہیں رسی اور اب چڑاسی کی بیٹی کہاں رہی۔ عثمان سے کہہ کر باپ کا جزل اسٹور کھلو ا کے دے چکی ہے۔“

ماہ پارہ کے لہجے میں زمانے بھر کی کڑواہٹ آ گئی۔ ان کی نگاہوں میں ناشتے کی میز کا منظر گھوم گیا۔

آنور کی غیر موجودگی اور عثمان ولی کا بنانا شتا کیے چلے جانا، انہیں محسوس تو اسی وقت ہوا تھا لیکن اب وجہ جان کر انہیں بے طرح خوشی ہو رہی تھی۔

”تمہاری خواہش پر میں نے زویا کو بڑی مشکل سے راضی کیا ہے، شادی کے لیے۔ اب تم جلد ہی عثمان کی بھی راضی کر لو، دیکھ لو ایک بار پھر تم کا م نہ ہو جانا۔“ واصفہ نے کہتے کہتے آخر میں چوٹ کی۔

”تم طنز کر رہے ہو؟“ وہی ہم بعد میں کریں گے۔“ ماہ پارہ کو برا لگ گیا تو وہ منہ ہٹا گئیں۔

”تمہیں دو لفظ سنا دے تو منہ بنارہی ہو۔ بیٹی کی ماں ہوں اسی بیٹی کی جسے تم نے ہمیشہ اپنی بہو بنانے کی خواہش ظاہر کی اور میں نے ہر شے ٹھہرا کر تمہاری خواہش کا احترام کیا لیکن کیا میری بیٹی کو؟ میں ذرا سنا سنا بھی نہیں سکتی۔“ واصفہ معصوم بن کر افسردگی طاری کر گئیں تو ماہ پارہ انہیں منانے لگیں کہ وہ انہیں حق بجانب لگنے لگی تھیں۔

☆.....☆

”عثمان کے لیے دل سے دعا لگتی ہے۔ وہ ہماری زندگی میں آنور کے توسط سے نہیں آتا تو جانے کیا ہوتا۔ میں اس طرح تم سب پر چلا چلا کر ختم ہو جاتا اور تم سب مجھ سے عاجز ہو کر۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ قدوس صاحب باسیت سے کہنے لگے تو ہاجرہ نے بھی ہاں میں ہاں ملا دی۔

”ایک آصف اور درخشاں کے لیے ہی دل دکھتا تھا لیکن عثمان نے جس خوب صورتی سے ہمارا یہ کاٹنا بھی نکال دیا اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ہم زلف کو نیچا دکھانے کی بجائے اس نے اوپر اٹھانے والا کام کیا ہے۔ بس اب آصف سخت کرے اور اچھے مال میں اپنی دکان کو کامیاب بنائے۔“

”ہاں درخشاں اور آصف مشائی لے کر کتنا خوشی خوشی آئے دونوں ہی عثمان اور آنور کے لیے اچھے کلمات کہہ رہے تھے اور تو اور ساری زندگی آنور سے حسد کرنے والی درخشاں بھی بہن کے گن گار رہی تھی۔“

ہاجرہ کو بھی دونوں کے کھلے چہرے دیکھ کر خوشی ہو رہی تھی۔ دونوں لاؤنج میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اندر کمرے میں بیٹھی روہی اور سونی اپنے اپنے محمولات میں مصروف ہو کر ان کی باتیں بھی سنتی جا رہی تھیں۔

”تمہیں کیا ہوا، کیوں چپ ہو؟“ روہی نے سر اٹھا کر سونی کو دیکھا جو کتاب کھولے بیٹھی ابھی غائب و ماغی سے کھلی کتاب کو دیکھ رہی تھی۔

”نہیں تو۔۔۔۔۔“ وہ سنبھلی۔

”بہاؤ کیا چپا رہی ہو؟“ روہی اس کی جان کو آگئی۔ عرصہ سے ساتھ رہتے ایک دوسرے کے ہر سکھ دکھ موڈ سے آشنا تھیں۔

”کچھ دنوں سے آتے جاتے ایک لڑکا تنگ کرنے لگا ہے۔ اسی اپارٹمنٹ کا ہے آج راستہ روک کر کہنے لگا اپنا نمبر دو۔ میں نے غصہ کر کے کہا کہ میرے پاس فون نہیں ہے تو یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ کل میرے لیے فون لے کر آئے گا۔“ سونی پریشانی بیان کر گئی۔ روہی کا منہ کھلتا چلا گیا۔

”ابا سے کہو۔“ روہی نے راہ دکھائی۔

”نہیں ان سے ذکر کیا تو باہر نکلنا بند کروادیں گے۔“ سونی نے اس آئیڈیا کو ریجیکٹ کر دیا۔

”وہ امیر باپ کی بگڑی اولاد لگ رہا ہے۔ سیدھے سادے ابا کہاں ڈیل کر سکیں گے اس لوہر کو۔“ سونی کی توجہ بہرہ پر روہی بھی اتفاق بھرے انداز میں سر ہلانے لگی۔

”پھر عثمان بھائی سے بات کرو۔ وہی نمٹ لیں گے اچھی طرح ان مولیوں سے۔“ روہی کے راہ دکھانے پر سونی بھی اتفاق کر گئی۔

”سچ کہہ رہی ہو۔ کرتی ہوں عثمان بھائی سے بات۔“

”ویسے ہمارا بیٹا بھائی بھی ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا نا۔“ روہی کو افسوس ہوا۔

”اللہ کی رضا سچی اس نے نہیں دیا لیکن سگے بھائیوں سے بڑھ کر عثمان بھائی کو ملوایا۔ ان کا کوئی عمل غیروں

والا نہیں ہوتا۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ سونی کی بات پر رولی قائل ہو کر سر ہلا گئی۔

☆.....☆

میرا اصل اصل اداس پیا
دل جانی رمز شناس پیا
بھی آمل تنہا لوگوں سے
میرے خاصوں میں بھی خاص پیا
تیری دید زیارت آنکھوں کی
تیری دوری دشت کی پیاس پیا
تیرا لمس ہوا کی سسکی میں
تیری پھولوں میں بھی باس پیا
میں مٹی بارش ترسی ہوں
تو آوارہ ایک بدلی سا
میری جوس میرے بھی دامن پر
میری گل جانے گی گھاس پیا
اک تیرے گلہاں گردش میں
میری سوچ سارا تیرا پیا
میرا اصل اصل اداس پیا
دل جانی رمز شناس پیا

”کیسی ہو جانم!“

آنسوؤں کا سیل فون بجنے لگا تھا۔ اس نے بے زاری سے کال ریسیو کر کے کان سے لگا لیا تھا۔ دوسری طرف درخشاں بھی جوشاپ کی اوپننگ پر بہت زیادہ شکرگزاری کے جملے بول رہی تھی۔ وہ بھی اس کی خوشی میں ہوں ہاں کر کے جواب دینے لگی۔ تب ہی اس کے نمبر پر دوسری کال آنے لگی۔ کال ویننگ ہونے کے باعث دوسرا نمبر مسلسل روشن ہو رہا تھا۔ درخشاں کو اللہ حافظ کہہ کر اس نے کال ریسیو کر لی لیکن دوسری طرف سے آئی آواز اور لفظوں کو سن کر اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

”کون؟“ اس کی پہنچی پہنچی آواز نکلی۔ اپنے شک کو دور کرنا چاہا۔

”اتنی جلدی اپنے کا شان کو بھول گئیں۔“ وہ مکروہ ہنسی ہنس رہا تھا اور اس نے فوراً خوفزدہ ہو کر کال ڈسکنینٹ کر کے سیل فون بیڈ پر پھینک دیا تھا۔

اس شخص کی اتنی ہمت اتنی جرأت کہ وہ اسے کال کر رہا تھا۔ عرصہ بعد اس کی آواز سن کر آنسوؤں پر تھر تھراپنے لگی تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ فون اٹھا کر اسے دو چار سخت باتیں سنا کر اس کا منہ بند کر سکتی۔ الٹا اس کی آواز سن کر وہ ہراساں نظر آ رہی تھی۔ اس کے پاس اس کا نمبر کہاں سے آیا تھا۔ وہ یہ سوچتی بھی تو آج کے ڈیجیٹل دور میں بے وقوفی کرتی۔ کسی کا نمبر حاصل کرنا کون سا مشکل کام تھا۔

کال مسلسل آرہی تھی۔ وہ دور بڑے سیل فون کی جلتی بجھتی اسکرین اور بجنے ٹون کو سن رہی تھی۔ وہ دھڑھل رہی تھی۔ لُچ کا موڈ نہیں تھا۔ ملازم کے پوچھنے پر اس نے انکار کھلوا دیا تھا۔ صبح سے کمرے سے نہیں نکلی تھی۔ جتنی بھی اپنے روم میں تھی۔ ماہ بارہ نہیں سچ پرگئی ہوئی تھیں۔ اس وقت دونوں ہی گھر پر تھیں۔ ملازم اپنا فرض پورا کر کے جا چکا تھا۔ جتنی نے بھی لُچ سے انکار کر دیا تھا کہ وہ دوپہر کو کم ہی کھاتی تھی۔ بڑے لوگوں کی ڈرامے بازی پر ملازم سر جھٹک کر خود کھانا کھانے لگے تھے کہ یہ تو روز کا معمول تھا۔

ایک دن دروازہ کھلا تھا اور عثمان ولی داخل ہوا تھا۔ آنسوؤں سے بے وقت دیکھ کر چونک گئی۔ صبح سے ایک بھی کال نہیں آیا تھا۔ آج شاید پہلا دن تھا۔ جب عثمان ولی نے اس کے کسی پیسج کا جواب دینا ضروری خیال نہیں کیا تھا۔ اس کے محبت بھرے پیسج اور معافی سے بھرے پیغامات کا اس نے صرف اوکے کی صورت جواب دیا تھا اور اب اس کی بے وقت کی آمد پر وہ حیران تھی۔

”السلام علیکم؟“ اس پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر عثمان ولی سلام کرتا وارڈروب کی طرف بڑھ گیا تھا۔ ٹریولنگ بیگ نکال کر اپنے پینے پر رکھنے لگا۔ کال بند ہو چکی تھی۔ آنسوؤں کا سارا دھیان عثمان ولی کی حرکات کی طرف ہو گیا۔ وہ کیا کر رہا تھا۔ کیا اسے چھوڑ کر جا رہا تھا؟ وہ عجیب سی بے چینی کا شکار ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے کے وہ کچھ پوچھتی اس کا سیل فون ایک بار بجنے لگا تھا۔ وہ ہم سی گئی۔ کپڑے ہینگر سے نکال کر بیگ میں رکھتے عثمان ولی نے ایک نظر اس کے بجتے سیل فون اور دوسری اس پر ڈالی اور اپنے کام میں بڑی رہا۔

کمرے میں مکمل سناٹا تھا لیکن جب فون بجنے لگی اور وہ اسی طرح پتھر کی صورت بنی بیٹھی رہی تو عثمان ولی نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

”سیل فون مسلسل بج رہا ہے۔ اٹھا کیوں نہیں رہیں؟“ عثمان ولی کے بولنے کا بھی جیسے کچھ اثر نہ ہوا۔ آنسوؤں سے جیسے اس کی بات سنی نہیں۔ وہ غائب دماغی سے اس کے ہلتے لبوں کو دیکھ رہی تھی۔ جانے وہ کیا کہہ رہا تھا۔ اس کے کان تو اس کی سائیں کر رہے تھے۔ عثمان ولی کے سامنے کا شان کی کال پر اس کے حواس جیسے ساتھ چھوڑنے لگے تھے۔ اس میں تو اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ اٹھا کر فون آف کر دیتی۔

اس کی طرف سے جواب نہ پا کر اس کے انداز پر وارڈروب کھلا چھوڑ کر وہ بیڈ تک آیا تھا، بیگ کر سیل فون اٹھاتے اس کا ارادہ فون آنسوؤں کو تھمانے کا تھا، جو بیڈ کے دوسرے کونے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ غیر ارادی طور پر اس کی نگاہ اسکرین پر اٹھ گئی تھی۔

ان فون نمبر سے آتی مسلسل کالنگ پر اس کے ہاتھ ٹھٹھک گئے تھے۔ آنسوؤں کا متوش انداز الگ حیران کر رہا تھا۔ شاید کوئی تنگ کر رہا تھا۔ اس خیال سے اس نے کال پک کر لی۔ آنسوؤں پیلی پڑ گئی۔

”سو بار کال کروا کر ایک بار ریسیو کرنے کی تمہاری عادت گئی نہیں سوئیٹ ہارٹ۔“

کا شان کی آواز ساعت سے ٹکرانی تو اس کی نگاہ بے ساختہ آنسوؤں پر اٹھ گئی۔ کا شان کا فریٹک لب ولہجہ اور گلا میز جملہ سن کر عثمان ولی کی نظریں سرد ہو گئی تھیں تو ہاتھ کی رگیں تن گئیں۔

”بولو سوئیٹ!“ کا شان مسلسل بول رہا تھا۔

عثمان ولی کی آنکھیں ابھرنے لگی تھیں کنپٹیوں میں خون ٹھوکریں مارنے لگا تھا۔

(جاری ہے)

سارے زمانے کی سہبت



والے کہتے ہیں کہ وہ مگر بہشت کے سائے میں ہوا کرتا تھا۔ وہاں سے ہر سے سکھ کا ہوا کرتا تھا۔ وہاں جھرنے بہتے تھے۔ وہاں پرندے کوکتے تھے۔ وہاں ندیاں بہتی تھیں۔ وہاں چلنے والی ہوا ایسا مسور سنگیت گاتی تھی کہ بہرے بھی سماعت پا جاتے تھے وہاں درختوں کی چھایا تلے بچھے گھاس کے قالینوں پر پھولوں کے سریانے رکھے رہتے تھے۔ وہاں جا بجا موردیوانہ دار رقص کیا کرتے تھے۔ اس زمین کے اوپر تنا آسمان سفید بادلوں سے چھایا کیے رہتا تھا، اسی آسمان کے موٹھوں سے چاندی برساکرتی تھی وہ زمین جواہر اگلتی تھی۔ وہاں کے پانی میں سونا بہتا تھا۔

اسی جہان بے مثال میں ایک چھوٹی سی تھی۔ وہاں ایک حسین دوشیزہ رہا کرتی تھی، اس کے چرچے سات آسمانوں تک تھے۔ اس کی باتیں سات زمینوں تک تھیں، اس کی لمبی سیاہ زلفوں میں رات آرام کرتی تھی۔ اس کی شفاف آنکھوں کو دیکھنے سورج طلوع ہوا کرتا تھا، کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ چاند ساری ساری رات اس کے دیدار کے کارن آسمان پر ٹنگا رہتا تھا اور رات کے اختتام پر بڑھکیاں دے دے کر روتا تھا۔ ستارے دن بھر اس کے جبر میں کر لاتے اور رات ہوتے ہی اس کے وصل کے گیت گاتے۔ وہ جب اپنی جھونپڑی سے نکلتی تھی تو کائنات کی ہر شے ایک نکلنے کے لیے تھم

وشتوں کے قد آدم سائے وہاں دبیز اندھیروں کی بیکل مارے، مارے مارے پھرتے تھے۔ ان کے قدموں میں پڑی ہوئی ادا کی باز نہیں عجیب بھیا تک لے سے بھنبھائی تھیں۔ اس شخص علاقے میں سے ہر سے بد نصیبی اوڑھے رہتا تھا۔ اس دھرتی کے ٹکڑے پر تنا امبر بھی سیاہ بادل تانے رکھتا تھا۔ ان بادلوں سے ہمہ وقت پارلے کی بوندیں پچتی رہتی تھیں۔ اس فضا میں ایک زہر آلود باس رچی تھی۔ ایسی باس جو سانس کے ساتھ حلق میں انک جالی اور جینے والوں کو موت کی ٹھنڈک محسوس کرا دیتی۔ ایک خبیث سی گندھ تھی نشتوں کے راستے خون میں آلتی اور خون کو خاک میں ملوا دیتی تھی اور اندھیرا ایسا عجیب اندھیرا جو آنکھوں والوں کو مجبور کر دیتا کہ وہ اسے حق میں اندھا ہو جانے کی بددعا کرنے لگیں۔ اسی ٹکری میں ان وشتوں کے بچے، ان اندھیروں میں بھٹکتی اسی گندھ میں سانس لیتی ایک اندھی بڑھیا ماری ماری پھرتی تھی۔ اپنے زخمی خون رستے برہنہ قدم یہاں وہاں دھرتی، اپنا پٹھا پرانا چونہ خود پر لپیٹنے کی سعی کرتی وہ بڑھیا ہٹک ہٹک جاتی اور جب وہ اس نگر سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پاتی تو ایسی آواز میں چیخیں مارتی تھی کہ سماعت رکھنے والے اپنے لیے بہرا ہونے کی دعا مانگتے تھے۔

☆.....☆

سالوں پہلے وہ جگہ مثل جنت ہوا کرتی تھی۔ کہنے

جاتی تھی۔ نیلے آسمان پر جگمگاتا سورج بادلوں کو ہٹا ہٹا کر اس کے درشن کرتا تھا۔ سورج دوبارہ وار رقص کرتے جاتے۔ اس کی ریشمی پوشاک ٹھکی گھاس پر سرکتی تو پھول اس کے پوسے لیتے۔ وہ جہاں قدم دھرتی، وہاں ایک بوٹا آگ آتا اس بوٹے پر ایسی تاثیر کے پھول ٹھٹھکے کہ صدیوں کے مریض ان سے شفا پا جاتے۔ وہ بھی جو کھلکھلائی تو ایک لے سے چلتی ہوا اس کے ساتھ تھقبے لگاتی وہ جو بھی کسی تکی کے پیچھے بھاگتی تو ان گنت تتلیاں اس کے پیچھے پیچھے آئیں۔ بھی جو وہ سستانے کی غرض سے کہیں رکتی تو پرندے اسے پیٹھی لوریاں سناتے وہ جو بھی جھوم جاتی تو ساری کائنات اسے دیکھ کر پاگل ہو جاتی، اس نگر کا ذرہ ذرہ اس پر فریفتہ تھا۔ وہاں کا چہرہ چہرہ اس کی رعایا تھا۔ وہاں کا ریزہ ریزہ اس کے ضم سے سانس لیتا تھا۔ وہ وہاں کی ملکہ تھی۔

وہ دیوی تھی محبت دیوی۔

اس کی پوجا وہاں ہر سے ہوئی تھی۔ اس کے نام کی مالا ہر سے، ہر کوئی جیتا تھا۔ وہ دیوی ایسی خوب صورت تھی کہ خوب صورتی بھی اسے رشک سے دیکھتی تھی۔ ایسی رحمدل کہ اس سا رحمدل کوئی کہیں نہیں تھا۔ ایسی فیاض کہ وہ کسی پر کچھ بھی پنچا اور کرنے کو تیار رہتی تھی۔

☆.....☆

محبت کی دیوی کی دھوم چاروں دشاؤں میں پھیل چکی تھی۔ دور دراز کے لوگ اس کا نام عقیدت سے لیتے تھے۔ اس کا ذکر جیہڑے تو ادب سے آنکھیں جھکا لیتے۔ اس کی بات کرتے تو لبوں پر تادیب کے پھرے بٹھا لیتے۔ اس کی گفتگو کرتے تو لفظ انتہائی سوچ بچار کے بعد جتنے اس کی شہرت وہاں سے دور بہت دور سنگلاخ چٹانوں تک بھی پہنچ گئی۔ وہاں جہاں پہاڑوں کے دامن میں ایک اونچا سنگلاخ قلعہ تھا وہ قلعہ جس کے اونچے اونچے مینار تھے۔ مینار

جو آسمان سے محو گفتگو رہتے تھے۔ آسمان جو خاموش لب سینے رہتا تھا لب جو وہاں کے دیوتا کی دہشت سے کانپتے رہتے تھے۔ دہشت جو دیوتا کو دیکھ کر تھرائی تھی اور دیوتا وہ دیوتا نفس تھا وہ دیوتا ہوس کا دیوتا تھا۔ وہ دیوتا بھوک پر راج کرتا تھا۔ وہ دیوتا ہمہ وقت تشنہ لب رہتا تھا۔ وہ دیوتا، دیوتا ہونے کے معیار پورے نہ کرتا تھا لیکن پھر بھی دیوتا کہلاتا تھا کیونکہ وہ بڑا طاقت ور تھا اور طاقت سے بڑا دیوتا کوئی نہیں۔

محبت کی دیوی کی دھوم جب ہوا کے تھہر پر بہتی پہاڑوں کی چوٹیوں سے ٹکرائی تو اس قلعہ کی دیواروں نے غور سے سنا پھر دیوتا نے غور سے سنا۔ ایک دیوی جو ساری کائنات پر راج کرتی ہے ایک رانی جس کا راج ہر سو ہے۔

☆.....☆

سیاہ چھڑی والے ہوس کے دیوتا نے اپنا بھیس بدل ڈالا۔ اپنی خون آشام سرخ آنکھوں میں اس نے دیئے روشن کیے، اپنی منہوس آواز کو کسی خوشی انجان رجحان پرندے کی آواز سے بدل لیا۔ جواہرات سے بھئی پوشاک پہن کر پشت سے تیر پھینک کر وہ اپنے قلعہ سے نکل آیا۔ اس رانی کے دیس کی تلاش میں جسے سب محبت کہتے تھے۔

☆.....☆

وہ شادی والا گھر تھا۔ ہر طرف نارنجی خوشیوں کے چھیننے پڑے تھے۔ ہر سو گلابی مسکراہٹیں کھلکھلا رہی تھیں۔ جا بجا مہندی رنگ تھقبے دکھائی دیتے تھے۔ وہاں ہوا پھولوں کی باس سے چھیڑ خانی گر رہی تھی۔ وہاں روشنیاں دیوانہ وار رقص کر رہی تھیں۔

گیندے کے پھولوں کی لڑیاں لڑکا لڑکا آدم اپنے آپ میں گمن اسٹول پر کھڑا تھا جب بیروں پر آواز ان گزرا اور وہ زمین پر آ رہا، عین اسی سے مہندی اور

رنگوں کے تھاں سجائے، وہاں سے گزرتی حوا اس کے گرنے کے عتاب میں آگئی۔ رنگ ہوا میں اڑے اور وہ دونوں زمین پر۔

”اوہ سوری آئی امیر نیکی سوری۔“

آدم جلدی سے اٹھا۔ سہارا دے کر اسے بھی اٹھنے میں مدد دی۔ آس پاس سے گزرتے کھلکھلائے تو وہ بھی مسکرا دیے۔

دور پہلے میں محبت کی ٹیٹھی سی مسکان کسی جلتنگ کی مانند نمودار ہوئی اور دور تک گھنٹیاں بج اٹھیں۔ محبت رانی نے جھوم کر گھاس پر پاؤں دھرا اور ایک لے سے اٹھایا۔ محبت کا ننھا بوٹا سر اٹھانے لگا۔ دیوی کی زلفوں نے بل کھایا اور ان گنت تتلیاں آزاد ہو گئیں۔ موروں نے اپنے پر کھول لیے اور وہ محبت ملکہ کے قدموں کے ساتھ قدم اٹھانے لگے۔

☆.....☆

یونہی بلا وجہ یہاں سے وہاں جاتے آدم کی نظروں نے کئی بار اپنی حوا کو ڈھونڈا تھا۔ اس کے ننہوں نے کئی بار اسے دیکھا اور پھر کچھ اور نہیں دیکھا، اس کے رخسار بہت بار اسے دیکھ کر مسکرائے بھی تھے، کئی بار وہ بھی اسے دیکھ کر کہتی تھی۔ جانے اس کے دیکھنے پر یا اپنے دیکھنے پر کئی بار وہ اٹھلائی بھی تھی۔ وہ کیسی اُٹھلائی ہوئی تھی کہ کوئی آئے نہ بہانے اسے تکتا تھا وہ کیسی زہیب (سوئے کی) تھی کہ کسی کی نظریں اس پر جواہر پنچا اور کرتی تھیں اور وہ جب یہ سب محسوس کرتی تھی تو اس کی دھڑکنیں ساری دنیا تھیں نہ کہ اس کے دل میں۔ اس کے وجود میں جیسے کوئی سوتا تھا تھا۔ اندر من میں کہیں کوئی کلی کھل کر پھول ہو جانا چاہتی تھی۔ اس پھول کی خوشبو اسے دیوانا کر رہی تھی۔ وہ قطرہ قطرہ دیوانگی کے دریا میں اتر رہی تھی۔

☆.....☆

اس خوش شکل راجکار کے بھیس میں موجود نفس نے محبت کے نگر کی سرحد پر قدم رکھ دیا تھا۔ اس نے ایک لمبی سانس بھری تھی۔ اس کے اندر کی درگندہ فضا میں رچ گئی اور کئی ایک گلابی تتلیاں مردہ ہو کر گھاس میں دفن ہو گئیں۔ وہ قدم اٹھاتا آگے بڑھتا رہا اس کے عین قدموں تلے آنے والی گھاس سے بھی گارے کی باس اٹھنے لگی۔ وہ دبے پاؤں چلتا چلتا جا رہا تھا جب اسے جھوپڑی کے پاس ایک مہ وٹ دکھائی دی۔ یہ درخت کی اوٹ میں ہو گیا اور ذرا سی جھری سے دیکھا۔

محبت نے جیسے ابھی ابھی کسی سے کا گھونٹ بھرا تھا اس پر جیسے کسی جام بے خودی کا اثر تھا۔ دیوی دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ کسی نوخیز چاہت کو سینے سے لگائے ملکہ رانی جھومتی جا رہی تھی اس لمحے وہاں موجود ہر ذی نفس اپنا آپ بھلائے اس کا کھٹک دیکھ رہا تھا، سورج بھی، بادل بھی، امیر بھی، امیر کی نیلا ہٹ بھی، نیلا ہٹ میں چھپی سیاہی بھی، سیاہی کو ڈھالانے والی زردی بھی، زرد زردا جلی کرین بھی، کرنوں کی حرارت بھی، حرارت کی تپش بھی، تپش میں چھپا زہر بھی اور زہر میں موجود تریاق بھی اس لمحے کے بھی چرند پرند اس کے ساتھ رقصاں تھے۔ نوخیز گھاس بھی، گھاس پر ٹھہری نمی بھی، نمی کی ٹھنڈک بھی، ٹھنڈک میں چھپی حدت بھی، حدت میں دھکتی آج بھی۔

ہر شے خوشی، بس ایک وہ محو نہ تھا، بس ایک وہ اپنے آپ میں تھا۔ ایک وہ بے خودی کے عالم میں نہ تھا۔ وہ اس لیے کہ وہ محبت کو نہیں مانتا تھا۔ وہ محبت کو جانتا نہیں تھا۔ اس کا ایمان محبت پر نہیں تھا۔ اس کی پرستش محبت نام کی دیوی کے لیے نہیں تھی وہ اس دیوی کا غلام نہیں تھا اور نہ ہی ہونا چاہتا تھا۔ وہ اس ملکہ رانی کو اپنا غلام کرنے آیا تھا۔

آہستگی سے اس نے اپنی پشت سے بندھی کمان

اتاری اور تیر چڑھایا۔ نشانہ اس پری دشن پر باندھا اور تیر چھوڑ دیا۔

وہ باہر شکاری تھا، وہ پہلے کی بات تھی جب کبھی کبھی اس کے تیر خطا ہو جاتے تھے۔ اب نہیں اب نہیں، اس صدی کا وہ سب سے کامیاب شکاری تھا۔ اس کے تیر سے اس کے شکار کو گھاس ہوتا ہی پڑتا تھا، نفس کے دیوتا کے ہاتھوں محبت کی دیوی کو گھاس ہوتا ہی تھا۔

☆.....☆

ٹوں ٹوں ٹوں.....

”کیا کر رہی ہو؟“ آدم۔

”کھانا بنا رہی ہوں۔“ حوا۔

”میری مطلب میری دعوت کا انتظام کر رہی ہو؟“

”ہا ہا ہا..... آؤ گے۔“

”ہلو! آؤ گی تو ضرور آؤ گی۔“

”دعوت کا اعلان کرتی ہوں۔“

”ناں جی آپ کے ابا سے جوتے نہیں کھانے۔“

”ہا ہا ہا۔“

ٹوں ٹوں ٹوں

”کیا ہو رہا ہے؟“

”بڑی ہوں۔“

”ہائے ہم مر گئے ان کے لیے اور ان کو احساس

تک نہیں۔“

”ہا ہا ہا! خیر ترنگ چھوڑ کر ایم اے اردو میں داخلہ

لے لیا کیا؟“

”اف بے ذوق لڑکی، تمہاری حس مزاح سارا

دن پڑھ پڑھ کر ختم ہو چکی ہے۔“

ٹوں ٹوں ٹوں۔

”میرا دل چاہتا ہے تمہارا ہاتھ تھام کر کہیں سفر پر

نکل جاؤں۔ کسی ایسی جگہ جو پتا نہیں کہاں ہو۔ ہو بھی

یا نہیں، بس تمہاری سنگت میں ایک سفر ہو جو ہمیشہ

تک رہے۔ تمہارا ہاتھ تھامے بس میں چلتا رہوں،

چلتا رہوں، راستے ختم ہو جائیں۔ زمین کی حد آجائے۔ ہر شے کو فنا ہونا پڑ جائے۔ بس ہم دونوں چلتے رہیں۔“

ٹوں ٹوں ٹوں

”کیا کر رہی ہو؟“

”کام اور تم؟“

”تمہیں یاد۔“

”لائسنس مار رہے ہو؟“

”ہاں۔“

”میں نہیں جال میں آنے والی۔“

”میرے جال میں آئے ہنا کوئی اور آپشن ہے

ہی نہیں۔“

خاموشی

”اٹھا کر لے جاؤں گا۔“

”چار بھائی ہیں میرے۔ تمہارا قیمہ کر دیں

گے۔“

”ارے واہ! سچی محبت ہے میری چار کیا چار سو

بھائی ہوں تب بھی ان سے لڑ جاؤں گا۔“

”ہا ہا ہا..... اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

میرے بھائی میرے مانگنے پر چاند بھی لا دیں

گے۔“

”چلو ٹھیک ہے جب اپنے لیے چاند منگو آؤ گی تو

میرے لیے بھی ایک آدھ تارا منگو لیتا۔“

☆.....☆

اس نگر پر نارنجی شام اتر آئی تھی۔ پریشان سا

سورج بار بار اس جھونپڑے پر نظر ڈالتا تھا۔ اس کی

متلاشی نظریں بھی جب اپنی دیوی کے درشن نہ پانی

تھیں تو نم ہو جاتی تھیں۔ وہ بے کسی سے انگارے

جسپا رہا تھا۔ اس پہلے کی ریشمی گھاس بھی خاموش

لیٹی تھی۔ پھولوں کے دھڑھکا رہے تھے۔ موروں

کے غول کے غول بھی تھکے سے تھے۔

اندر جھونپڑی کے فرش پر محبت کی دیوی لیٹی تھی۔

اس کے مرمیس وجود پر جو گھاؤ لگ چکا تھا اس سے سال بھر رہا تھا۔ وہ تکلیف سے نڈھال تھی۔ اسے کھلنے والا تیر زہر آلود تھا۔ وہ زہر ہولے ہولے اس کی رگوں میں پھیر رہا تھا۔

وہ پریشان تھی۔ آج سے پہلے تو ایسا نہیں ہوا تھا۔ آج سے پہلے تو محبت کو ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اب یہ بس روان چل نکلتا تھا۔

☆.....☆

نہر شفاف پانی کو اپنے دامن میں لیے خاموشی سے لیٹی تھی۔ اس کا ہمسایہ کچا راستہ تھا جس کے کنارے کے ساتھ ساتھ شہوتوں کے درخت

لدے کھڑے تھے پرے گندم کے سنہری خوشے سر

اٹھائے غرور سے کھڑے تھے۔ اسی راستے پر ہاتھ

تھا بے ہتے اٹھکھیلیاں کرتے آدم حوراواں تھے۔

حوا کسی بات پر لال ہوئی جاتی تھی۔ آدم اپنی کبی

جار ہا تھا۔ پھر منظر سادہ لا تھا۔ سورج کبھی کے کھیت

میں وہ ایک دوسرے کے پیچھے آگے بھاگ رہے

تھے۔ سورج کبھی کے پھول سر پر اٹھائے بے خودی

کے عالم میں ان کو تکتے تھے۔ بوڑھا پینیل زور زور

سے تالیاں پیٹ رہا تھا۔ اگلے منظر میں ایک مشہور

شاہراہ تھی اس پر وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے

تھے۔ دونوں کے ہاتھ میں آئس کریم تھی۔ دونوں پر

برقی بوندیں تھیں اور ان دونوں کی باتیں تھیں۔ پھر

ایک ریستورنٹ کا ہال تھا۔ بھاپ اڑاتا کھانا تھا۔

لطف دیتے جام تھے۔ مدھم سروں میں بختی موسیقی

تھی۔ پھر سے منظر بدلا تھا۔ درخت کی چھاؤں میں

کپڑا بچھا ہوا تھا۔ اس پر حوا بیٹھی تھی اس کے پاس

بی اس کا آدم تھا۔ ایک کبک تھی جسے کہتا تھا۔ ایک

ساز تھا جو بیٹا تھا۔ ایک آگ تھی جو بجھ جاتی تھی اور

ایک آگ تھی جو جل جاتی تھی جو جلتی رہتی تھی۔

☆.....☆

محبت رانی نے اپنے وجود میں گھونپا ہوا تیر ایک

جھکے سے نکال دیا لیکن اب تو دیر ہو چکی تھی۔ وہ تیر اپنی تاثیر اس کے وجود میں چھوڑ چکا تھا۔ وہ بہت دنوں بعد اپنی جھونپڑی سے نکلی تھی۔ وہ بو جھل تھی تو اس کی رعایا بھی بو جھل تھی۔ ہر ذی نفس افسردہ تھا۔

سب پریشان تھے۔ ان کی ملکہ پریشان تھی۔ وہ چہل قدمی کر رہی تھی جب اسے سرسراہٹ سنائی دی۔ کھلی گھاس پر ایک سنپولیا رنگ رہا تھا۔ نازک سی محبت، کوئل سی محبت کا نپ کر رہ گئی۔ اس کی

راجدھانی میں یہ ہو کیا رہا تھا۔ اس نے اپنی خوفزدہ نظروں سے دیکھا نفس کا دیوتا دور چھپا گھاٹ لگائے بیٹھا تھا۔

☆.....☆

ٹوں ٹوں ٹوں

”جاگ رہی ہونا؟“

”ہاں۔“

”گھر پر ایسی ہونا؟“

”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”تم بتاؤ۔“

”ہاں اماں ابا شادی پر گئے ہیں بھائی بھی

ساتھ۔“

”میں آ جاؤں۔“

”کیوں؟“

”تم اکیلی ہونا! تمہارے پاس تمہارا محافظ

ہونا چاہیے۔“

خاموشی۔

”بتاؤ ناں، میں آ جاؤں؟“

خاموشی۔

”میں آ رہا ہوں۔“

خاموشی۔ کچھ وقت مرک گیا۔

”میں باہر کھڑا ہوں۔“

”میں نے تمہیں کب کہا کہ آ جاؤ۔“

”تم نے مجھے کب کہا مت آؤ۔“

پیلے میں شہابی محبت کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی۔ اس کا جیسے نچلا دھڑمفلوج ہونے کو تھا۔ اس دیوی نے اپنی ساری ہمت جمع کی اور جیسے دشمن کو لٹکا رہا۔ جیت اتنی آسان نہیں، میں محبت کی دیوی ایسی کمزور نہیں۔

اپنے کمرے کی بالکونی میں کھڑی حوا نے مسکرا مسکرا کر اشارے کرتے آدم کو دیکھا۔ اس کا دل دھڑک دھڑک گیا۔ وہ پوچھ رہا تھا۔ ”آجاؤں۔“ حوا کا دل لرزتا تھا۔ حلق سے ناں ناں نکلتی تھی۔ محبت دیوی مضبوطی سے ڈٹ کر چٹان ہو گئی۔ درخت کے پیچھے چھپا ہوس کا راجا ہنسا، وہ کتنی چٹانیں خاک کر چکا تھا۔ وہ درخت کے پیچھے سے سامنے نکل آیا۔ کمان اتاری اور تیر چڑھایا۔ نشانہ باندھا، نشانہ حوا تھی، نشانہ آدم تھا۔ ٹوٹا ٹوٹا ہوا۔

یہ اس کے تیر تھے۔ وہ اپنے ہدف کو پچھاڑ دیتے تھے۔ وہ میٹھاڑ ہر تھے۔ وہ گھائل نہیں کرتے تھے بلکہ ختم کر دیتے تھے۔

”میں دیوار پھلانگ کر آ رہا ہوں۔“

ان زہریلے تیروں سے پچھتی محبت کے قدم اکھڑنے لگے۔ وہ اکیلے رہ گئی تھی۔ وہ اکیلے کر دی گئی تھی۔ یہ ہجر کہاں رہ گیا تھا۔ وہ تو اس کی مدد کو ہمیشہ آتا تھا۔ جب جب ہوس کے چیلے چانے اس کے گرد منڈلاتے تھے۔ ہجر آ کر ان کو بھگا دیتا تھا۔ وہ تو محبت کے گرد مضبوط حصار بنا کر پڑاؤ ڈال لیتا تھا۔ یہاں تک کہ وصل کے سہمے آ جاتے تھے۔ یہاں تک کہ مقدس لمن کے لمبے لمبے کوریزہ ریزہ کر دیتے تھے۔ اب کی بار یہ کسی روایت نکل آئی۔

ہوس کے دیوتا نے ایک اور تیر چھوڑا تھا۔ محبت کے قدم زنجیر ہو گئے۔ وہ وہیں گھاس پر گر گئی آدم مسکراتا ہوا حوا کی جانب آیا تھا۔

”کتنی ظالم ہو تم۔“

محبت نے دردناک چیخ ماری تھی۔ اس کی آواز کے درد سے آسمان پھل گیا تھا۔ اس کے دامن میں ان گنت موکھے (سوراخ) ہو گئے۔ ان موکھوں سے زہر بہہ نکلا۔ یوں جیسے ناسور سے لگے۔

”کتنی ترانی ہونا۔“

حوا آدم کی گرفت میں کسمپاتی نہ تھی۔ وہ تو خود چاہنے لگی تھی۔ اس کے دل میں بھی نفس نے اپنے سرطان زدہ تیر گھونب دیا تھا۔ وہ دونوں شکار ہو گئے تھے۔ نفس کی مضبوط گرفت میں محبت بھڑبھڑا رہی تھی۔ وہ رحم کی فریاد بھی کر رہی تھی۔ وہ بھکارن ہو گئی تھی۔ نفس کے لعین ہاتھ اس کے چاندی ایسے بدن پر کونسلے کی سیاہی مل رہے تھے۔ محبت کے تین سارے میلے میں گونجتے تھے۔ اس کے قدموں سے قدم ملا کر ناچتے موراب اس کے ساتھ مل کر منحوس آواز میں روتے تھے۔ رشتی گھاس کو اب کوئی پاتال تک لے جانا چاہتا تھا اور اپنا لایا ہوا ہر اگل دینا چاہتا تھا۔

آدم کے لمس حوا کے وجود پر اپنے ٹوٹ نشانہ چھوڑ رہے تھے۔ حوا کا حسین کلمہ لگاتھا۔ وہ انمول تھی، بے ممول ہونے لگی تھی۔

☆.....☆

وہ تو ابتدا تھی۔ بساط بچھ چکی تھی۔ اب کھیل کھیلا جانا تھا۔ بار بار..... کھیل کھیلا گیا بار بار۔

ٹوٹا ٹوٹا

”آج ملیں؟“

”نہیں میری طبیعت خراب ہے۔“

”خیریت؟“

”ہاں بس عجیب سی کیفیت ہے۔“

”چلو ٹھیک ہے ریٹ کرو۔“

بادل گھر آئے، ہوا چلی، بوندیں برسنے لگیں، حوا مچلنے لگی پکوڑے تلنے تلنے ابکاٹی آئی۔ حال سے بے

حال ہو گئی۔

”میری بچی کو نظر لگ گئی ہے۔ دنوں میں کلمہ لگتی ہے۔“

”کچھ پڑھ کر بچوں کیس مولوی صاحب۔“

”موسم بدل رہا ہے ناں احتیاط کرو۔“

حوا کی محبت گرنے لگی۔ آدم کی بھوک بڑھنے لگی۔ کالج سے واپسی پر گھر آئی تو بخار سے تپ رہی تھی۔

”چل ڈاکٹر کے پاس۔“ چندر پورٹس اور نتیجہ سامنے۔

خوش خبری

بد خبری..... بد نصیبی..... سیاہی۔

☆.....☆

ہوس کے دیوتا کا دل بھر گیا۔ وہ کھیل بہت ہوا وہ بس اب واپس جانا چاہتا تھا۔ اپنے تیر اس نے سمیٹ لیے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ البتہ جانے سے پہلے اس نے ایک آخری وار کیا۔

اپنی وحشت اور درندگی کو اپنے ہاتھوں پر مل کر اس نے محبت کو جکڑ لیا اور محبت کی دیوی کی دونوں آنکھیں نوچ لیں۔ ایک تہقہ مارا اور چل دیا۔

☆.....☆

”میں ماں بننے والی ہوں۔ تمہارے بچے کی ماں۔“ حوا نہ جانے کیوں روتی تھی۔ آدم نہ جانے کیوں خاموش تھا۔

”خدا کے لیے مجھے اپنا لو، تمہیں رب رسول کا واسطہ۔“ وہ دہائیوں سے رہی تھی۔

اگلے روز حوا نے سنا آدم ہمیشہ کے لیے وہ ملک چھوڑ گیا تھا۔

☆.....☆

وہ مگر لعین کر دیا گیا تھا۔ وہاں وحشتوں کے قافلے آن رکے تھے۔ وہاں درد کے سنگیت گاتے رہنے کے حکم آ گئے وہاں کا رخ اندھیروں نے کیا

اور وہاں کے راستے بد نصیبی کے لیے کھول دیئے گئے۔ اس دھرتی پر تنے آسمان کے ٹکڑے کو ہمیشہ روتے رہنے کا فرمان مل گیا۔ وہاں کی دھرتی کو بانجھ کر کے منجوس جھاڑیاں اگانے کا کام دے دیا گیا۔ وہاں سرطان کے جراثیم چھوڑ دیئے گئے۔ ان سب کے بیج محبت کی اندھی دیوی بھٹکتی رہی۔ اپنے زخموں بھرے وجود کو ہٹاتی، یہاں وہاں پھرتی وہ ٹوٹے گانے لگی۔ اپنی وحشت زدہ آواز میں وہ ہر وقت چلانے لگی۔

حوا کے گناہ کو چھپانے کی خاطر ایک اور گناہ کیا گیا۔ معلوم نہیں وہ کیسے مر گئی۔ دم گھٹ گیا یا گھونٹ دیا گیا۔ بس اسے جلدی جلدی دفنا دیا گیا۔ زمین کی امانت پاتال کو سونپ دی گئی۔ آدم کسی دوسرے دیس چلا گیا۔ شاید اسے کوئی اور حوالہ ملے ہو۔ اس کے گھر میں بنت حوا اور ابن آدم بھی پیدا ہو گئے ہوں گے۔ کچھ بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جاتا سوائے اس کے کہ آدم کے حصے کا کفارہ آدم کی اولاد کو ادا کرنا ہی ہوگا۔ ہر قرض جو لیا جاتا ہے۔ چکانا پڑتا ہے۔ سو آدم بھی کسی نہ کسی صورت ضرور ادا کرے گا۔ باقی ہمارے زمانے کی محبت رہ گئی۔

اندھی لولی، ہلکڑی زنجی اپنا بیچ، قابلِ نفرین۔ کہتے ہیں وہ آج بھی اسی ملعون نگر میں ماری ماری پھر رہی ہے۔ کسی مسیحا کی آس میں وہ ہمہ وقت جاگتی رہتی ہے۔ اس کی مثلاًشی اندھی آنکھیں کسی ایسے خاک زادے کی تلاش میں ہیں جو اس کے لیے نفس کے دیوتا سے لڑے۔ جو اس کی خاطر ہجر کو اپنا لے لیکن ہوس کے دیوتا کو شکست دے دے۔ کوئی آنے اور اس کے سونکھے حلق میں چند قطرے پانی کے ٹپکا دے۔ جو اسے اس کی بیٹائی لوٹا دے جو اسے دوبارہ سے دیوی بنا دے۔ لیکن اس کا انتظار انتظار ہی ہے۔ اب ایسی محبت کون کرتا ہے..... کوئی ہے۔

☆.....☆

گوئی گئی



چند امیساں

”امی جان گوئی بہو قسمت والوں کو ملتی ہے۔ میں تو بھابھی کے ساتھ حد سے زیادہ برا سلوک کرتی ہوں لیکن پھر بھی مجھے کچھ نہیں ہتھی ہیں شاید گھر والوں نے سمجھا کر بھیجا ہوگا کہ سسرال میں جا کر گوئی بن جانا۔“ ماہین کی نند شانلہ اور ساس راحیلہ بیگم کا قبضہ فضا میں گونجنا تھا۔

☆.....☆

ماہین کو شادی سے قبل گھر والوں سے خوب نصیحتیں سننے کو ملی تھیں۔ بڑی بہن راجین نے تو یہ تک کہہ دیا تھا کہ ہمارے لاڈ پیار نے تمہیں بہت بگاڑ دیا ہے۔ وہاں جا کر چھوٹی چھوٹی باتوں پر آنسو مت بہانا۔ ماہین نے شادی کے بعد جب غیر برادری میں قدم رکھا۔ تب پریشانی کا پہاڑ سر پر ٹوٹ پڑا تھا۔ جھٹانی کے بیٹے اولیس سے نرمی سے پیش آتی تھی لیکن ماہین کی بیٹی ماہ نور کا سکون سے جینا دشوار کر رکھا تھا۔ ہر وقت کی روک ٹوک سے ماہ نور سہم گئی تھی۔

شادی ایک جوا ہے اور وقت سے پہلے کوئی بھی یہ نہیں معلوم کر سکتا ہے کہ کامیابی ملے گی یا پھر علیحدگی مقدر رہے گی۔

☆.....☆

”میں یہ چاہتا ہوں کہ اب ہمیں یہ گھر چھوڑ دینا چاہیے۔ تم نے بہت ستم برداشت کر لیا ہے۔“ احسن نے اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا تھا۔

”نہیں احسن میں یہ گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ انکل کی وفات کے بعد اب تو آنٹی کا آپ کی پہلے سے بھی زیادہ ضرورت ہے۔ میں ٹھیک ہوں مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔“ ماہین نے اپنے آنسو چھپانے کے لیے نظریں جھکا لی تھیں۔

”ماہین! تم کس مٹی سے بنی ہو؟ کیوں تکلیف کے کانٹوں سے اپنا دامن بھرتی جا رہی ہو؟ تم نے ہمیشہ مجھ سے ایسی باتیں چھپائی ہیں جن سے تمہیں اذیت ملی لیکن اپنی ان آنکھوں کا کیا کرو گی جو مجھ سے کوئی بھی راز چھپا نہیں پاتی ہیں۔“ احسن نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر ماہین کی آنکھ سے گرنے والے آنسو قیمتی گلینے کی طرح اپنی پتیلی پر سجایا تھا۔

”اللہ بہت مہربان ہے۔ جب بھی ہمت جواب دے جاتی ہے تب میں سجدے میں سر رکھ کر اپنی بے کلی اللہ کے حوالے کر دیتی ہوں پھر اس کے بعد مجھے اپنا آپ ہکا پھکا سامحوس ہوتا ہے۔ احسن کیا گھر چھوڑنے سے مسائل حل ہو جائیں گے؟ کیا آپ اپنی والدہ کے بغیر خوش رہ سکیں گے؟“ ماہین نے شانگنی سے استفسار کیا۔

”تم بہت اچھی ہو ماہین! میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے تم جیسی رشتوں کو محبت سے نبھانے والی بیوی ملی ہے۔ ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو میں اپنی والدہ کے بغیر خوش نہیں رہ سکوں گا۔ میں جب آفس سے گھر واپس آتا ہوں تو اپنی والدہ کو دیکھ کر

راحت کا احساس ہوتا ہے۔ تمہارے اس فیصلے سے میرے دل میں تمہاری قدر مزید بڑھ گئی ہے۔“ احسن نے مایہن کا ہاتھ تھام کر محبت پاش لہجے میں کہا۔

☆.....☆

”شائلہ میری بچی میرا سرد بادو۔ اس درد نے تو آنکھوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔“ راحیلہ بیگم نے دوپٹے سے اپنا سر باندھتے ہوئے کہا۔

”ای! بھابھی سے کہہ دیں میں ابھی مصروف ہوں فرقان سے بات کر رہی ہوں۔“ شائلہ مسکراتے ہوئے سیل فون پر مینج ٹائپ کر رہی تھی۔ ”کچھ دنوں کے بعد تمہاری شادی ہے۔ چھوڑ دو اب اس موبائل کی جان۔ جب دیکھو منگیتر کے ساتھ گپ شپ میں مصروف نظر آتی ہو۔“ راحیلہ بیگم نے ماتھے پر تیوری چڑھاتے ہوئے کہا۔

”ای! میں اب اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ اس لیے میں ٹی وی لاؤنج میں نہیں آتی ہوں۔ مجھے دیکھتے کے ساتھ ہی آپ کو کام یاد آجاتے ہیں۔“ شائلہ تلخ لہجے میں کہتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب چلی گئی تھی۔

مایہن اپنی نند اور ساس کی آوازیں سننے کے بعد اپنے کمرے سے باہر آگئی تھی۔ ”کیا ہوا ہے سب ٹھیک تو ہے نا؟“ مایہن نے فکر مندی سے سوال کیا۔

”سر میں شدید درد ہے کیا تم دبا دو گی۔“ ”جی ضرور میں دودھ کے گلاس کے ہمراہ دوا بھی لادوں گی اس طرح جلد ہی آپ کی طبیعت بہتر ہو جائے گی۔“ ”شکر یہ بیٹی!“

”شکر یہ کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ تو میری

ماں جیسی ہیں اور یہ میرا فرض بنتا ہے کہ میں آپ کی خدمت کروں۔“ مایہن نے شائستگی سے کہا اور پھر اپنی ساس کا سرد ہانے میں مشغول ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد دودھ کے گلاس کے ساتھ پین کڑ بھی لاکر دے دی تھی۔ راحیلہ بیگم کو کبھی کبھار مایہن پر بہت ترس آتا تھا لیکن شائلہ ہر وقت اپنی چھوٹی بھابھی کے خلاف اپنی ماں کے کان بھرتی رہتی تھی۔ اسی وجہ سے مایہن کو نفرت آمیز جملے سننے کو ملتے تھے۔

☆.....☆

”آپ میری خالہ پہلے ہیں اور ساس بعد میں ہیں۔ بہت اچھا وقت گزرا ہے آپ کے ساتھ۔ میرا لاہور والا پلاٹ جو میرے میکے والوں نے میرے نام کیا تھا وہاں کامران نے گھر بنوانا شروع کیا ہوا تھا جو کہ اب مکمل تیار ہے۔ اب ہم وہیں رہیں گے۔ کل سے اس گھر کے درمیان دیواری تعمیر کا کام شروع ہو جائے گا۔ ہمارا جو حصہ بنتا ہے وہ ہم سچ دیں گے۔“ راحیلہ بیگم کی بڑی بہو نے خیر بھائی جس کے متعلق کبھی کسی نے سوچا ہی نہیں تھا کہ کبھی ایسا بھی ہو گا۔ اب اس نے ”بھابھی کامران بھائی نے ہم سے یہ بات کیوں چھپائی؟“ شائلہ نے اپنی والدہ کو سکتے کے عالم میں دیکھنے کے بعد خود سے بات کرنے میں پہل کی۔

”میں نے جو بتانا تھا بتا دیا ہے اب کیوں کب اور کیسے ان تمام سوالات کے جوابات دینے کی میں پابند نہیں ہوں۔“ ”بھو ایک احسان کرو گی مجھ پر؟“ راحیلہ بیگم گلوگیر لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔ ”جی نہیں۔“

”شائلہ کی شادی تک انتظار کر لو۔ غیر برادری

میں جا رہی ہے لوگ سو طرح کی باتیں کریں گے۔“ ”اچھا ٹھیک ہے۔“ نوشین سرد مہری سے جواب دینے کے بعد ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی تھی۔

☆.....☆

شائلہ کی شادی کی تیاریوں میں مایہن نے خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہاں تک کہ اپنی سونے کی چوڑیاں بھی بیچ دی تھیں اور بدلے میں ملنے والی رقم سے جہیز میں رکھنے کے لیے ضروری اشیاء کی خریداری کر لی۔ شادی کا فنکشن جو نئی ختم ہوا نوشین گھر کے سچ میں دیوار کھڑی کروانے کے بعد اپنا حصہ سچ کر اپنے شوہر اور بیٹے کے ہمراہ لاہور چلی گئی تھی اور اب راحیلہ بیگم کے ساتھ فقط مایہن ہی تھی۔

☆.....☆

سورج آگ برسا رہا تھا اور بار بار کی لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے راحیلہ بیگم کے چار جنگ فین نے جواب دے دیا تھا۔ ”آئی! آپ میرا چار جنگ فین لے لیجیے۔ جب لائٹ آئے گی تب آپ والا چارج کر دوں گی۔“ مایہن نے اپنا چار جنگ فین اپنی ساس کے سامنے رکھنے کے بعد آن کر دیا تھا۔

”ایک بات یاد رکھنا مایہن! میری بڑی بہو کی طرح اگر تم نے یہ گھر چھوڑنے کے منصوبے بنائے تو تم بھی کامیاب نہیں ہو سکو گی۔ میرا احسن مجھے کبھی بھی تنہا نہیں چھوڑے گا۔“ مایہن کی ساس تنہائی کے خوف سے چٹا چاہ رہی تھیں۔ اسی وجہ سے وہ بات کہہ دی جو آج کل اکثر ذہن میں آ رہی تھی۔

”بے فکر ہو جائیں آپ کیونکہ میں اور احسن ہمیشہ آپ کا ساتھ نبھائیں گے۔ بزرگوں کی وجہ سے ہی گھروں کی رونقیں قائم رہتی ہیں۔ آج میں آپ سے یہ وعدہ کرتی ہوں کہ میرے جیتے جی آپ کو تنہائی کا احساس تک نہیں ہوگا۔“ مایہن نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر دوپہر کا کھانا تیار کرنے کے لیے کچن میں چلی گئی تھی۔ راحیلہ بیگم کو اپنی ساعت پر یقین نہیں آیا۔ پل بھر کے لیے تو دل چاہا کہ وہ اٹھ کر مایہن کو گلے لگالیں لیکن پھر انا سچ میں آگئی۔

☆.....☆

”مایہن! باہر کوئی آیا ہے۔ جلدی سے دروازہ کھولو۔“ راحیلہ بیگم نے ڈور بیل کی آواز سننے کے بعد مایہن کو ہدایت جاری کر دی تھی۔ ہمیشہ کی طرح لہجے میں سختی برقرار تھی۔

”جی اچھا جا رہی ہوں۔“ مایہن نے اتنا کہنے کے بعد جیسے ہی دروازہ کھولا تو شائلہ کی آنکھوں کی دیرانی دیکھ کر حیرت میں مبتلا ہو گئی۔ شائلہ مایہن کے گلے لگ کر زار و قطار رو رہی تھی۔ ”شائلہ میری جان! تم رو کیوں رہی ہو؟“ راحیلہ بیگم کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔

”میں طلاق لے کر آئی ہوں یہاں اور سسرال والوں نے یہ کہہ کر مجھے گھر سے باہر نکالا ہے کہ اتنی زبان دراز بہو گھر لانے سے تو بہتر تھا ہم گونگی بہو لے آتے۔ امی جان کا ش آپ نے مجھے ٹوکا ہوتا جب میں بھابھی کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔“ شائلہ کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے جب کہ راحیلہ بیگم نے پشیمانی کے عالم میں اپنا سر جھکا لیا تھا۔

☆.....☆

نفرنگی باہر کی سہیلی شہر

اتوار کا دن تھا۔ صبح سب نے بی ناشتا ساتھ کیا تھا، حنین پھر انیسہ کے کمرے میں چلا گیا تھا، حسن کمپیوٹر کے آگے بیٹھا تھا حرا اپنے کمرے میں تھی اور وہ اپنے کمرے کی صفائی کر کے باہر آئی تھی سوچا انیسہ سے پوچھ لے

دوپہر میں کیا پکا نا ہے۔ اتوار کو عمو ماہر یا نی یا پلاؤ ہی بنتا تھا مگر آج حسن نے ان دونوں چیزوں کو منع کیا تھا یہ دیکھنا تھا پکانے کا کیا طے پایا ہے۔
”آپ لوگوں کو ضرورت نہیں ہے یہ صفائی وغیرہ اور روز روز مشین لگا کے کپڑے دھونے کی۔“ حنین کی تیز اور خفگی سے پھر پورا آواز آئی۔

آریکہ کے قدم دروازے کے باہر ہی رک گئے
”آریکہ کی مرضی نہیں ہے میں تو خود کہتی ہوں روز کے اتنے کام تم اکیلی کرتی ہو اور پھر حرا کو بھی نہیں کرنے دیتی وہ بڑھائی میں جو لگی رہتی ہے۔“
”مجھے ذرا اچھا نہیں لگ رہا ہوتا ہے آریکہ گھر کے سارے کام کرے، وہ کیا سوچتی ہوگی کہ ہم نے شاید ای

فصل نمبر 23



نیلے شادی کی ہے۔ مجھے تو وہ لڑکی جانے کیوں شروع سے پسند آئی ہے شکر ہے میرے اللہ کا اس نے آرمے گھر کی بہو بنا دیا۔“ آریکے تو سن کے ہی حیران رہ گئی وہ تو جانے کیا کیا نہ بول چکی تھی حنین سے۔
 ”آپ کل ہی سے کوئی مای کا بندوبست کرس صفائی اور کپڑے وغیرہ دھوئے۔“ حنین نے گویا اپنا فیصلہ دیا۔
 ”آریکے تو تم ہی سمجھاؤ وہ نہیں مانتی پورا دن لگی رہتی ہے۔“ انیسہ بولی تھیں۔
 ”ٹھیک ہے میں خود سمجھا لوں گا۔“

جب بات ختم ہو گئی تو آریکے بڑے فریٹش انداز میں اندر داخل ہوئی حنین انیسہ کے بیڈ پر ترچھا لیٹا ہوا تھا۔
 دیکھ کر بھی وہ نارل ہی رہا۔
 ”دشمن جان پر جامنی رنگ تو غضب ڈھا رہا ہے۔“ حنین نے اس کی اجلی اور کھلتی رنگت کو بڑی لگاؤٹ اور محبت سے دیکھا۔

”امی دوپہر میں کیا کاتا ہے۔“
 ”تم تو روز روز ہیں انہی گھر کے جھیلوں میں رہا کرو۔ پک جائے گا آرام سے بیٹھ بھی جایا کرو۔“ انہوں نے اس کی جگہ اپنے قریب ہی بلایا۔
 ”کوئی نہیں آپ بھی تو سناٹھ رہی رہتی ہیں۔“ آریکے کو یہ جان کے بہت خوش ہوئی انیسہ کو وہ ویسے ہی پسند تھی جب کہ اس نے خود سے ہی یہ ٹیٹا لائی پال رہی تھی، شاید انہوں نے کام کے لیے اس سے شادی کی تھی۔
 ”حنین کہہ رہا ہے صفائی کرنے کے لیے اور کپڑے دھونے کی مای لگاؤ۔“
 ”اس کی خاص ضرورت نہیں سب کام ہو ہی جاتا ہے حنین بھی آٹو میک ہے آپ کے گھر میں تو کپڑے صرف ڈالو اور خشک ہو کے باہر آ جاتے ہیں یہ کوئی محنت نہ ہوتی۔“
 ”میں نے کہہ دیا تو کہہ دیا تم ڈسٹنگ اور کپڑے دھوئے کھانا کھاؤ گی۔“ حنین نے اسے ذرا تیز لہجے میں ڈپٹ کر کہا۔

انیسہ نے آریکے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔
 ”بیٹا یہ ٹھیک تو کہہ رہا ہے اور اس کی آمدنی اتنی ہے یہ مایوں کو تنخواہ دے سکتا ہے۔“
 ”ہر وقت بس گھر کے کاموں کی لگی رہتی ہیں یہ محترمہ شوہر کی طرف تو یہ ہی نہیں۔“ اس نے شکایتی انداز میں کہا۔
 وہ لب بلیج کے جزبہ ہی ہو گئی پہلی دفعہ اس نے شکایت اس انداز میں کی تھی۔
 ”کیوں تم میرے بیٹے پر تو جھنجھکیا دیتی ہو۔“ انیسہ نے مسکرا کے پوچھا۔
 وہ شرم سے گڑبڑا ہی گئی۔

”امی! تو آپ کے کہنے کا بھی الزام مطلب نکال لیں گی میں مایاں بھی مطلب سے رکھ رہا ہوں۔“
 ”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔“ وہ جھینپ کے براہی مان گئی۔
 ”میں خود چاہ رہی ہوں کام کرنے والی لگ جائے تو بہتر ہے۔ تم ہر وقت لگی رہتی ہو میں تمہیں اس لیے بیاہ کے تو نہیں لائی کہ تم بس گھر کے کاموں میں اپنا وقت گزارو۔“ انہوں نے کہا۔
 آریکے کو اپنی بدگمانی والی سوچوں پر شرمندگی ہو رہی تھی۔

”یہ تو شاید یہی سمجھ رہی ہیں آپ نے گھر کی ذمہ داریوں اور کام کے توسط سے ان سے اپنے بیٹے کی شادی کی ہے۔“ حنین کو تو موقع ملنا تھا اس کی شکایت اور بدگمانی دور کرنے کا۔

”تم جب سے یہاں ہمارے گھر آئی ہو مجھے تمہاری سادگی، نماز پڑھنے کی باہندی یہ سب متاثر کر گئی تھی کیونکہ آج کل کی لڑکیوں کو دین سے کم ہی رغبت ہے اور آج مجھے فخر ہے تم نے نماز کی عادت حنین میں بھی ڈال دی ہے۔ حرا اور حسن بھی پڑھنے لگے ہیں مجھے اور کیا خوشی ہوگی میری بہو نے میرے گھر کے ماحول کو آ کے اتنا اچھا کر دیا ہے۔“ وہ اس کی خوشیوں کو بہت ستائشی لہجے میں سراہ رہی تھیں۔

”اور حنین سے بھی میں نے یہی پوچھا تمہیں پسند ہو تو میں بات آگے چلاؤں اس نے بھی مجھ پر چھوڑ دیا کہ برائی تو آریکے میں کوئی نہیں مجھے اعتراض نہیں اور آپ کی پسند میری پسند ہے۔“

اس نے چونک کے حنین کو دیکھا جو مسکرا رہا تھا۔ انیسہ نے کئی آسانی سے اس کی ساری بدگمانی غلط فہمیاں دور کر دی تھیں جب کہ اس نے اپنے دل و دماغ سے ساری منفی سوچیں اور خیالات نکال دیئے تھے۔ حنین کے بدلتے رویے اور کچھ ریزیکری باتوں نے اثر کیا تھا پھر شوہر کو محبت و پیار سے بھی تو جیتا جاتا ہے جہاں اتنا آجانی ہے وہاں رشتوں میں دوریاں ہی رہتی ہیں اور پھر میاں و بیوی کا رشتہ تو قریب آنے سے مضبوط ہوتا ہے یہ اسے سمجھ آ گئی تھی۔

”انہیں میں بھاری دھمکی بھی یقین دلاتا رہوں کہ میں پسند کرتا ہوں یہ میرے کہنے پر کبھی یقین ہی نہ کریں۔“ اس نے طنز ہی کیا۔
 ”تم نے اسے تنگ بھی کتنا کیا ہے وہ تمہاری کسی بھی بات کا یقین مشکل سے ہی کرے گی۔“
 ”تنگ بھی انہیں ہی کیا جاتا ہے میں سے محبت ہو۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

وہ تو شرم سے گلنار ہی ہو گئی انیسہ مسکرائے گی۔
 ”آریکے! ویسے اس نے تمہیں بہت تنگ کیا ہے جس سے اتنا ڈانٹتی تھی مگر جانے کیوں تمہیں چڑانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔“

”جب یہ چڑتی تھیں مجھے اور حرا آتا تھا۔“ وہ ہنسا۔
 ”کسی کو اتنا بھی تنگ نہیں کرنا چاہیے کہ بعد میں وضاحتیں اور غلط فہمیاں زندگی گزر جائے۔“ وہ نگاہ جھکائے جھکائے بولی۔

”اسی لیے تو مایاں لگانے کی کہہ رہا ہوں کہیں صفائیوں میں ہی میری اور تمہاری زندگی گزار جائے۔“ وہ بے ساختہ پر جھنجھکی سے بولا۔

انیسہ تو ہنسنے لگیں اور وہ اسے جواب میں گھورنے لگی۔
 ”امی! آپ کھانے کا تائیے کیا بنانا ہے۔“ اس نے موضوع ہی بدل دیا جب کہ وہ لیٹا ہوا اس کے چہرے کے رنگوں سے مزے لے رہا تھا۔

”حسن سے ہی پوچھو وہ بریانی اور پلاؤ کو منع کر رہا ہے۔“ وہ بھی روز روز کے پکائیے سے پریشان رہتی تھیں۔ حسن کو کچھ اچھا ہی نہیں لگتا تھا سبز یاں وہ پکا نے نہیں دیتا تھا اور دالیں حرا نہیں کھاتی تھی۔

”ٹھیک ہے پھر میں اپنی مرضی سے بنا لیتی ہوں حسن سے بھی نہیں پوچھتی وہ بہت دیر سوچنے میں لگائے گا پھر دیکھیں ساڑھے بارہ بج رہے ہیں۔“

”یہ بھی تم نے ٹھیک کہا۔“ انیسہ منتفی ہو گئی تھیں۔
 آریکے کچن میں آ گئی تھی اس کا دل و دماغ بکا بھکا ہو گیا تھا۔ حنین کی شوخی اور وضاحت نے اسے سب سمجھا

دیا تھا۔ وہ ان سب کے لیے کتنی اہمیت رکھتی ہے۔

”کیا طے پایا کیا کارہی ہو؟“ وہ بچن میں اس کے پیچھے ہی آ گیا۔

جو فریزر سے بچن کا گوشت نکال کے سنگ میں رکھ رہی تھی، جنین کے کلون کی محور کن مہک نے بچن ماحول کو بھی خواب ناک بنادیا وہ سی گھرائی ہوئی ہو گئی اس کی سمت دیکھ تک نہیں رہی تھی۔

”آپ ہی بتادیں۔“ اس نے بس اتنا کہا۔

”محبت و پیار بناؤ صرف۔“ وہ اس کے قریب آیا۔

آریکہ بدک کے پیچھے ہوئی، جنین کا قہقہہ اسے پزل کر گیا۔

”دیکھئے مجھے یہ سب ذرا پسند نہیں اور آپ جانیے یہاں سے جو کچھ بھی بناؤں گی چپ کر کے کھا لیجئے گا۔“ جنین کی موجودگی سے نروس ہو رہی تھی۔

”سوری۔“ آریکہ کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔

”کس لیے۔“ چیراگی اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

”میں آپ کو غلط سمجھتی رہی۔“

”یہ تو خیر فیصلی ہماری گفتگو ہو گئی غلط سمجھتی رہیں ایسے آسانی سے تو سوری میں بھی قبول نہیں کروں گا۔“ اس نے آریکہ کو پیار بھری میٹھی میٹھی نگاہوں کے حصار میں لیا۔ دراز سلکی بالوں کی چوٹی پشت پر پڑی تھی۔ چھوٹی چھوٹی شریر لٹیں اس کے غاذوں کو چوم رہی تھیں۔ آنکھیں اس کی ہر نی کی طرح ہی تھیں چہرے پر اس بھلا کی ساوگی ہوئی تھی وہ مہبوت زدہ رہ جاتا تھا۔

”آپ پھر کیسے قبول کریں گے سوری۔“ وہ اس کے دیکھنے سے پٹنار رہی تھی۔

”جیسے میں چاہتا ہوں اس طرح اور میں وضاحت ذرا نہیں کروں گا تمہیں سمجھنا ہوگا، میں سوری قبول کیسے کروں گا۔“ لہجہ معنی خیز شرارتی تھا ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی تھی۔

”مجھے آپ کی معنی خیزیاں سمجھ نہیں آتی ہیں۔“

”جان کے انجان کیوں بنتی ہو؟“ وہ اس کے کان کے قریب سرگوشی کرنے لگا۔

”بھائی..... بھائی!“ حسن کی آواز پر دونوں ہی اچھل گئے، جنین فرج سے پانی کی بوتل نکالنے لگا۔

”ٹھنڈا پانی بھی نہیں ہے۔“

”سردی میں ٹھنڈے پانی کی ضرورت بھی نہیں۔“ وہ جھٹ بولی۔

”کیا بتا رہی ہیں آپ؟“ وہ پوچھنے لگا۔

جنین، آریکہ پر نگاہ ڈال کے بچن سے نکل گیا۔

”میں جو بھی بنا رہی ہوں دو گھنٹے بعد سامنے آجائے گا چپ کر کے کھا لینا۔“ وہ پتی کی بنٹ سے نکالنے جھکی تھی۔

”اوکے۔“ وہ بھی چلا گیا۔

آریکہ کے حواس جو ابختہ تھے بحال ہوئے۔ جنین کو منانا یہ بھی بہت بڑا معرکہ تھا مگر اسے جنین کی شوخیاں اور معنی خیزیاں پریشان کر رہی تھیں۔ جنین تھا بھی رومی ٹک اسے شادی کی اولین شب یاد دہی۔

☆.....☆

شہر مل نے جب سے یہ کہا تھا وہ کسی اور لڑکی کو پسند کرتا ہے اس کی تو لگتا تھا نیندیں اڑ گئی ہوں یعنی یہ سچ تھا باپا کے کہنے پر اس سے شادی کرنے پر رضا مند ہوا تھا اور یہ بھی کہہ رہا تھا اس کی ماں کی خوشی کے لیے صرف اپنی پرمان جانے۔

”میں منگنی کروالوں اور وہ مزے سے دوسری لڑکی سے شادی کر لے جان سے نہ ماروں گی اس لڑکی کو اور بے بھی۔“ شدت غم اور غصے سے اس نے مٹھیاں پیچھنی لگی تھیں۔

”چپ کر کے تمنا بنتی جاؤں، ابھی نہیں، میں بھی تمہیں مزا چکھا کے رہوں گی دیکھتی ہوں کیسے اس لڑکی نے تمہاری شادی ہوتی ہے میں بھی انکا کے رکھوں گی تمہیں تم یہ منگنی تک نہیں توڑ سکو گے۔“ اس نے تو ذرا سی دیر اس اتنا کچھ سوچ لیا تھا۔ وہ شہر مل کے گھر والوں سے ایک ہی دفعہ ملی دوبارہ پھر گئی ہی نہیں۔

گھر میں بھی، شہیر کے رشتے پر ڈسکس ہو رہا تھا کہ رمضہ کے لیے اسے بھی ساتھ چلنے کو کہا تھا مگر اسے تو گھر میں بھی منع کر دیا تھا لیکن سوچا جانا چاہیے اپنی جگہ کیوں چھوڑے۔

اس نے فائل بند کی وہ مختلف کاجز میں بھی انٹرویو دے آئی تھی پچھرا شپ کے لیے رزلٹ اس کا آنے والا دن اتنی تیزی سے قلم ہو رہے تھے پتا ہی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اپنے کمرے سے نیچے آئی تو دیکھا ایک بڑ بونگ اپنی بیوی بھی، صفائیاں تھراٹھیاں ہال کمرے میں سینک اس کی تفتیشی نگاہیں ادھر سے ادھر گھوم رہی تھیں۔

”تانی امی اب یہ سب کیا ہے کوئی آ رہا ہے۔“

”ہاں آتورہا ہے۔“ وہ مسکرائی تھیں۔

دوڑے بڑے صوفے ساتھ ساتھ رکھے تھے۔ پیچر میں بھی اضافہ تھا۔

”کون آ رہا ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”ارے ماہا تم جاکے نبھاؤ گے تیار ہو مہمان آرہے ہیں تمہارا پاپا نے انہیں بلایا ہے۔“ بشری نے اس کے جیراگی زدہ چہرے پر ہلکی سی چپکلی دی۔

”پھر بھی بتائیے کون آ رہا ہے۔“ وہ کھسیان گئی۔

”جچی جان انہیں بتائیں، شہر مل بھائی کے گھر والے آرہے ہیں انہیں بلایا ہے۔“ ختام نے شوخ سے لہجے میں معنی خیزی سے بتایا۔

”ہاں شہر مل کے گھر والوں کو کھانے پر بلایا ہے۔“ بشری نے بھی نارمل انداز میں بتایا۔

”یہ اتنا اہتمام کرنے کی کیا ضرورت ہے ہال کمرے کو جگہ سے ملا کے رکھ دیا۔“ وہ بے زار ہو گئی۔

”اس لیے کہ زیادہ لوگ ہوں گے تمہارے تایا ابو نے کہا ہال کمرے کو سیٹ کر لو ڈرائنگ روم میں بھی اسٹے و سیٹ نہیں ہو سکتے۔“ وہ ماہا کو وضاحت سے سمجھا رہی تھیں۔

ماہا نے ناگواری سے یہ سب دیکھا۔

بشری نے آنکھوں کے اشارے سے شاہ کو وہ سب بتانے کو منع کیا شہر مل کی امی معنی کی رسم کرنے آرہی تھیں۔

”اور سنو اپنا موڈ ٹھیک رکھنا وہ سب پہلی دفعہ آرہے ہیں۔“

”اسٹے خاص تو نہیں ہیں۔“ وہ اکتائی۔

”لو یہ کیا کہا آپ نے شہر مل بھائی کے گھر والوں کو ملایا آپ نے اور آپ ہی ایسا کہہ رہی ہیں۔“ شاہ کو اس سے اختلاف ہوا۔

”آپ سب تو شہزیل کے حمایتی بن گئے ہو۔“ وہ دھب دھب کرتی چلی گئی۔
 ”اسے کچھ نہیں بتانا خواہ وہ میں کوئی تماشا نہیں چاہتی۔“ بشری فکر مندی سے گویا ہوئیں۔
 ”آپ پریشان نہیں ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ ثناء نے اطمینان دلایا۔
 ”بھائی، صنوبر کو تو کال کر دی تھی آپ نے۔“

”ہاں کر دی تھی دو پہر میں آنے کا کہہ رہی تھی۔“ رخشندہ نے بشری کو بتایا۔
 وہ دونوں ہی گھر کے انتظامات میں لگی ہوئی تھیں کھانا وغیرہ سب باہر سے پک کے آتا تھا۔
 وہ اوپر آ کے تملاتی ہوئی ہو رہی تھی۔ شہزیل کے گھر والے آ رہے تھے اسے جب خوشی نہیں تھی اور اس

شہزیل کو اتنی بڑی خوشی دے دی تھی گھر والوں کا پتا لگا کے اسے جانے کیوں یہ خوشی نہیں نہ ہوئی۔
 شاید اس لیے کہ شہزیل نے اپنی پسند کا اظہار کسی دوسری لڑکی کے لیے کر دیا تھا اسے یہی پریشانی تھی جو
 وہ تو خود شہزیل کو کبھی بھی وہ اس رشتے سے اسے آزاد کر رہی ہے۔

پھر یہ بے بسی پریشانی کیوں تھی اور لڑکی کا نام یہ بھی اسے گوارہ نہیں ہو رہا تھا اگر ملگنی کر کے بھی وہ اسے
 لڑکی کا ذکر کر کے چلاتا رہا تو کبھی برداشت ہوگا۔
 ”میں نہیں میں منگنی تو نہیں کروں گی اب تو بالکل نہیں میری ذات کا تماشا تم بناتے رہو اور تمہارے امی ابو کو

جھوٹا رشتہ قائم کر کے دھوکا نہیں دے سکتی۔“
 وہ دھڑ سے بیڈ پر لیٹی تھی۔ غصہ نہیں ہو رہا تھا۔ تیر کر لیا تھا کوئی بھی بلانے آئے بیچے تو قطعی نہیں جائے
 ایک دم سے اچانک ہی شہزیل کی فیملی کو بلائے گا جیسا اس سے کسی نے ذکر تک نہیں کیا اسے زور دیا بھی آیا۔

دو پہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا چادر تان کے لیٹ گئی سوچا کہ تو کوئی بلائے گا بھی نہیں، وہ سوئی رہی
 بشری ناک کر کے اس کے روم میں چلی آئی تھیں جو اس کے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔
 ”ماما! یہ کیا حرکت ہے تم اپنے روم کو لاک کر کے یہاں اسے کدوا رہی ہو، میں نے تمہارا کمرہ کبھی

تمہیں دیکھنے کو نہ دھوکے تیار ہوئی یا نہیں۔“ وہ بہت ناراض ہو رہی تھیں۔
 ”تم تو اندر سے لاک لگا کے بیٹھی ہو۔“ ماما بھی بھی نیند کی پوزیشن میں تھی۔
 ”کیا ہے امی! میں اتنی دی آئی پی ہوں کہ میری موجودگی وہاں ضروری ہے اور جیسے سب سے اعزاز میں

ہی یہ ذکر ہو رہا ہے۔“ وہ بے زاری اور اکتاہٹ کا شکار تھی۔ بشری کو ہنسی تو آئی کیونکہ اس نے کہا تو جی ہی تھا۔ اس
 کے اعزاز میں ہی آج کا ہتہام بھی تھا جو اس سے سر پر انزنگ رکھا گیا تھا، اس لیے کہ اگر اسے پہلے سے بتا دیا
 وہ منع ہی کر دے گی۔

”کیوں تم اس گھر کی فرد نہیں ہو اور پھر تم اس دن کے بعد سے شہزیل کی فیملی سے ملنے ہی کب گئی ہو جب کہ
 تم نے تو اتنی بڑی بازی ماری ہے۔“ وہ اس کے اچھے کمرے بال سنوارنے لگی تھیں۔
 ”میں نے کوئی بازی نہیں ماری ایک کوشش کی تھی جو کامیاب ہوگی۔ شکر ہے اس کھڑوس شہزیل کو بھی اندازہ

ہو گیا ہوگا مجھ میں کتنا بچپنا ہے۔“ جلی ہوئی تو پہلے سے ہی تھی۔
 ”ارے وہ تو حیران اور پریشان ہے تم نے تو کمال کر دیا جو تمہارے پاپا اور وہ خود بھی نہ کر پایا۔“ وہ اس کی
 خوبی کو سراہنے لگی تھیں۔

”امی! ارہنے دیں میں نے کوئی کمال نہیں کیا پلیز مجھے سونے دیں بہت نیند آرہی ہے، پھر مجھے کل کے
 ”امی! ارہنے دیں میں نے کوئی کمال نہیں کیا پلیز مجھے سونے دیں بہت نیند آرہی ہے، پھر مجھے کل کے

لڑکپن کے لیے بھی تیاری کرنی ہے دعا کیجیے گا یہاں تو بات بن جائے۔“
 ”کیا ضرورت پڑی ہے تمہیں کالج میں لیکچرار شپ کرنے کی۔“ وہ تو خود نہیں چاہ رہی تھیں کہ وہ جاب
 لہیرہ کرے۔

”امی یہ میرا شوق ہے۔“
 ”کوئی اور شوق رکھو، یہ پڑھانے کا شوق ہی کیوں۔“ انہوں نے نکتہ اعتراض اٹھایا۔
 ”یہ شوق وغیرہ کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھو تم نہاؤ اور تیار ہو ان کے آنے کے بعد دوسرا کوئی سوٹ پہن

لانا۔“ بشری اس کے وارڈ روم سے کپڑے نکال رہی تھیں اور جاکچ بھی رہی تھیں کون سا ٹھیک رہے گا۔ انہیں
 اس وقت کے لیے تو اسے دوسرا ہی پہننے کو دینا تھا۔ شہزیل کی امی کا قاعدہ اس کا ڈریس بھی لے کے آ رہی تھیں۔
 ”پلیز امی کیوں میرے پیچھے پڑتی ہیں۔“ وہ چڑ گئی۔

”زیادہ فضول بک بک نہیں کرو، نہاؤ جا کے۔“
 ”مغرب ہو گئی ہے اور مجھے ٹھنڈ بھی لگ رہی ہے میں نہیں نہا رہی۔“ وہ عذر پیش کر رہی تھی۔
 ”گرم پانی سے نہاؤ اور تم کب سے مغرب کے بعد نہانے نہیں گئی ہو راتوں کو سردی میں نہانے سوتی ہو

یادہ بہانے نہیں کرو اور تیار ہو کے نیچے آؤ وہ تم سے ملنے آ رہی ہیں۔“
 ”امی! اگر وہ اس حوالے سے ملنے آ رہی ہیں تو سن لیں میں نے رشتہ ختم کر دیا ہے اور شہزیل کو بھی میں نے
 لہ دیا ہے میں نے اسے آزاد کیا۔“ اس نے بتایا۔

”چلو اچھا کیا کہہ دیا اور پھر وہ اپنے ماما کی مرضی سے شادی کرے تو اچھا ہے خواہ وہ تم اس پر زبردستی
 مانگا کر دی جاتیں، تو ٹھیک نہیں تھا۔“ وہ بھی ناراض لگا رہی تھیں گویا وہیں ماما نے چونک کے انہیں دیکھا یعنی انہیں
 ہی کوئی پرواہ نہیں۔

”یہ آپ کہہ رہی ہیں جنہیں اعتراض تھا۔“
 ”جیسی اب اس کی فیملی مل گئی ہے ہمیں جنہیں زبردستی کرنی ہی نہیں چاہیے چلو اچھا ہے معاملہ منٹ گیا مگر
 اس وقت کا معاملہ تو نمٹنا ہے تم ان سے مل کے فوراً آ جانا کوئی نہیں بلائے گا۔“ بشری نے گویا اسے اطمینان

دیا۔
 وہ جو گرم اور پدمزہ سی ہو گئی تھی اسے پھر مانتے ہی بنی تھی۔ زبردستی اس نے ساری تیاری کی صنوبر اس کا
 ہاتھ لینے اور آگئی تھی۔

”پیارا لگ رہا ہے یہ کھر کب بنایا ہے سوٹ۔“ اس نے رسٹ کھر کے ایئر اینڈ ڈریس کو سٹائشی لگا ہوں
 سے دیکھا۔
 ”ایک گرام کے دوران ہی چند سوٹ بنائے تھے۔“ وہ اپنے شو لڈر کٹ لیئر اسٹپ کنگ پر برش چلا رہی تھی۔

”تم سناؤ کیسی ہو، ابھی تک کوئی خوش خبری نہیں ہے۔“
 ”بدیہ تر شرم نہیں آتی کیسے پوچھ رہی ہو۔“ وہ جھینپ گئی۔
 ”ظاہر ہے شادی کے بعد سب کو اسی کا انتظار تو رہتا ہے۔“

ڈریسنگ ٹیبل کے مرمر کے سامنے سے ہنسی اور صنوبر کے تھلے روپ کو مسکرا کے ہی دیکھا۔
 ”چلو تمہارا بھی نمبر آنے والا ہے۔“ صنوبر نے اسے بھی معنی خیزی سے مسکراتے چھیڑا۔

”تمہاری اطلاع کے لیے عرض یہ ہے میں نے شہزاد کو منع کر دیا ہے بلکہ رشتے سے آزاد کر دیا ہے۔“

”اچھا یہ کب ہوا۔“ وہ پوچھی۔

”زیادہ جھگڑے اور ہونے کی کوشش نہیں کرو۔“ وہ تنک ہی گئی۔

”آئی آئی آپ کے میاں جی آگئے ہیں اور شہزاد بھائی کی پہلی بھی آگئی ارے وہ تو بہت کچھ لائے

سامان ہے بھئی واہ ماہاجی آپ تو گرہٹ ہو گئی ہیں بلکہ آپ کے نمبر بڑھ گئے ہیں۔“

”یکواس نہیں کرو۔“ وہ جھین ہی گئی۔

صنوبر بھی ڈارک پر پل کمر کے کپڑوں میں بھی سنوری تھی، وہ دونوں چلی گئی تھیں مگر ماہا کی چھٹی حس بیدار گئی تھی کہیں شہزاد کی امی تنگی کے ارادے سے تو نہیں آئیں اور یہ سب اس سے چھپایا گیا ہو۔

لیکن اگر ایسی کوئی بات ہوتی امی اسے بتا دیتیں۔ وہ انھی اور سوچا جائزہ تو لے دیے بھی اسے جانا تھا۔ وہ دروازہ کھول کے نکل ہی رہی تھی بشری اور صنوبر خوب صورت سے بڑے بڑے ڈبے لے کے اندر آئی تھیں ماہا نے ٹیٹا کے چہرے سے سب دیکھا۔

”چلو ماہا! لڑکیاں پہنو۔ صنوبر تمہارا میک اپ کر دے گی پارلر میں تو ناٹم لگ جائے گا۔“ بشری خاصی میں تھیں۔

”آخر یہ سب ہو کیا رہا ہے۔“ وہ تو گزربڑائی کیونکہ ایک ڈبے سے اس کا براڈیل میکسی ڈریس نکلا دوسرے میں شوز جو بوری کافی کچھ تھا۔

”تمہارا نکاح ہو رہا ہے شہزاد بھائی کے۔“

”کیا نکاح امی! یہ کیا ہے مجھے بتائے بغیر اور سب کچھ جانتی ہیں اور وہ شہزاد اس کا داغ خراب ہو رہا ہے۔“ وہ تو اشتعال میں ہی آگئی۔

”ماہا تمہیں اللہ کا واسطہ ہے کوئی تمنا نہیں بنانا سب کچھ بہت خوش دلی سے ہو رہا ہے تمہارے پاپا اور میں نے جا کے سارے معاملات طے کیے ہیں۔“ وہ مجیدہ ہو گئی تھیں۔

”مگر امی! یہ سب ٹھیک نہیں ہے نکاح آپ جانتی ہیں شہزاد کو میں پسند نہیں کرتی۔ وہ تو.....“ بولتے رک گئی۔ شہزاد نے تو اس سے وعدہ لیا تھا اس کے راز کو راز ہی رکھے وہ کسی دوسری لڑکی کو پسند کرتا ہے۔

”اگر پسند نہیں ہوتیں تو وہ ماں کے کہنے پر راضی نہیں ہوتا۔“

”وہ ان کا دل رکھ رہا ہے۔“ وہ تو عجیب پیش و پیش میں مبتلا تھی۔

”میں ابھی شہزاد سے آپ کی بات کرتی ہوں۔“ اس نے اپنا موبائل ڈھونڈنا شروع کیا۔

”ماہا! کیوں تم اس میں الجھی ہو، شہزاد بھائی راضی ہیں تو ہی تو ان کی امی اتنا کچھ اتنی خوشی سے لے کے آ رہی ہیں۔“ صنوبر بھی اسے سمجھانے لگی۔

ماہا بے بس تھی ان کو وہ سب کیسے بتائے یہ تو خود اس کی بھی دل آزاری ہے۔

”ماہا ہماری عزت رکھو اور چپ کر کے یہ سب پہن لو۔“ بشری کی آنکھوں میں غم کی درآئی تھی۔

”صنوبر تم اسے تیار کر کے جلدی نیچے لے آؤ ساری تیاری ہو گئی ہے۔“ وہ اس سے نگاہ چراتی ہوئی چلی گئی تھیں۔

ماہا کا تو دل یہ کر رہا تھا نیچے جا کے شہزاد کو اتنا سنائے اور اتنا ہنگامہ کرے کہ اس کے چودہ طبق روشن ہو جائیں مگر اسے پھر اس کی ماں اور بیمار باپ کا خیال آ گیا۔

”کاش یہ سب دل کی خوشیوں سے ہوتا تو کتنا اچھا لگتا۔“ براڈیل ڈریس پہن لیا تھا صنوبر اسے تیار کر رہی تھی ایسے جیسے کوئی قربانی کا جانور تیار ہو رہا ہو۔ آنکھوں کے گوشے ٹیلے ہو رہے تھے۔

اور پھر اس کی نہ نہ بھی کسی نے نہ سنی وہ سر جھکائے بجھے دل کے ساتھ صنوبر کی ہمراہی میں چلی آئی۔ نگہت نے اس کی جگہ اپنے قریب ہی بنائی تھی رمضہ اور عمرہ اس سے باری باری آ کے گلے بھی لٹی تھیں۔

شہزاد بلیک ڈریس میں خاصا پینڈم اور ڈیشنگ لگ رہا تھا اور اس کی نگاہ ماہا کے ستے ہوئے چہرے پر تھی جو آج دنیا جہاں کی رعنائیاں لیے ہوئے تھا۔ دادی جان بھی ماہا کے قریب آگئی تھیں وہ بھی بہت خوش تھیں شہزاد کو یہ جان کے زیادہ خوشی ہوئی تھی انہوں نے اس کے ماں و باپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔

منیب احمد کی وہ دنیا بھی نکاح کے وقت وہ اس کے پاس تھے۔ کب اس سے پوچھا کب اس نے ایجاب و ان کیا، ماہا تو جیسے سکتے کی کیفیت میں تھی فواد نے اس کے کان میں آ کے مبارک باد دی وہ چونک گئی۔

”پھر نگہت اس کے ساتھ آ کے بیٹھ گئی تھیں۔“

”یہ ہماری امانت آپ کے پاس چند ماہ کے لیے ہے پھر ہم لے جائیں گے۔“

ماہا کے تو جسم میں سنسنی ہی دوڑ گئی۔ نکاح کے بعد تو اس کے احساسات میں تبدیلی ہی آگئی تھی ایک دم سے انہو جو دور یہ سارا ماحول پرماہی لگنے لگا تھا۔ نگاہ اس کی جھکی ہوئی تھی۔

شہزاد، شہیر اور صنوبر کے شوہر سے محو گفتگو تھا۔ بتایا ابو اور منیب احمد نوید احمد سے جانے کیا معاملات نمٹا رہے تھے۔

”جی کیوں نہیں مگر ہمارا سوال تو آپ کے پاس ہی ہے۔“ رخشہ نے پنک کپڑوں میں سادہ سی رمضہ کو لکراتے دیکھا جو پہلو بدل کے حیات کے صدارت میں تھی۔

”مجھے تو اعتراض نہیں شہزاد سے اور پوچھ سکتے ہیں۔“ نگہت گویا ہوئیں۔

”مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں اور مجھے خبر ہوگا شہزاد میری بہن سے شادی کرے گا۔“ شہزاد نے شہیر کو گلے سے لگالیا۔ دوسرا رشتہ بھی طے پا گیا تھا۔ رخشہ نے رمضہ کا منہ میٹھا کر دیا تھا۔ کچھ نوٹ اس کی ہتھیلی پر لکھے دیئے تھے۔ شہیر کو کم گوی لڑکی نے ایسے متاثر کیا وہ اس کے دل میں چلنے لگی۔

ڈنر جب ہونے لگا، ماہا اپنا براڈیل ڈریس سنبھالتی ہوئی اوپر اپنے روم میں چھاگ لی تھی۔ شہزاد کی لکراتی نگاہوں نے اس کا تعاقب کیا تھا۔

”ماہا بھائی! بہت پیاری لگ رہی ہیں۔“ شمرہ نے شہزاد کے کان میں شرارتی انداز میں کہا۔

”تم بھی کم پیاری نہیں ہو۔“ اس نے شمرہ کو ساتھ لگایا۔

ڈنر ہوا اور پھر سارے ہال کمرے میں جمع ہو گئے تھے۔ اپنی اپنی سیلفیاں لی جا رہی تھیں، امجدہ، فواد اور شیراز اللہ شہزاد کے ساتھ سیلفی بناتے رہے تھے۔

”شہزاد بھگے پسند آیا تم سب کو۔“ منیب احمد نے پوچھا۔

شہزاد نے کزشتہ دنوں ہی بگڑے بھی خرید لیا تھا جو اس نے منیب احمد کے مشورے سے لیا تھا۔ ان سے ہی وہ ہر مسئلہ ڈسکس بھی کرتا تھا۔

”ہم سب کو ہی پسند آ گیا ہے۔ شفتنگ بھی دو تین دن میں کروالوں گا۔“ اس نے کہا۔

”گڈ!“ منیب احمد نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

”انگل میں نے ماہا سے یہ رشتہ خوش دلی سے اور اپنی پسند سے کیا ہے آپ دل میں کوئی بھی منفی سوچ نہ لا گا۔“ اس نے قدرے توقف کے بعد ان سے کہا۔
 ”بیٹا! میں نے تمہیں ماہا کے متعلق اس لیے بتایا ہے کہ تم بہت سمجھ دار ہو کیسے ہینڈل کر سکتے ہو تم بہتر جا ہو اور میں نے نکاح کی شرط اس لیے رکھی کہ تاکہ ماہا کوئی بھی ایسی بے وقوفی نہ کرے جو اس کے لیے پریشان باعث ہو۔“

”میں سب جانتا اور سمجھتا ہوں ماہا کو میں ڈیل کر لوں گا۔ وہ تھوڑی جذباتی ہیں اور حساس بھی بہت ہیں بات اپنی طرف سے سوچ کے اخذ کر لیتی ہیں۔“ شہزاد ان سے مدد پر انداز میں مخاطب تھا۔
 ”میری دعا یہ کہ تم دونوں کے ساتھ ہیں، مجھے آج فخر ہے میرا داماد اتنی اچھی بیچر کا مالک ہے۔“
 ”میں داماد نہیں آپ کا بیٹا ہی ہوں۔“ وہ منیب احمد کے گلے سے لگا ہوا تھا۔
 ”منیب احمد نے اسے ماہا سے ہونے والی ساری گفتگو بتادی تھی اسی لیے اچانک سے یہ نکاح بھی رکھا گیا۔“

☆.....☆

کنول کو فہر کی فکر ہوئی تو وہ زہرہ کے پاس چلی آئی تھیں اور سب کچھ انہیں بتا دیا تھا۔
 ”اس نے مجھے تو یہی نہیں بتایا جرنی کا پروجیکٹ ملا ہے۔“ زہرہ کو تو سن کے غصہ ہی آ گیا۔
 ”آپ خود دیکھیں کتنا غلطایا ہوا ہے ماما نے اگر کہیں اور نیل فخر کا رشتہ کر دیا تو ٹھیک نہیں رہے گا لہر عادت کو آپ جانتی ہیں ضدی کتنا ہو گیا ہے۔“
 ”مجھے اور کیا فکر پریشانی ستاتی رہتی ہے؟ میں کس منہ سے اس کا رشتہ مانگوں جب وہ راضی ہی نہیں۔“
 ”امی! نیل فخر کو مانیایا بھی جاسکتا ہے اور جو بچہ اسے ہر کی طرف سے غلط نہیں یا غصہ ہے اسے ہم دور کر سکتے ہیں۔“ کنول انہیں اطمینان دلارہی تھیں۔
 اور زہرہ تو عجیب تشکش کا شکار تھیں۔ ”رہا نے خود ان سے کل بھی فون پر فہر کی بات کی تھی کہیں لڑکی دیکھی نہیں ان کی تو اس وقت بھی ہمت نہیں پڑی باتوں میں وہ اپنا ارادہ ہی ظاہر کر دے نیل فخر کے لیے۔“
 ”میں پھر خود نیل فخر سے بات کروں گی دیکھو وہ لڑکی حالات کی ستانی ہوئی ہے مگر ہم زبردستی اپنی چلائیں گے تو یہ بھی ٹھیک نہیں رہے گا۔“

”زبردستی تو ہم کر ہی نہیں رہے فہر کا رشتہ دیں گے ماموں جان اور ماما نیل فخر سے پوچھنے کے بعد ہی کیا جوابی فیصلہ کریں گے۔“ اس نے دیکھا زہرہ اپنا سر پکڑے بیٹھی تھیں۔

”امی! آپ اتنی پریشان نہیں ہوں۔“
 ”کنول اگر نیل فخر نے منع کر دیا تو فہر تو باگل ہو جائے گا۔“ وہ گویا ہوئیں۔
 ”ابھی کی امید رہیں اللہ نہ کرے ایسا کچھ ہو فہر اسے پسند کرتا ہے کوئی گناہ تو نہیں کیا اور یہ سب کچھ انجانہ میں ہوا جو کچھ بھی فہر نے کیا۔“

”انجانے میں نہیں اس نے نیل فخر کو اپنی طاقت اور مردانگی دکھائی کی وہ کیا نہیں کر سکتا۔“ ان کا غصہ تو کم نہیں ہو رہا تھا جو جرنی انہوں نے سنی تھیں وہ انہیں بے چین کیے ہوئے تھیں۔

”ایسا کچھ نہیں تھا۔“ کنول نے نفی میں سر ہلایا۔
 ”تم اس کی حرکتوں پر پردہ ڈالتی رہی ہو اگر مجھے پہلے بتا دیتیں تو اس کی لگام وہیں کس لیتی۔“

”آپ کو اپنے بیٹے سے پیار نہیں ہے۔“ کنول نے ان کے ہاتھ تھامے۔
 ”مجھے اپنے بیٹے سے بہت پیار ہے مگر جی سے بھی مجھے پیار ہے۔“ وہ بولیں۔
 ”آپ پریشان نہیں ہوں اللہ کا نام لے کے ماموں جان کے چلیے بلکہ آج ہی چلتے ہیں۔“ کنول کو تو کچھ یادہ ہی جلدی تھی۔

”پہلے تمہارے ابو سے ذکر کروں گی پھر ہی کوئی فیصلہ کروں گی۔“ انہیں رحمان علی کو بھی تو بتانا تھا۔
 ”ٹھیک ہے ابو تو شام میں آجائیں گے بیٹھ کے بات کر لیتے ہیں۔“ اسے کچھ تسلی ہوئی زہرہ کی رضامندی

یہ کہ۔
 کنول رات تک یہیں رکی رہیں، ریان اور عفان بھی یہیں آگئے تھے۔ شعیب آفس آنے کے بعد تھک

بات تھے اس لیے وہ نہیں آئے تھے۔

کھانے سے فارغ ہو کے انہوں نے رحمن علی سے فہر اور نیل فخر کے رشتے کی بات کر لی۔

فہر اس وقت اپنے روم میں تھا وہ فہر کا سامنا کرنا بھی نہیں چاہ رہی تھیں۔
 ”ارے یہ تو بہت ہی اچھا سوچا آپ نے مگر صاحبزادے کی مرضی بھی تو پوچھیے کہیں وہ کسی لڑکی کے چکر

اس نہ ہو۔“ انہیں اندازہ تو چلنے کے تھا فہر کی کو پسند کرتا ہے۔
 ”اس کی مرضی سے ہی آپ سے ذکر کر رہی ہوں۔“ زہرہ نے ان سے اصل کہانی مخفی ہی رکھی ورنہ وہ فہر کو

زیادہ لعن طعن کرتے اور باپ، بیٹے کی تکرار اور بحث ہوا اچھا نہیں تھا۔

”امی ہم آج ہی چلتے ہیں۔“

”ارے ایسے کیسے چلتے ہیں اپنے بھائی کو بھی تو بلانا ہے تو بتاؤں۔“ زہرہ بولیں۔

”اسے میں بتا دوں گی۔“ کنول تو یہ خوش خبری اسے دینے کے روم میں چل دی تھیں۔

دروازے پر ناک کیے بغیر ہی وہ اندر آ گئی تھیں وہ ہیڈ پر بیٹھ کر فائل کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

”اچھا تو آپ آج رکی ہوئی ہیں۔“ اس نے فائل کو بند کیا۔

”فہر مبارک ہوا می مان گئی ہیں اور ہم جا بھی رہے ہیں۔“

”کیا واقعی۔“ وہ تو حیرانگی اور خوشی سے گویا ہوا۔

”ابو سے بھی امی نے بات کر لی ہے انہیں بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”مگر وہ لڑکی اسے تو اعتراض ہوگا۔“ وہ ایک دم افسردہ ہو گیا۔

”کچھ تو کرنا ہوگا۔“ کنول مسکرائی تھیں۔

اور فہر ان کے کھلتے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

”آپ دیکھنے میں بھی چاہوں گا نیل فخر خوشی میرا ساتھ قبول کرے کیونکہ امی کو میری طرف سے بہت

پیار ہے۔“ وہ بولا۔

”تم تو کہہ رہے تھے اس کی رضامندی نہ بھی ہو تم اس سے شادی کر کے رہو گے۔“

”شادی تو مجھے اس سے کرنی ہے مگر اس جد باتیت میں اور اب میں فرق آ گیا ہے مجھے سب کا بھی سوچنا پڑ

ہا ہے۔“

”یہ دودن میں اتنا بڑا فیصلہ فہر خیریت تو ہے۔“ وہ تو اسے چونک کے حیرت و انبساط میں مبتلا ہو کے دیکھنے لگیں۔

”میں نے خود کو بہت سنبھالا ہے کیونکہ ماموں جان نیل فرکی مرضی کے خلاف تو یہ رشتہ کریں گے نہیں۔“
 ”اگر تم کہو تو میں اپنے طور پر نیل فر سے بات کرتی ہوں تمہاری محبت کا یقین دلاتی ہوں۔“
 ”آپ اس کے آگے میرے لیے جھکیں گی نہیں آپنی میری محبت سچی اور پاکیزہ ہے اب میں نے اپنی
 اوپر والے پر چھوڑ دیا ہے وہ جو بہتر کرے۔“ فہر کی ایسی مدبرانہ باتیں وہ حیران کن تک وہ پاگل ہو رہی
 آج اس میں حیران کن تبدیلی تھی۔
 ”آپ لوگ جاییے۔“ اس نے کہا۔
 ”تم اداس نہیں ہو۔“

”ارے میں کیوں اداس ہوں گا۔“ وہ مسکرایا۔
 ”میں تو امی سے آج ہی جانے کا کہہ رہی ہوں کیونکہ پھر تم کہہ رہے ہو جو مرضی کا وزٹ ہے اچھا ہے تمہارا
 شادی جلدی ہو جائے۔“
 ”اوکے جو کرنا ہے کریں۔“
 ”فہر تمہاری اس سے شادی ہو جائے گی تو ہنسی مون کے لیے اسے پہلے کہاں لے کے جاؤ گے۔“ کنول
 اسے چھیڑنے لگی تھی۔
 ”یہ سب کچھ بعد میں آتا ہے ہی جان جائے تو مون پر بھی اگر وہ بولے گی تو لے جاؤں گا۔“ وہ بھی
 لگاتے بولا۔
 ”سوچ لو مون کی فرمائش کر ہی نہ دے۔“ وہ اسے پھیرے جا رہی تھیں۔
 وہ پھر جواب میں ہنسنے لگا تھا۔ کنول پھر اس کے روم سے چلی گئی تھیں مگر فہر کی نفرت کی انکار کی اس
 نفرت کی وہ سب جانتا تھا۔

☆.....☆
 فہر کا اس دن قریب آنا اور اچانک سے اس کا بھاگ جانا کیسے سہم گئی تھی مگر اسے یہ کیا ہو رہا تھا جس سے
 نفرت کا دعویٰ کر رہی تھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے یقین دلاتی تھی نفرت کر رہی تھی
 سکتی پھر اس کے دل تک محبت کی خوشبو کیسے آگئی۔
 فہر کے آج دیتے جذبے اس کے سچے جذبوں کی سچائی محبت کی صداقت ہے جو دھیرے دھیرے اس کی
 نفرت کو کاٹ رہی ہے۔
 یا پھر سارے منظر بدل جانے سے اس کے دل میں تبدیلی آئی تھی اس کی سوچوں میں تبدیلی آئی تھی وہ
 اپنی حالت سے پریشان تھی۔
 مسٹرڈ پر عہد پٹروں میں اس کی سرخ و سپید رنگت دمک رہی تھی۔ اس نے درشہوار تک سے اپنی حالت
 نہیں کیا تھا۔
 درشہوار اور زبیدہ مشترکہ روم میں رہتی تھیں اور اس کا روم الگ تھا اس لیے بھی وہ درشہوار سے فہر سے
 کچھ بھی شہر نہیں کر رہی تھی بلکہ ایسا لگ رہا تھا دل کا چور چہرے سے عیاں نہ ہو جائے۔
 جانے کیوں فہر کا اسے انتظار رہتا شاید کال کر لے کر اس نے تو کال کرنی تک چھوڑ دی تھی اس لیے
 کسی کو نہ بتا دے۔

دروازے پر زور دار دستک ہوئی نیل فر کے سوچوں اور خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔
 ”آپ ادھر ہیں میں پورا گھر چھان کے آگیا۔“ حمزہ نے اسے دیکھ کر ہانک لگائی۔
 ”پورا گھر جھانتے کیوں آئے میں روم میں ہوں آ جاتے۔“
 وہ نیل فر کے بیڈ پر آرام سے بیٹھ گیا تھا۔
 وہ مسکرانے لگی یہاں آ کے تو وہ اتنی پرسکون اور اطمینان سے ہو گئی تھی اسے ماں و باپ مل گئے تھے وہ بھائی
 مل گئے تھے جو اس پر ہر وقت ہی نچاؤ رہتے تھے۔
 ”ای کھانا لگوا رہی تھیں کہنے لگیں آپ کو بھی بلا کے لے آؤں۔“
 ”میں آ ہی رہی تھی۔“ اس نے اپنے دو بے کوشانوں پر برابر کیا۔
 ”آئی اب یہ درشہوار صلیب کا بھائی سے کیا چھتیس کا آ کر ہے۔“
 ”کیا فضول بول رہے ہو۔“ وہ کچھ بھی نہیں اور اسے ہنسی بھی آنے لگی۔
 ”ارے میں سچ کہہ رہا ہوں بے چاری کو بلاؤ جب ڈانٹتے رہتے ہیں ابھی بھی ان کی کلاس لگادی۔“
 ”کیوں کیا ہوا۔“ وہ دونوں روم سے باہر آ گئے۔
 ”لگتا ہے آپ نے تجزیہ کر لیا ہے مجھ سے ٹکراتی رہیں گی کوئی کام ڈھنگ کا ہوتا نہیں ہے۔“ ضیاء کی پھر غصہ
 سے بھر پور آواز آئی۔
 نیل فر نے نیچے دیکھا وہ ڈانٹنگ نیل پر برتن رکھ رہی تھی اور ضیاء جانے اسے کس غلطی پر سنار ہا تھا۔
 ”ملاحظہ کیا۔“ حمزہ نے اشارہ کیا۔
 نیل فر نے ذرا ناگواری کا اظہار کیا جو ضیاء نے ٹھٹھکیا۔
 ”آپ کو اگر اس سے پرالیم ہے تو ہم یہاں سے چلے جاتے ہیں۔“ نیل فر نے درشہوار کا سستا ہوا چہرہ
 دیکھا جو سر جھکائے ہوئے کھڑی تھی۔
 ”ارے نیل فر یا! اس نے میرے سیل کی ایسی کی تیسری کردی۔“ وہ دہائی دینے لگا۔
 ”مجھے کیا پتا تھا انہوں نے فرج پر رکھا ہے میں نے فرج کھولا اور بند کیا تو اوپر سے گر گیا۔“ وہ بتانے لگی۔
 ”ویسے بھائی آپ کے لیے یہ سیل لینا مشکل تو نہیں ہر وقت بے چاری کو ڈانٹتے رہتے ہیں۔“ حمزہ کو بھی
 درشہوار پر ترس آ رہا تھا۔
 ”میں نے جان کے نہیں کیا۔“ وہ رو ہانسی ہو گئی۔
 ”ضیاء! تم کیا بچی کے پیچھے ہی پڑ گئے۔ پانی تم نے اس سے مانگا وہ میرے ساتھ کچن میں کام کر وانے آ گئی
 کہ کھانا لگو لیتی ہوں تم نے اسے اپنے کام بتا دئے یہ تمہاری نوکر نہیں ہے۔“ ثریانے بھی اسے آڑے ہاتھوں ہی لیا۔
 اور ضیاء سر کھجائے لگا، کیونکہ ثریانے تو اس کی کھینچائی شروع کر دی۔
 نیل فر کا الگ منہ بن گیا اور درشہوار نے اسے دیکھا جب کہ ضیاء نیل فر کے پاس آیا۔
 ”آپ مجھ سے بات کرنے کی کوشش بھی نہیں کیجیے گا۔“ اس نے شہادت کی انگلی اٹھاتے وارننگ دی۔
 ”میں تو اسے خوب سمجھاتی ہوں کم سے کم کسی چیز کو ہاتھ لگایا کرے، کوئی بڑا نقصان ہو گیا تو کتنی شرمندگی ہو
 گی۔“ زبیدہ نے بھی درشہوار کو خاصی سنائی تھیں۔
 ”خالد اتنے سے موبائل کے لیے آپ نے شہوار باجی کو ڈانٹ دیا، حد ہو گئی۔“ حمزہ کو بھی برا لگا۔

”زبیدہ آپ کو تو کم از کم عقل سے کام لینا چاہیے چیز تھی ٹوٹ گئی اور آجائے گی لے کے بچی کو ڈانٹ دیا۔
ضیاء کی تو میں بعد میں خبر لوں گی۔“ کھانا لگ چکا تھا سب ہی آگئے تھے۔
خلیل احمد بھی آگئے تھے۔

”نیل فریڈم۔“ ثریا نے اسے کہا۔
”میں نہیں کھا رہی۔“ وہ ناراضی اور خفگی دکھاتی جانے لگی۔
”نیل فریڈم۔“ ضیاء اس کے پیچھے دوڑا۔
خلیل احمد نے حیرانگی سے سب دیکھا۔ انہوں نے ثریا سے پوچھا بھی۔
”بات نہیں کریں۔“

”تم تو ناراض ہی ہو گئیں۔“ ضیاء تو گھبرا گیا۔
”بھائی! اگر آپ کو اس کا یہاں آنا برا لگے تو ہم یہاں سے چلے جائیں گے اور آپ در شہوار کو کمتر سمجھ رہے ہیں جو اسے ہر وقت ڈانٹتے رہتے ہیں۔“
”نیل فریڈم! کافر! تم کیا فضول بول رہی ہو۔“ وہ اپنا سر پکڑ کر رہ گیا۔

زبیدہ اور در شہوار تو ان کے ہمراز تھے ان کی وجہ سے دونوں بہن بھائی میں لڑائی ہو۔
”میں در شہوار کو کمتر نہیں سمجھتا تم فلا سوچ رہی ہو۔“ وہ جھٹ وضاحت بھی دینے لگا۔
”بیٹا! تم لوگ ہمارے لیے جھگڑا نہیں کرو، ہم کم حیثیت لوگ آپ لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“ زبیدہ کی آنکھوں میں حسرت و افسردگی سے آنسو آ گئے۔
”آخر یہ سب ہو کیا رہا ہے۔“ خلیل احمد کو خانگ کی چلنے نہیں پڑا تھا یہ بحث اور خفگی ناراضی کیا ہے نیل فراتی غصے میں اور ضیاء کا شرمندہ چہرہ۔

ثریا نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں غصہ کرنے سے روکا۔
”ضیاء کا نیل شہوار سے گر گیا اور جان کے نہیں گریا فریج پر اس نے زکھا کر کسی سے بھی گر سکتا تھا۔“ ثریا نے ہی بتایا۔

”پھر اس میں اتنا غصہ کی کیا بات ہے۔ دوسرا لے لینا۔“ انہوں نے الٹا ضیاء کو بھی ڈانٹ دیا۔
”پلیز آپ لوگ جھگڑیں نہیں ہم ہی یہاں سے چلے جائیں گے۔ چلیے امی ہم غریب لوگوں کی یہاں جگہ نہیں۔“ در شہوار بھی تیزی سے اٹھی۔

”یہ کیا لگا رہی ہے غریب کم حیثیت یہاں کوئی ایسا نہیں سمجھتا زبیدہ آپ ہمارے لیے باعث عزت ہیں اور میں ابھی یہ فیصلہ کرتی ہوں بلکہ آپ سے ہتی ہوں ضیاء کی شادی در شہوار سے ہوگی۔“ ثریا نے یکدم ہی گویا کوئی دھماکا کیا تھا۔

سب ہی لنگ رہ گئے۔ ضیاء وہ تو اچھل گیا جب کہ در شہوار تو ٹپٹا گئی، نیل فریڈم بصارت اور سماعت جیسے سکتے ہیں تھیں۔
خلیل احمد تو خود بل گئے۔

”واہ امی آپ نے تو زبردست دھماکا کر دیا۔“ حمزہ نے خوش ہو کے کلپنگ کی۔
”بھائی بیگم یہ کیا آپ اپنے بیٹے پر ظلم کر رہی ہیں میری بیٹی آپ کے گھر کی بہو بنے کہاں اوقات ہے اس کی۔“

”آج کے بعد میں آپ کے منہ سے کچھ نہیں سنوں گی میں نے آپ کو ضیاء کا رشتہ دے دیا۔“ ثریا نے انہیں کہا اور گلے سے لگا لیا۔

در شہوار اور بروم میں جانے لگی۔ ثریا نے روک لیا اور نیل فریڈم کھلا کا کھلا تھا۔
”اب تو خوش ہو جاؤ۔“ حمزہ بولا تھا۔
اور ضیاء وہاں سے اٹھ ہی گیا۔ خلیل احمد نے نیل فریڈم کو بٹھایا زبیدہ کو بھی سمجھایا۔
”بھیا آپ اپنے بیٹے کی مرضی کے خلاف رشتہ نہیں کریں۔“
”ثریا نے کچھ سوچ کے ہی کہا ہے آپ پریشان نہ ہوں، در شہوار سمجھدار بچی ہے ہمیں پسند ہے۔“ خلیل احمد نے ان کی بات کے جواب میں کہا۔

ثریا نے اپنا فیصلہ دے تو دیا تھا مگر ضیاء کی بھی فکر تھی وہ کوئی رسپانس دیئے بغیر جو چلا گیا تھا۔
”چلیں بھئی کھانا تو کھائیں۔“ حمزہ کو بھوک لگی تھی وہ بیٹھ گیا تھا۔
نیل فریڈم کی پریشانی بھی اس نے برائے نام کھایا جب کہ در شہوار کی تو ایسی کیفیت تھی کہ وہ نہ خوش تھی اور نہ غصے کا اظہار کر رہی تھی وہ روم میں آ کے بند ہو گئی تھی۔

☆.....☆

بنگلے میں ان کی شفتنگ ہو گئی تھی شہزاد نے رضہ اور اسجد کی جاب بھی ختم کرادی تھی۔ وہ معقول تنخواہ پر نیب احمد کے پاس جاب کر رہا تھا اور پھر اس کو کچھ عرصے بعد اپنا چھوٹا سا بزنس بھی کرنے کا ارادہ تھا نیب احمد نے اس کی حوصلہ افزائی ہی کی تھی وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ لوگ یہ کہیں سرکاری دولت پر عیش کر رہا ہے اس نے اپنی خودداری رکھی ہوئی تھی بلا وجہ نیب احمد پر بھی اپنا بوجھ نہیں ڈالا تھا اور اب تو انہوں نے اپنی بیٹی کو اسے سونپ کے اور ہی اس کی عزت بڑھا دی تھی۔ نکاح کے بعد اس کی ماں سے اپنی تانے ملاقات نہیں ہوئی تھی وہ جانتا تھا ماں کو یہ سب برداشت نہیں ہو رہا ہوگا کیونکہ اس نے دوسری لڑکی کا ذکر کر کے اس کے تو شنگے ہی لگا دیئے تھے۔
”ماں! تمہارا غصہ تمہارا جنون صرف میرے لیے مجھے اچھا لگنے لگا ہے، تم فکر نہیں کرو بہت محبت اور اپنائیت سے اپنی محبت کا احساس تمہیں دلوں گا جو تم نے بھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔“ شہزاد نے لب کر رہے تھے۔
”بھائی جان میرے روم کا بیڈا تانا بڑا لیا ہے۔“ اسجد نے اس سے کہا وہ چونکا۔
”کیا بیڈ؟“

”بھائی جان آپ نے بڑا لیا ہے۔“
”یار! تم بڑے بھی تو ہو گئے ہو بڑا بیڈ اس لیے لیا ہے۔“ اس نے اسجد کے لیے تذکرہ کرتے ہوئے لگا ہوں سے دیکھا۔
”ہم شروع سے محدود گھر میں رہے ہیں تو مجھے اس لیے بھی عادت نہیں ہے آپ کو تو عادت ہوگی۔“ اس نے شہزاد کے روم کا تفصیلی جائزہ لیا جس کی سیٹنگ وغیرہ سب رضہ اور شہرہ نے ہی کی تھی، اس نے سب کچھ ان پر چھوڑا ہوا تھا۔

”نہیں یار اب ایسا بھی نہیں ہے وہ سب تم جو رہے مجبوری میں تھا اور وقت کا تقاضا بھی تھا تمہارا بھائی برسر روزگار ہے۔ معقول آمدنی ہے میں سب انورڈ کر سکتا ہوں اور میرا فرض ہے میں اپنے ماں و باپ اور بہن بھائی پر خرچ کروں۔“ اس نے سمجھایا۔
”بھائی جان ڈرائنگ روم کی سیٹنگ ہم ماں بھائی سے کروالیں۔“ شہرہ کو سمجھا آیا تو وہ بھی چلی آئی۔

تھی۔“

”لو کیاں ایسے موقعوں پر چپ ہی رہتی ہیں اور پھر منیب احمد بتا رہے تھے نکاح کا اسے بتایا نہیں تھا۔“
شہزہیل ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا اس کے ماں باپ کو بھی ماہا کا رویہ شامی کر رہا تھا۔
”شہزہیل کہیں ایسا تو نہیں ماہا سے زبردستی ہاں کروائی ہو تم بتاؤ وہ لڑکی مزاج میں کیسی ہے۔“ گہمت تو ماں
تھیں، انہیں اپنے بیٹے کے مستقبل کی فکر ہونے لگی کہیں آگے جا کے وہ دونوں خوش نہ رہیں۔
”امی! ماہا اچھی لڑکی ہے منیب احمد کو شروع سے میں اچھا لگتا تھا اس لیے انہوں نے خود مجھ سے کہہ کر یہ رشتہ
کیا ہے۔“

”کیا بتا ماہا کی مرضی نہ ہو۔“ وہ پرسوج انداز میں گویا ہوئیں۔
”ایسا کچھ نہیں ہے اصل میں ماہا کالج میں لیکچرار شپ کے لیے اپلائی کر چکی ہے میں اسے منع کر رہا ہوں
اسی لیے شاید وہ اداس ہو رہی ہے۔“ شہزہیل نے اپنے طور پر انہیں اپنی طرف سے اخذ کر کے انہیں مطمئن کرنا
چاہا۔

”مجھے اس لیے فکر ہو رہی ہے کہ کہیں ہم سے اس بچی کے ساتھ کچھ غلط نہ ہو جائے، ویسے اس گھرانے کے
ہم پر بہت احسان ہیں۔ انہوں نے ہمیں پالا اور اس قابل بنا دیا ہے کہ ہمارا سر بھی فخر سے اونچا رہے۔ شکر ہے
اس پاک ذات کا جو تم غلط باتوں میں نہیں گئے بلکہ باعزت گھرانے میں گئے اور انہوں نے تمہارا اتنا خیال کیا
اور اس بچی ماہا نے ہمارا پتا بھی ڈھونڈ نکالا میں تو اس کی بہت احسان مند ہوں۔“ وہ تو منیب احمد کی پوری جیلی کو
دعا دیتے نہیں تھکتی تھیں۔

”اچھا آپ اس وقت تو لن باتوں کو چھوڑیں۔“ شہزہیل نے والا ہے ابو کے چیک اپ کے لیے۔“ اس نے
نوید احمد کے ہاتھ بیروں کو دبا کر شروع کر دیا تھا۔
”بس بیٹا بس کر تم تو ہر وقت میری خدمت میں لگے رہتے ہو۔“ نوید احمد نے پیار بھرے لہجے میں کہہ کر
اس کے ہاتھ تھامے۔

”میرا وہ وقت تو میری ناکبھی میں برباد ہوا نہ آپ سے ناراض ہو کے جانا اور پتا نہ وقت آج سے دور
ہوتا۔“ اسے افسوس ہوتا تھا۔

”جو اللہ چاہتا ہے وہ کرتا ہے پھر بھی اس نے بہت اچھے حوالوں میں رکھا ہوا تھا۔ میری بچی رخصتہ نے
تمہاری ذمہ داری سنبھالی ہوئی تھی بہت صابر و شاکر بنی ہے۔“ وہ رخصتہ کو بھی دعائیں دیتے رہتے تھے۔
”ماں اب اس نے بہت کم عمری میں ذمہ داریاں سنبھالی ہیں اب میری کوشش ہے میرے بہن بھائیوں کو
خوشیاں ملیں۔“ اس نے کہا۔

”گہمت کی آنکھوں میں نمی آگئی تھی کتنی پرسکون ہو گئی تھیں شہزہیل کے آنے سے ورنہ ان کی راتوں کی نیندیں
اڑ گئی تھیں۔“

”السلام علیکم!“ شہزہیل کا زوردار سلام ان سب کو اپنی جانب متوجہ کر گیا۔
”علیکم السلام! تمہارا ہی انتظار تھا۔“ شہزہیل کھڑا ہو گیا، بلیو پینٹ پر کیس ٹی شرٹ میں ملبوس مسکرا رہا تھا۔
اس کے ساتھ فریو تھراپسٹ بھی تھا۔
وہ نوید احمد کا چیک اپ کرنے لگا تھا فریو تھراپسٹ ان کی فریو تھراپی کرانے لگا۔

”جس روم کی سیٹنگ ماہا بھابی سے کروائی تھی اس کی سیٹنگ آپ دونوں نے کر دی۔“ اسجد کا اشارہ شہزہ
کے پیڈروم کی طرف تھا۔

”بھائی جان نے ہم سے کہا تو کر دی۔“ شہزہ نے کہا۔
”یو لیے ماہا بھابی کو بلا لیں۔“

”ارے چھوڑو تم سب کچھ خود کرو تو بہتر ہے۔“ شہزہیل نے منع کیا پھر ماہا غصے کے باعث آنے پر کبھی بھی
راضی نہیں ہوگی۔

”میں ابو کو دیکھتا ہوں آج ان کا مکمل چیک اپ ہونا ہے۔ فریو تھراپسٹ بھی آنے والا ہوگا۔“ یکدم ہی شہزہیل
کو یاد آیا وہ کھڑا ہو گیا۔

وہ دونوں بھی سر ہلاتے ہوئے اس کے ساتھ ہی چلے آئے۔
”ابو آپ ریڈی ہو جائیں شہزہیل نے والا ہوگا۔“ اس نے نوید احمد سے کہا۔

وہ سیدھے ہو کے بیٹھ گئے تھے۔
رخصتہ، شہزہیل کے نام پر فون ہونے لگی وہ ابو کے لیے گرم گرم دودھ لے کے آئی تھی جو انہیں دوائی کے ساتھ
لینا ہوتا ہے۔

”رخصتہ تم ناشتے وغیرہ کا انتظام کر لینا شہزہیل سے ہی چلا جاتا ہے۔“ گہمت نے ساتھ ہی اسے ہدایت بھی
دی۔

”امی ایک ماسی بھی رکھ لیں تاکہ کچھ کام وہ کر لے گی۔“ شہزہیل نے کہا۔
”اے بیٹا! ہمیں شروع سے کام کرنے کی عادت سے ماسی کا کیا کرنا ہے۔“ انہوں نے سہولت سے منع
کیا۔ شہزہیل نے ان کی سادگی پر مسکرا کے دیکھا۔

”رخصتہ کے رخصت ہونے کے بعد آپ اتنے کام اکیلی کہاں کر سکتی ہیں اور شہزہ کو میں نے کہہ دیا ہے وہ
اپنی پڑھائی پر توجہ دے۔“

”آپ کی شادی سے پہلے میں رخصت نہیں ہوں گی۔“ رخصتہ نے ذرا شرمیلی لہجہ میں کہا۔
شہزہیل مسکراتے لگا کیونکہ وہ منہ بھی بسورے ہوئے تھی۔

”رخصتہ بیگم نے تو اسی سال میں کہا میں بھی چاہتی ہوں۔“ وہ یہ کہہ کر روم سے نکل گئیں۔
”شہزہیل پھر تو مشکل ہوگا بشری بھابی نے ہم سے تو سال دو سال کا وقت لیا ہے۔“ گہمت تو فکر میں مبتلا ہو
گئیں۔ شہزہیل یہ بھی جانتا تھا سال دو سال کا وقت بھی ماہا کے موڈ پر لیا ہے وہ اتنی جلدی تو راضی نہیں ہوگی اور یہ
سب کچھ شہزہیل کو ہی سہہ سہارنا ہوگا۔ ماہا کی بدگمانی دور کرنی ہے اور اپنی بہن کی خوشی کا بھی خیال تھا۔

”آپ پریشان کیوں ہو رہی ہیں؟“ اس نے گہمت کو دیکھا جن کے چہرے پر فکروں اور سوچوں کے جال
کچھ گئے تھے۔

”پریشانی کی بات تو ہے۔“
”گہمت! تم تو ہر بات کا مسئلہ بنالیتی ہو سہولت سے کسی وقت منیب احمد سے بات کر لیں گے ہم۔“ نوید احمد
بھی گویا ہوئے۔

”مجھے تو ایسا لگ رہا ہے ماہا اس رشتے سے خوش نہیں ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں ہم سے بات تک نہیں کر رہی
ہے۔“

”انکل! ماشاء اللہ! بالکل سیٹ ہو گئے ہیں۔“ شہبیر نے ان کا چیک اپ کرنے کے بعد کہا۔
 ”بس بیٹا اللہ کے بعد تو تم نے مدد کی ہے۔“ گنجمت گویا ہوئیں۔
 ”شکر ہے اللہ کا۔“ شہبیر نے سر ہلایا۔

شمرہ ٹرنے میں لوازمات لے آئی تھی شہیر نے خفگی سے دیکھا۔
 ”یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔“

”وہ کیا ہے بہنوئی بننے والے ہو خاطر مدارات تو فرض ہے ہمارا۔“ شہریل نے شوقی سے کہا۔
شہیر جھینپ گیا تھا۔

”گھر میں سب خیریت ہے۔“
”جی آئی۔“ اس نے مودب انداز میں کہا۔

”امی آنے کا کہہ رہی تھیں۔“
”اچھا ہے بہت خوش ہو گئی۔“ نگہت بولیں۔

نوید احمد کی فریاد توہر اپنی کھل ہوئی تو وہ لڑکا چلا گیا۔ شہزیل اور شہیر ہلکی پھلکی گفتگو بھی کرتے رہے اور چائے بھی چلاتی رہی۔

شہیر کی نگاہوں نے رمضہ کو ڈھونڈا: بھی وہ لگتا تھا کسی کونے میں چھپ گئی تھی۔

”یار! وہ ماہانے تو گھر میں ادھم مچا دیا ہے“ سہیل نے بتایا۔

”وہ لڑکا بنگامہ ہے، مجھے تو تمہاری فکر ہو رہی ہے۔“

شوخی و شرارتی لہجے میں اسے چھیڑ رہا تھا۔
شہزاد نے جھنجھٹا گیا۔

”میری بہن بہت سمجھ

”ہوں۔“ شہیر مکرانے لگا۔

”تم فکر نہ کرو بہت قریب سے عزت سے رکھو اگلا“ اس نے نشتر مل کر

رمضہ نے بھی سنا تھا مگر جھٹ وہ لاؤنچ میں چلی گئی کہیں جاتے ہوئے شہیر کی نگاہ نہ پڑ جا

باہر تک چھوڑنے جا رہا تھا اور وہ کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ کتنی خوش تھی جو اتنی عزت کرنے والا اس کی زندگی میں شامل ہو رہا تھا۔

☆.....☆

نیل فروتو جب ہوگئی تھی۔ ضیاء بھی سامنے نہیں پڑ رہا تھا اس کی ہمت بھی نہیں پڑ رہی تھی شریا سے ہی ضیاء کے سلسلے میں ڈسکس ٹکرے وہ زبردستی درشہوار کو اس کے سر نہیں منڈھے درشہوار نے بہت لمبی لمحے لیج کر کہا تھا وہ یہ قصہ

ختم کروائے۔

وہ شریا کے روم کے باہر کھڑی دستک دے رہی تھی اس کا بھی چہرہ سستا ہوا اور ہاتھ۔

اُارے مل فرمنا نال کیوں کر رہی هوا جاو۔ ریا لے اسے دیلھا لو پیا ر ہرے بچے مل لہہ راسے اندر بلایا۔

رداؤں کی جستجو 204 جولائی 2018ء

ری ہونڈنگ

دورانی سے میت لیے بچاتے!

بانی

بیا در تصویرت اور حسین الہ

ایکسپریٹ
دلچسپ

مکمل

Filmstar

Sana

پاکستان میں پہلی بار روز بیونی پارلر پیش کرتا ہے کورین میڈیکینٹا لوجی کا شاہکار

اوکسیجن گولڈ فیشل

او کیسین گولڈ فیش ملے گا ایک ہنگوڑا کیسین ملے گا اور ایک ہنگوڑا کیسین ملے گا

اس کے ساتھ ہی ملک کے دارنیاپ کی طرف سے تحریک کرتا ہے۔
سورج کی تیز روشنی کے باعث پیدا ہونے والے گرمیوں کے

اپنی جگہ کو دور اور فریضہ اور چاند کے لئے کیلئے اوکسیجن گولڈ فیشل کرایئے۔

A-573 گلشن اقبال 34809011-34173921 A-570 گلشن اقبال 34977970-34977972

35833929-35833930 36636824-36636825 36707479-36623234

www.roseparlour.com | facebook.com/Rosebeautyparlour

روز بیونی پائر



روحانی ڈرامہ

ملک جواد نواز کی ڈائری سے

ایک خوب صورت نظم

آج کے دن

میری بھی ایک خواہش تھی

کبھی سب کی طرح

خوشیوں میں گھرا ہوں

تم کو اپنے پاس نہ پا کر

میری ایک اور خواہش نے

دم توڑ دیا!

یوں

آج کا دن بھی یادگار رہا

خوشیوں کا دن بھی سوگوار رہا

ثوابیہ جواد کی ڈائری سے

نوشی گیلانی کی نظم

خلش!

کبھی بھی دل یہ چاہتا ہے

تمہاری شاموں کا حال پوچھوں

سوال پوچھوں

کہ فکر فرا میں کیسی گزری

یونہی بھی میرا نام آیا

تمہارے ہونٹوں پہ ایک پل کو

میری محبت کی یاد بھی

بھی تمہارے بھی راستوں میں

کبھی کسی دن تمہاری صبح کے در پہ جاگی

صدائے دستک

کبھی عبادت کی کیفیت میں

تمہیں میرا بھی گمان گزرا

تمہارے سخن دعا سے میرا بھی دھیان گزرا

کبھی تمہارے بدن پر بھی

شب عذاب بن کر ٹھہر گئی تھی

کبھی کبھی دل یہ چاہتا ہے سوال پوچھوں

مگر میں چپ ہوں

ہمارے مابین یہ جو دیوار اجنبیت ہے یہ قیمت

اسی میں تو قیر صرف دلب ہے

میں پہ ترک و طلب کی حد ہے

حناعلیٰ کی ڈائری سے

ایک خوب صورت نظم

چند دن پہلے کی بات ہے

تم مجھ سے بڑی قربت کی

بڑی باتیں کیا کرتی تھیں

اور.....

جب تک مجھ سے بات نہیں ہوتی تھی

اور آج تم

میری محبت ہو

اور کس قدر دور ہو گئیں

سوچ رہی ہوں

نگاہ اس کی چمکی ہوئی تھی۔

”کیا ہوا تمہاری آنکھیں اتنی سوچھی ہوئی کیوں ہیں۔“ ان کا اتنا کہنا تھا۔

نیل نے چپکوں پہلوں رونا شروع کر دیا وہ تو اور ہی گھبرا گئیں، ابھی ٹکیل احمد بھی گھر میں ہی تھے وہ آ

سے ابھی آئے تھے۔

”نیل فرمیرے بیٹے کیا ہوا ہے۔“ ٹکیل احمد نے تولیہ بیڈ پر ڈالا اور اس کے پاس آگئے۔

”شیا بھی پرسوجھیں آکر یہ اچانک سے اتنا روکیوں رہی ہے۔“

”امی، امی۔“ وہ اپنے رونے کو کنٹرول کر رہی تھی۔

”کیا ہوا ہے کیوں اتنا رو رہی ہو۔“ ٹکیل احمد کی تو دنیا تھی وہ رو رہی تھی اور ان کا دل ڈوب رہا تھا۔

پہلے اس کے آنسو پونچھے اسے ریلیکس کیا تا کہ پھر وہ اپنی کہہ سکے۔

”جلدی بتاؤ کیوں روئی میری بیٹی۔“ شیانے اس کے بالوں کو مینا۔

”امی! آپ نے ضیاء بھائی کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ آپ نے در شہوار کے ساتھ رشتے کی بات کر کے ٹھیک

نہیں کیا۔ ضیاء بھائی کے بھی کچھ خواب ہوں گے اور پھر در شہوار بھی راضی نہیں ہے وہ کہہ رہی ہے ایسا کوئی فیصلہ

زبردستی نہ کریں جو سوائے پریشانی کے کچھ نہیں۔“

ٹکیل احمد اور شیا ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

”میں نے ایسا کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے جو مینا سب لگا وہ کیا ہے۔ میں نے ضیاء سے پہلے پوچھا تھا۔“ انہوں

نے اسے اطمینان دلایا۔

”اس کی رضامندی سے ہی میں نے یہ سب کیا ہے۔“

”لیکن امی! مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے ضیاء بھائی کو یہ سب اچھا نہیں لگا۔“ اسے حیرانگی بھی تھی۔

”ارے تم نے اپنے بھائی سے پہلے پوچھنا تھا خواہ اتنی پریشان ہو۔“ ٹکیل احمد مسکرائے اور پھر

خود ہی ضیاء کو بلانے چلے گئے۔

”وہ تو ایسا لگ رہا ہے ناراض ہیں۔“

”میں نے اس کی خوب کھینچائی کی ہے اس کے ایک سیل کے گرنے پر تم نے در شہوار کو اتنا فحاش کر دیا کہ

کبھی ہوگی ہم اسے گرا ہوا سمجھتے ہیں۔ تم نے دیکھا نہیں زبیدہ ایک دم سے السردہ اور شرمندہ بنی کیسی ہو گئی تھیں

اور خود کو کم حیثیت کہنے لگیں یہاں اس گھر میں ملازموں تک کو تم تر اور گرا ہوا نہیں سمجھتے اور زبیدہ تو تمہارے ابو کی

منہ بولی بہن ہیں انہیں ایسا سمجھ کے ہم گناہ گار ہوں گے۔“ نیل فران کی باتوں کے سحر میں کھو کے انہیں سکے

جاری تھی۔

”آپ تو میری سوچوں سے بھی زیادہ بہت اچھی ہیں۔ مجھے فخر ہے مجھے پیار و محبت بانٹنے والی اور حساس

دلوں کا خیال کرنے والی ماں ملی ہے آئی لو پوا۔“ وہ بے اختیار ان کے گلے سے لگ گئی۔

”بے وقوف لڑکی رو رو کے تم نے تو اپنی خوب صورت آنکھوں کا حشر کر لیا ہے۔“ انہوں نے اپنے آنچل

کہ بعض لوگوں کو
محبت راس نہیں آتی

صباحی کی ڈائری سے

وصی شاہ کی نظم

آج وہ مدت بعد آئی تھی

بس یہ کہنے
جانا!

میرے سارے خط لوٹا دو
سب تصویریں قلم کتا ہیں
واپس کر دو سارے تجھے
مجھ سے سب کچھ مانگنے والی
جاتے جاتے
میرے کمرے کی چوکھٹ پر
چھوڑ گئی
اپنا آپ

صباحی کی ڈائری سے

وصی شاہ کی نظم

ابھی تو آنکھ کی مشعل
مجھے رستہ دکھاتی ہے
ابھی تو آئینہ چہرہ دکھاتا ہے
سراب ہی سہی جاناں!
یہ رستہ پیر کے نیچے
ابھی تو آس لکھتا ہے
ابھی ہے وقت مٹھی میں
اگر چہ ریت کی مانند
پھسلتا جا رہا ہے پر
تمہارے لوٹ آنے تک
سنجاولوں گا کوئی لمحہ
یہ سارا وقت گرنے سے

میرے ہاتھوں سے بننے سے
ذرا اک لمحہ پہلے تک
اگر تم لوٹ آؤ تو
اگر تم لوٹ آؤ تو میری تکمیل ہو جائے

تبسم فیاض کی ڈائری سے

ایک خوب صورت نظم

ماہوسیوں کے سائے میں
امید کا دیا جلانے رکھنا
دکھوں کے سارے موسم میں
مسکراہٹیں سجائے رکھنا
سب چھوڑ دیں ساتھ جب
خدا سے آس لگائے رکھنا
رشتوں کی پچی ڈور میں
تعلق دل ملائے رکھنا
چاہتوں کی نافروری میں
جذبوں کو اپنے سلائے رکھنا
ظلم و جبر کے طوفاں میں
آواز حق اٹھائے رکھنا
مسر توں کے حسین لحوں کو
چار سو پھیلانے رکھنا
کانٹے ہوں جب اطراف میں
دامن کو اپنے بجائے رکھنا
پھول بن کے خوشبو سے
چمن اپنا مہکائے رکھنا
نفرتوں کے اندھیرے میں
محبت کی کرن چمکائے رکھنا
جہاں الجھنیں ہی الجھنیں ہوں
وہاں ذہن اپنا سلجھائے رکھنا
تبسم سجائے لبوں پہ
لوگوں کے غم بھلائے رکھنا

☆.....

نورین ملک

الشجار

نوشین مدثر ————— لاہور
سانے اس کے بدل جاتے ہیں
لفظ سارے ہیں منافق میرے
عاشہ نور ————— کراچی
یہ اب کا نہیں بہت رانا قصہ ہے
محبت ہر کسی نے کی نبھائی کسی نے نہیں
ثناء حیات ————— کراچی
یونہی اداس ہے دل بے قرار تھوڑی ہے
مجھے کسی کا کوئی انتظار تھوڑی ہے
نظر ملا کے بھی ان سے گلہ کروں کیسے
ان کے دل پر میرا اختیار تھوڑی ہے
ماہ نور ————— فیصل آباد
بہت مسکرائے بہت روئے ہیں
غم اکٹھے ہیں یوں ہی نہیں کھوئے ہیں
ریما نور ————— کراچی
غم صم آنگن چپے آنگن عکس سے خالی
اب کے برس ہوا رہے گی کچھ لوگ تو گھر نہیں آئے
روزانہ سوئی راہوں پر آس کا جال بچھا کر
کوئلے سے پچی دیوار پر ایک لکیر بڑھائے
صائمہ ناز ————— سیالکوٹ
ہم نے تو خیر تجھ سے شکایت کبھی نہ کی
ایسا نہیں کہ دل نے بغاوت کبھی نہ کی
کس حال میں ہیں تیرے ستائے ہوئے غریب
تو نے یہ پوچھنے کی رحمت کبھی نہ کی

ایم جے قریشی ————— ڈی آئی خان
کیا گزرتی ہے قیامت اس دل سے پوچھنا
دور ہو جس کا محبوب عید کے دنوں میں
اسماء جمشید ————— ڈی آئی خان
تہائی میرا مقدر ہے کسی پہ کیا دوش
جس جس کا صنم ساتھ اسے عید مبارک
سیمانا ص ————— ڈی آئی خان
تم نہ آئے تو ہم کے مناس عید کی خوشیاں
گزرے گا عید کا دن بھی رو کر بھی سو کر
آمنہ ————— ڈی آئی خان
اے حسرتوں میں ڈوبی عید الوداع
زندگی رہی تو پھر دیکھیں گے تیرے عروج کا موسم
حناعلیٰ ————— ملتان
جس کا حق ہے اسے ضرور سونپ دیتے ہیں
بچا کے کچھ بھی تو ہم رائیگاں نہیں رکھتے
جو نیکی کرتے ہیں دریا میں ڈال دیتے ہیں
بھی حساب غم دوستان نہیں رکھتے
امیر بن حیدر ————— اسلام آباد
مانگنے کا جب ہنر آجائے گا
پھر دعا میں بھی اثر آجائے گا
کون دے گا اس کو اتنی چاہتیں
دیکھنا وہ لوٹ کر آجائے گا
عانیہ نیازی ————— ریلوہ
یہ واجبات شوق عشق کیا ہم ہی پر قرض تھے
وہ بھی اتارتا یہ مصیبت اسے بھی تھی

اس ماہ میں

اس ماہ کا اقتباس

رشتوں کی حقیقت

زندگی میں کبھی نہ کبھی ہم اس مقام پر آ جاتے ہیں جہاں سارے رشتے ختم ہو جاتے ہیں، جہاں صرف ہم ہوتے ہیں اور اللہ ہوتا ہے کوئی ماں باپ بہن بھائی کوئی دوست نہیں ہوتا۔ پھر ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہمارے بالوں کے نیچے زمین ہے اور سر پر آسمان بس صرف ایک اللہ ہے جو ہمیں اس خلاء میں تھامے ہوئے ہے پھر ہوتا چلتا ہے کہ ہم زمین پر پڑی مٹی کے ڈھیر میں ایک ذرہ سا درخت میں لگے ہوئے ایک پتے سے لگا ہوا وقت نہیں رکھتے اور پتا چلتا ہے کہ ہمارے ہونے یا نہ ہونے سے صرف ہمیں فرق پڑتا ہے۔

بانو قدسیہ (بیرکامل)
عاشیہ نیازی۔ ربوہ

اس ماہ کے اقوال

☆ بدتمیز ہونا بد مزاج ہونے سے زیادہ خطرناک ہے۔
☆ جس نے بن مانگے عطا کیا وہ مانگنے پر کیوں مایوس کرے گا۔
☆ کوشش بامقصد ہونی چاہیے ایسی کوشش کہ زندگی بھی آسان ہو اور موت بھی آسان ہو۔

☆ عم اور پریشانی دراصل انسانی فیصلے اور اللہ کے حکم کے درمیان فرق کا نام ہے۔

☆ اگر صرف عبادت اللہ کے تقرب کا ذریعہ ہوتی تو انسان پر زندگی کے دیگر فرائض عائد نہ کیے جاتے۔

☆ اللہ تعالیٰ جس پر راضی ہوتا ہے اس کی آنکھ کو پر غم کر دیتا ہے۔

☆ زندگی گزارنے کے لیے عقل نہیں محبت درکار ہے۔

☆ لاحد ودأر ذویں محدود زندگی کو عذاب بنا دیتی ہیں۔

☆ محبت بدلے میں محبت چاہتی ہے نہ کہ بھائی۔

☆ اگر طرف نہ ہو تو عطا انسان کو مغرور بنا دیتی ہے۔

☆ لوگ دوست کو چھوڑ دیتے ہیں بحث کو نہیں چھوڑتے۔

☆ اچھے الفاظ پر کچھ خرچ نہیں ہوتا لیکن اچھے الفاظ سے بہت کچھ حاصل ہوتا ہے۔

☆ محبت کے بغیر ادب بھی خطرناک ہوتا ہے۔

☆ مرنے والا اس وقت مرتا ہے جب اسے یاد کرنے والا مرجائے۔

حناعلی۔ ملتان

شمالہ نعیم گجرات
دل سے آغاز کیا جاں کے زیاں تک کھیلے بازی عشق کو ہم دیکھ کہاں تک کھیلے ہار اور جیت کے معیار بدلنے ہوں گے ایک سے کھیل کو اب کوئی کہاں تک کھیلے ارم سر فراز کراچی
کچھ دھڑکتا تو ہے پہلو میں میرے رہ رہ کر اب خدا جانے تیری یاد ہے یا میرا دل حنا معظم کراچی
کسی کی گفتگو اور خامشی میں کھو گئے ہیں کہ ہم اس لمحہ موجود ہی میں کھو گئے ہیں بہت دنوں بعد اتنے زور سے دھڑکا ہے دل بہت دن بعد اک خوش قاصدی میں کھو گئے ہیں ناہد محمود لاہور

وہ نہ تھا ترک تعلق یہ پشیمان تو پھر تم کو بھی چاہیے یہ تھا کہ مگر جانا تھا عشق میں سوچ سمجھ کر نہیں چلتے سائیں جس طرف اس نے بلایا تھا ادھر جانا تھا ربیعہ علی پنڈی
اس کو یاد رکھا ہے جسے دل سے بھلانا تھا دل بھی کیا چیز ہے کہ اپنے بس میں نہیں رابعہ منیر سرگودھا
مجھے تھا نہ غم مگر میں بکھر گیا محسن وہ ریزہ ریزہ تھا اور اپنے اختیار میں تھا نگہت توقیر چیچہ وطنی

وہ بھی میں تھا کہ سراپا سخن یہ بھی میں ہوں کہ بولتا ہی نہیں شاہدہ عامر کراچی
اس کی وفا کے باوجود اس کو نہ پا کے بدگمان کتنے یقین بچھڑ گئے، کتنے گمان گزر گئے فاطمہ علی راولپنڈی

نہ تھیں اور کوئی بھی رنجش صرف عادتوں میں تضاد تھا کہ اسے پسند تھیں شوخیاں مجھے سادگی میں کمال تھا

عاصمہ رشید فیصل آباد
کبھی دیکھے ہیں خزاؤں میں جھلے ہوئے درخت ایسے ہوتے ہیں وفاؤں کو نبھانے والے امیہ پشاور
دل نہ چاہے تو ایک ساتھ بسر کیسے ہو لیکن اس بات کی اب اس کو خبر کیسے ہو ساتھ رہنے کی اذیت در و دیوار سے پوچھ دل نہ ملتے ہوں کینوں کے تو گھر کیسے ہو نورین نور کراچی
وقت کی رفتار جھنجھلا کے رو پڑے کبھی اس کو کھوئے تو کبھی پا کے رو پڑے کب تک کسی کے سوا میں سوئیں بیٹھ کر ہم خود کو کوئی بار یہ سمجھا کے رو پڑے مریم ناز لاہور

وہ نہ تھا ترک تعلق یہ پشیمان تو پھر تم کو بھی چاہیے یہ تھا کہ مگر جانا تھا عشق میں سوچ سمجھ کر نہیں چلتے سائیں جس طرف اس نے بلایا تھا ادھر جانا تھا ربیعہ علی پنڈی
اس کو یاد رکھا ہے جسے دل سے بھلانا تھا دل بھی کیا چیز ہے کہ اپنے بس میں نہیں رابعہ منیر سرگودھا
مجھے تھا نہ غم مگر میں بکھر گیا محسن وہ ریزہ ریزہ تھا اور اپنے اختیار میں تھا نگہت توقیر چیچہ وطنی
وہ بھی میں تھا کہ سراپا سخن یہ بھی میں ہوں کہ بولتا ہی نہیں شاہدہ عامر کراچی
اس کی وفا کے باوجود اس کو نہ پا کے بدگمان کتنے یقین بچھڑ گئے، کتنے گمان گزر گئے

اس ماہ کے فلسفے

☆ لوگ بے وجہ خاموش نہیں ہوتے پتا نہیں
کیا کچھ سہہ چکے ہوتے ہیں۔

☆ بہت سے لوگ خوفزدہ ہو جائیں اگر وہ آئینے میں اپنے چہرے کے ساتھ ساتھ اپنا کردار بھی دیکھ لیں۔

☆ وقت مٹی ڈال دیتا ہے یادوں پر، ماضی پر، آرزو پر، غلطیوں پر، چاہتوں پر، یہاں تک کہ رشتوں پر بھی۔

☆ کچھ لوگ قسمت کی طرح ہوتے ہیں جو دعاؤں سے ملتے ہیں اور کچھ لوگ دعا کی طرح ہوتے ہیں جو قسمت ہی بدل دیتے ہیں۔

☆ رشتوں کا نہ ہونا اتنا تکیف دہ نہیں جتنا
کہ رشتوں کے ہوتے ہوئے احساسِ کامرمان کا
امبرین حیدر۔ اسلام آباد

اس ماہ زندگی

زندگی خواہشات کا ایک متلاطم سمندر ہے۔
 حرص و ہوس کے ڈسے ہوئے لوگ اس میں
 ڈبکیاں کھاتے بالآخر ڈوب جاتے ہیں۔ صرف
 وہی لوگ تیر کر نکل سکتے ہیں جو قانع ہوں اور
 جنہوں نے اپنے باطن کو دنیا کی آلائشوں موہوم
 امیدوں اور ناپائیدار لوگوں سے پاک کر لیا ہو۔
 قانع شخص کی مثال سیپ (صدف) جیسی ہے
 جس میں ابرنسیاں کا صرف ایک قطرہ موجود ہوتا
 ہے مگر وہی قطرہ بالآخر موتی بنتا ہے اگر سیپ میں
 حرص میں اپنا منہ ایک قطرہ کے بعد دوسرے
 قطرے کے لیے کھولے رکھتی تو کوئی بھی قطرہ
 موتی نہ بن پاتا۔

فرزانہ شوکت۔ کراچی

اس ماہ کی حقیقت

﴿جب انسان اپنی وقعت کھودے تو اس کے لیے بہترین پناہ خاموشی ہے۔ وضاحت بھی سچا ثابت نہیں کر سکتی۔ ندامت کبھی نعم البدل نہیں ہو سکتی الفاظ بھی بھی انسان کو اس کا کھویا ہوا مقام واپس نہیں دلا سکتے ہاں خاموشی مزید تذکیل سے بچا لیتی ہے۔﴾

﴿ پتا ہے تکلیف کیا ہے؟ کسی کو چاہنا پھر اسے کھودینا اور خاموش ہو جانا۔

نورین نور۔ کراچی

اس ماہ کا قطعہ

کتنے بیٹے کئے ہیں ثار وطن
تب ہے زندہ یہ میرا ان کا وطن
حلف اٹھا کر نہ اس پر جو قائم رہا
کھو دیا اس نے خود اعتبار وطن
راکھنے یہ حسین تہذیب - رحیم یار خان

اس ماہ کا لطیفہ

شوہر: ”یہ کیسی دل بٹالی ہے؟ نہ نمک ہے نہ
مرچ۔ سارا دن تو تم موبائل پر بیٹھ گئی ہو کچھ
پتائی نہیں چلتا کہ تمہیں کیا ڈالنا ہے کیا نہیں۔“
بیوی یلک اٹھاتے ہوئے: ”پہلے تم اس
موبائل کو سائیڈ پر رکھ کر کھانے پر توجہ دو کب
سے دیکھ رہی ہوں تمہیں پانی میں ڈبو ڈبو کر روٹی
کھاتے ہوئے۔“

ماہ نور۔ فیصل آباد

س ماہ کی خواتین

☆ سادہ نظر آتی ہیں لیکن ان کی سادگی کے
پیچھے کئی روپ ہوتے ہیں۔

فرزانہ شوکت۔ کراچی

اس ماہ کے بہترین جملے

☆ جو چیز اللہ نہ دے، اسے انسانوں سے نہیں مانگنا چاہیے ورنہ انسان بڑا خوار ہوتا ہے۔

☆ اللہ کے ساتھ وابستہ ہونا زندگی ہے اور اس سے غافل ہونا موت ہے۔

☆ کچھ لوگ گلابوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کا نام لیتے ہی ہمارے ارد گرد خوشبو پھیل جاتی ہے۔

☆ رشتے جب اذیت کے سوا کچھ نہ دیں تو ان سے کنارہ کشی بہتر ہے۔ خواہ وقتی ہی سہی۔

☆ کسی کے خلق کا اندازہ نہ کرو جب تک کہ اسے غصے میں نہ دیکھ لو۔

فرحانہ۔ سرگودھا

اس ماہ کی مشرقی لڑکیاں

ہم مشرقی لڑکیاں بھی عجیب ہیں، شاید محبت ہمارے دل کا روگ نہیں، ہمارا خون و ضمیر شاید اس جذبے کے لیے موزوں نہیں۔ ہم محبت کر بھی لیں تو اسے بھانا مثل اور اڑا کر بھا لیں تو زندگی گزارنا مشکل۔ محبت میں ہونے والی وہ کچھ بھری لغزش، وہ ایک پل کی خود غرضی نہ ہیں جیسے دیتی ہے نہ مرنے دیتی ہے۔ پھر وہ محبت جو ہم نے بہت لڑکر اور دنیا سے لکر کے حاصل کی ہوئی ہے، ہمیں اپنا سب سے بڑا گناہ نظر آنے لگتا ہے۔ ایسا گناہ جس پر ہم اٹھتے بیٹھتے، سو تے جا گتے شرمندہ ہوتے ہیں۔ ہم محبت کے بغیر رہ سکتے ہیں لیکن خود سے وابستہ رشتوں کے بغیر زندگی گزار ہی نہیں سکتے۔

(وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر۔ فرخت اشتیاق)

شاہدہ عامر۔ کراچی

☆ خوب صورت نہیں ہوتیں مگر اپنی میٹھی زبان سے دل موہ لیتی ہیں۔

☆ نفاست پسند ہوتی ہیں جو لوگوں کے دل و دماغ پر چھا جاتی ہیں۔

☆ چالبرز ہوتی ہیں جو ہر وقت اپنی چالبرزی کے جال بنتی رہتی ہیں۔

☆ بے حد باتونی ہوتی ہیں، بعض دفعہ سن کر لوگ بیزار، بعض دفعہ باتیں سن کر دل خوش۔

☆ ایسی بھولی ہیں جن کے بغیر رہا نہیں جاسکتا۔
☆ مگر اکثر خواتین ایسی ہیں جن کے ساتھ

نہیں رہا جاسکتا۔
فرمانہ ہوکتا کراچی

اس ماہ کے آنسو! آنسو.....! محکمین مانی کا ایک قطرہ لیکن دل

کے سمندر کو ظاہر کرتا۔

کے موقع پر آنکھوں میں اٹھ آنے والے آنسو بنا کہے جذبوں کو آشکار کر دیتے ہیں۔ آنسو آنکھوں کی صفائی کرنے کے ساتھ ساتھ دل میں چھائے ہوئے غم کو ختم کرنے کا باعث بھی بنتے ہیں۔ آنسو کبھی کسی کی جدائی میں آتے ہیں تو کبھی اچانک ملن بھی اس برسات کا سبب بن جاتا ہے۔ بددعا کبھی زبان سے نہیں دی جاتی۔ وہ آنسو جو پلموں میں اٹکا رہ جاتا ہے، بذات خود ایک بددعا کی گزرگاہ بن جاتا ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی تو لگتا ہے کہ جیسے ہم آنسو بہا رہے ہوں تو سارا شہر ہمارے دکھ میں شریک ہے، بقول شاعر

اس دفعہ تو بارشیں رکتی نہیں ہیں دوستو
ہم نے کیا آنسو پے کہ سارے موسم رو پڑے

ایس امتیاز احمد - کراچی



حضور اکرمؐ نے فرمایا

جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے حاکم کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے حاکم کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔ (بخاری)

سب کے تلاش

حضرت مولیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دریافت کیا۔ ”یا اللہ! میں کون کونسا تلاش کروں؟“ اللہ نے فرمایا: ”شکستہ دلوں کے پاس“

انمول مولیٰ

☆ خوب صورتی علم و ادب سے ہوتی ہے لباس سے نہیں۔
☆ اگر انسان بننا چاہتے ہو تو ساری انسانیت کا احترام کرو۔

☆ دور سے آنے والی آواز بھی اندھیرے میں روشنی کا کام دیتی ہے۔

☆ تم صرف مصیبت اور ضررت کے وقت دعا میں مانگتے ہو کیا خوش حالی اور فراغت کے دنوں میں بھی تمہارے ہاتھ دعا کے لیے اٹھتے ہیں۔

☆ جب دل اور زبان ایک ہو کر کوئی چیز مانگتے ہیں تو اس دعا کا جواب ضرور ملتا ہے۔

نورین ملک۔ کراچی

عدل

ارسطو سے سکندر نے پوچھا۔ بادشاہوں کے لیے شجاعت اور عدل میں سے کون سی چیز افضل ہے؟ جواب دیا۔ عدل۔ اس وجہ سے کہ عدل کی موجودگی میں شجاعت کی ضرورت نہیں۔

تلاش

مسافر ایک ایسے ہوٹل کے استقبال پر پہنچا جسے تاریخی اہمیت حاصل تھی اس نے کلرک سے سنگل روم کا کرایہ پوچھا۔

”یہاں منزل پر پچاس اور دوسری پر چالیس اور تیسری منزل پر سنگل روم کا کرایہ بیس ڈالر ہے۔“ کلرک نے جواب دیا۔

مسافر چند لمحوں تک غور کرتا رہا پھر کلرک کا شکریہ ادا کر کے واپس جانے کے لیے مڑا تو کلرک پوچھے جانے لگا۔

”کیا آپ کو ہوٹل پسند نہیں آیا؟“
”نہیں ہوٹل تو بہت خوب صورت ہے مسافر نے جواب دیا لیکن زیادہ مہنگے نہیں ہیں۔“

تشویش

”ڈاکٹر صاحب میں ساری رات سردی سے کانپتا رہا۔“ مریض نے نقاہت سے کہا۔

ڈاکٹر نے تشویش سے پوچھا۔ ”کیا سردی سے دانت بھی بچ رہے تھے؟“

مریض۔ ”جناب مجھے اس بات کا علم نہیں۔“

ڈاکٹر حیرت سے۔ ”وہ کیوں؟“
مریض۔ ”کیوں کہ میں نے وہ نکال کر میز پر رکھ دیئے تھے۔“

مکان علی۔ لاہور

بچے کا روزہ

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بچے نے روزہ رکھ لیا۔ آدھا دن تو جیسے تیسے اس نے گزار لیا لیکن پھر بھوک پیاس کی تکلیف ناقابل برداشت ہو گئی اور اس نے اس خیال سے کہ اگر میں چکے سے کچھ کھا لوں تو کسے خبر ہوگی۔ روزہ توڑ دیا، پھر والوں کو واقعی علم نہ ہوا وہ شام میں بچے کے روزے کی اطلاع کی تیاری میں لگ گئے لیکن ظاہر ہے البتہ روڑے سے اس کا کچھ سروکار نہ رہا تھا۔

حضرت سعدی فرماتے ہیں کہ وہ ہوٹل والے بچے سے بڑھ کر نادان ہے جو دکھاوے کے لیے روزہ رکھتا ہے اور نمازیں پڑھتا ہے عبادت تو وہی ہے جو صرف اللہ پاک کی خوشنودی کے لیے کی جائے ایسی نماز تو الٹا دوزخ کی طرف دھکیل دے گی۔

ادا کرتا ہے جو سجدے رہا کاری کے دامن پر نہ ان سجدوں سے روشن ہوگی ہرگز تیری پیشانی فراہم کر کہیں سے دولت احساس سینے میں بس اخلاص کی حدت سے دل ہوتے ہیں نورانی

از حکایت سعدی
مہرین کنول۔ لیہ

لفظوں کی روشنی

☆ خیرات دینے سے آپ کی جائیداد کبھی کم نہیں ہوتی اس کے برعکس سخاوت اور اچھے اعمال

آپ کے مال کو ناپید ہونے سے بچاتے ہیں۔
☆ اپنے دلوں کو پاکیزہ اور بیکار کھوتا کہ ان کے اندر گندگی کا کوئی دھبہ نہ رہے۔

☆ اگر آپ اپنی خواہشات کو لگام نہیں ڈالتے تو مصیبت مثلاً بھوک، محنت مصیبتوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

☆ اگر تم اپنے سے زیادہ طاقت ور یا قابل کی نقل کرنے کی کوشش کرو گے تو زندگی کی شاہراہ پر بہت سارے مسائل میں الجھ جاؤ گے۔

☆ محفوظ رستہ اپنی صلاحیتوں کی پہچان سے ملتا ہے اگر تم بادشاہ ہو تو عام رعایا بن کر رہو، اگر تم ملاح نہیں ہو تو کشتی چلانے کی کوشش مت کرو۔

☆ ہر ناکامی کے دامن میں کامیابی کے پھول ہوتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ ہم کانٹوں میں الجھ کر نہ رہ جائیں۔

وفادار

تہذیب وطن سے وفادار نہیں ہے اس سے تو نہیں کوئی سروکار نہیں ہے سرگرمیاں مشکوک ہوں جس اہل وطن کی کس منہ سے کہیں ہم کہ وہ غدار نہیں ہے راؤ تہذیب حسین تہذیب۔ رحیم یار خان

غیبت

ہر اس شخص سے معافی مانگو جس کی غیبت کی ہو یہ بہت بڑا گناہ ہے کیونکہ غیبت کرنے والے کاٹ کاٹ کر جہنم میں ڈالے جائیں گے۔

سچی خوشی

سچی خوشی، جسمانی قوت اور دولت سے میسر نہیں آتی بلکہ اس کا راز سمجھ کی چٹنگی اور اعلیٰ کردار

فرانسیس کرکنا

پہلو میں کچھ دھڑکتا ہوا سا
محسوس ہوتا ہے
مگر رفتار مدہم ہے
گر تم حصہ ہو دنیا کا
نظر پھر کیوں نہیں آتے؟
میں کیسے خود کو سمجھاؤں؟
چلے جو جا بس ایک بار
وہ واپس پھر نہیں آتے
مگر یہ بھی حقیقت ہے
ہمیشہ یاد رہتے ہیں
خیالوں میں خوابوں میں
ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں

سیدہ عروج فاطمہ

غزل

زندگی میں کتنی کتنی کھانے کے لیے
آؤ ملیں پھر سے چمچ جانے کے لیے
تم خوش ہو میرے ساتھ جہاں ہے مجھے
مجھ سے بے رنجی برتے ہو زمانے کے لیے
آنکھ بند ہوئی اور ساتھ چھوٹ جاتا ہے
ملو مجھ سے ہمیشہ کا ساتھ نبھانے کے لیے
مسکراتے ہیں ہم تو فقط تمہاری خاطر
کبھی تم بھی مسکرا دو صرف ہمارے لیے
چمچڑے ہم کیوں تھے وضاحت تو کرو ذرا

سباس گل

نظم

معافی معذرت منت التجا
کوئی سنتا نہیں ہے خدا کے سوا
آنسوؤں سے بہتر موم ہوتا ہے
ایک آنسو ہے بخشے ہے میرا خدا
پیارا جاہت عجب وفا کیا ہوئے
اک لمحے میں تو ہو گیا بے وفا
اتنے برسوں جو میں نے محبت کری
اس محبت کا تو نے دیا یہ صلہ
اک بہانہ تجھے چاہیے تھا فقط
وہ بہانہ تجھے آخر مل گیا
تجھ کو وعدہ وفا کرنا آیا نہیں
بے وفائی کا تھنہ مجھے دے دیا
تجھ سے نہیں چاہتیں آج بھی ہمیں مگر
دکھ ہے تجھ پر بھروسہ کیوں میں نے کیا
اس کی ہر بات کو سچ ہی مانا تھا گل
اس کی ہر بات نے جھوٹا مجھ کو کیا

نظم

تمہارے بعد کچھ بھی نہیں بدلا
ستارے اب بھی چمکتے ہیں
بدن میں جان باقی ہے
سب ہی کچھ پہلے جیسا ہے

یا گل سی لڑکی.....!

کدوہ عجب یا گل سی لڑکی ہے۔ مجھے ہر خط
میں لکھتی ہے کہ مجھے تم یاد کرتے ہو؟ تمہیں میں
یاد آتی ہوں؟ تمہیں میری باتیں ستاتی ہیں؟
میری نیندیں جگاتی ہیں؟ میری آنکھیں رلاتی
ہیں؟ دسمبر کی سنہری دھوپ میں اب بھی ٹپکتے
ہو؟ کسی خاموش راستے سے کوئی آواز آتی
ہے؟ ٹھٹھرتی سرد راتوں میں تم اب بھی چھت
پر جاتے ہو؟ فلک کے سب ستاروں کو میری
باتیں سناتے ہو؟ کتابوں سے تمہارے عشق
میں کوئی کی آئی یا میری یاد کی شدت سے
آنکھوں میں نمی آئی؟

جواباً میں اس سے کہتا ہوں کہ میری
مصروفیت دیکھو، صبح سے شام آفس میں چراغ
عزیز ہے، پھر اس کے بعد دنیا کی کئی مجبوریوں
پاؤں میں سڑی ڈالے رکھتی ہیں۔ مجھے بے فکر
چاہت ہے مجھے سپنے نہیں دیکھتے۔ ٹپکتے،
جاگنے اور سونے کی مہلت ہی نہیں ملتی۔
ستاروں سے ملے عرصہ ہوا، شاید وہ ناراض
ہوں۔ کتابوں سے میرا شغف ابھی بھی ویسا ہی
قائم ہے، فرق اتنا پڑا ہے کہ اب انہیں عرصہ
میں پڑھتا ہوں۔ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں
تمہیں یاد کرتا ہوں؟ میں تو خود کو بھلانے اور
تمہیں یاد نہ آنے کی مسلسل جستجو میں ہوں مگر یہ
جستجو میری بہت ناکام رہتی ہے۔ میرے دن
رات میں اب بھی تمہاری شام رہتی ہے،
میرے لفظوں کی ہر مالا تمہارے نام رہتی ہے۔
اب اس امتیاز احمد۔ کراچی

☆.....☆

میں پوشیدہ ہے۔

شکرواحسان

کسی نے بوعلی سینا سے پوچھا: دن کیسے گزر
رہے ہیں؟
انہوں نے کہا۔ گناہ گار ہونے کے باوجود اللہ
کی نعمتیں مجھ پر برس رہی ہیں کچھ میں نہیں آتا کس
بات پر شکر ادا کروں۔ کثرت نعمت پر یا بے شمار
عیبوں پر چشم پوشی پر۔

ریمانو ررضوان۔ کراچی

☆ منہ سے ہمیشہ الفاظ نکال دیتا کہ دشمن کو
بھی دوست بنالو۔

☆ جو ذرا سی بات پر دوست نہ رہا وہ
دوست تھا ہی نہیں۔

☆ جس کو ایسے دوست کی تلاش ہو جس
میں کوئی خامی نہ ہو۔ اسے کبھی کوئی دوست نہیں
مل سکتا۔

☆ محبت کی دیوار میں شک کی دراڑ پڑ جائے
تو معذرت کے گارے سے بھر تو سکتی ہے مگر نشان
باقی رہتا ہے۔

☆ ہر مشکل انسان کی ہمت کا امتحان لیتی ہے۔

☆ گالی دینے والوں کو گالی سنی بھی
پڑتی ہے۔

☆ زیادہ قسمیں کھانے والا زیادہ جھوٹ
بولتا ہے۔

☆ عاقل وہ ہے جو اپنی عمر کو غیر ضروری
کاموں میں صرف نہ کرے۔

فرزانہ شوکت۔ کراچی

ہم بھی باتیں بتائیں تجھے تیری آگاہی کے لیے
ریما نور رضوان

غزل

خاک کی مانند اڑی زندگی ہماری
نمائے محبت چھوٹ گئی ہماری
کیوں ہر دعا ہمیشہ رہے ادھوری
غم ملال میں ڈوبی زندگی ہماری
خشک آنکھوں کی کہانی ہماری
خاموش لبوں سے زبانی ہماری
جو تم ہم کنار ہو تو عرض کریں
ترے چہرے میں کہانی ہماری
یہ تحریریں بھی امید ہیں ہماری
جو سوچ سکو حالت کرب ہماری
جو کیا عیاں زمانے میں اپنا انداز چاہی
تم چھو غفلت یا سادگی صدفی
لاریب کنوار

موسم خزاں

آئیے موسم خزاں
ہے جو بیمار
کمزور اور بے جاں
چل کے دیکھئے
ہیں چمن میں کتنے پتے
کہاں کہاں
اپنی ٹہنیوں سے گر گئے
ہے امید دے کر جائے گی
تو بہار کی
کہ پھر سے مسکرائے گی
فضا بہار کی

زر وہ وسمان

غزل

خیال کے جنگل میں چھپ گئی محبت
میں جاگتا رہا اور سو گئی محبت
لاکھوں محبت کی دیوی کو بجوئے رکھا ہم نے
صلہ اس کا یہ ملا کہ روٹھ گئی محبت
ساغر و مینا سے دل لگا لیا ہم نے
اور شراب کی بوتل میں ڈوب گئی محبت
کبھی اس کے دل کی دھڑکن ہوا کرتے تھے
پھر ہوا یہ کہ اس کے دل کے سینما سے اتر گئی محبت
سنا ہے اس کی پلکوں پر اتر آتی ہے نمی اکثر
لگتا ہے اس کے دل میں نہیں زندہ ہے اب بھی محبت
جب بھی بھی اسے میری یاد آتی ہوگی
ٹپک جاتی ہوگی اس کی بھی آنکھوں سے محبت
اکثر ساحل یہ وہ نام لکھتی تھی میرا
کہ ایک دن دلشکھ سروں میں بہہ گئی محبت
عاصر عزیز

غزل

ہم خطا پوشی محبت سے کنار کرتے
دل نہ دیتے واپس سے کنار کرتے
بچ لایا تھا اس سن تکبر ہم کو
ورنہ ہم تیری شریعت سے کنار کرتے
لوگ مجرم ہمیں سمجھیں گے معلوم نہ تھا
ہم ترے عشق میں ہجرت سے کنار کرتے
ساتھ دشمن کے بھی کے لوگ مرے غیر سہی
تم تو اپنے تھے بغاوت سے کنار کرتے
ہم ترے شہر کے لوگوں سے کہاں واقف تھے
جان لیتے تو شرافت سے کنار کرتے
جان لیتے کہ سبھی لوگ یہ پتھر کے ہیں
ہم محبت کی حکومت سے کنار کرتے

ہم اگر پیار کے انجام سے واقف ہوتے
ہم تہی دست سخاوت سے کنار کرتے
پھر بھی آتی نہ کمی تیرے کرم میں یارب!
ہم اگر تیری عبادت سے کنار کرتے
سب کے چہروں پر رزم جھوٹ کی سرخی تھی حکیم
کس طرح لوگ حقیقت سے کنار کرتے
حکیم خان حکیم

غزل

بس گیا میری آنکھ میں وہ خواب کی طرح
گزر رہی ہے ہر شب میری عذاب کی طرح
میرے سامنے سے وہ پھر لے گزرے آج
میں لفظ لفظ پڑھوں اسے کتاب کی طرح
میں کیسے اسے اپنے دل سے پھر بھلا دوں
میری جاہت کو گھیرے ہے وہ گرداب کی طرح
لحہ در لہجہ اس کے احساس کی خوشبو مہلک
برس جائے وہ میرے جیون پر حساب کی طرح
میں راہ وفا کے اس مقام پر ہوں جہاں جاوید
کانٹے بھی گلے آلتے ہیں پھر گلے گلاب کی طرح
محمد اسلم جاوید

تم

جن کی بوندوں سے مٹی مہکنے لگے
جن کے موسم میں دل چمکنے لگے
جن سے آئے فضاؤں میں ایک نئی تازگی
سارے عالم پر چھائے عجب سرخوشی
جن کے منوں پہ گیت پہ گلستاں
بارشوں کی قسم
تم وہ کچھ ہو جو بارشیں بھی نہیں

فرزانہ شوکت

بے وفا لوگ

اپنے شہر کے لوگوں کا

کیا بتلاؤں
حال تمہیں
ہنس کر ملتے ہیں
لیکن
دل کے اندر
بغض و حسد اور نفرت
یہ رکھتے ہیں
ایسے منافق لوگوں کو
تم بولو!
میں کیا لکھوں؟

فیضان احمد فیضی

غزل

جو فاصلہ تھا، مفلسی نے طے وہ کر لیا
فاقوں سے رشتہ موت کا جڑنا قریب تھا
نسخہ غربی دور جو کرنے کا لکھ سکے
اس ملک میں نہ کوئی بھی خطیب ایسا تھا
تم نے ڈھوا خون کا کھیلا جہاں جہاں
کوئی چمن تھا اسے نہ وہاں عندلیب تھا
آدھی صدی کے نشی کی جی خوشی کہاں
رسماً اسے منانا ہمارا نصیب تھا
ہر کوئی بے نیاز تھا، اپنے ہی آپ سے
اس شہر ہر کوئی کسی کا رقیب تھا
اشکوں کی منزلوں میں مسرت لبوں پہ تھی
وہ شخص دور قہر میں کیسا عجیب تھا
بیوی کے سامنے تو وہ ہکلاتا تھا مگر
لوگوں میں بااثر تھا مثالی خطیب تھا
اس نے اذیتوں کے سوا کیا دیا امتیاز
کل تک جو میرا بھائی تھا میرا حبیب تھا
ایس اتیاز احمد

☆

دوستوں کے لئے پیارے

شہداء حیات کے نام

سو بیٹ شہداء! تمہاری سنگینی کی نیوز سن کر بہت خوشی ہوئی۔ میری دعا ہے کہ تمہیں زندگی کی وہ تمام خوشیاں ملیں جن کی تمہیں خواہش اور تمنا ہے خوش رہو میری پیاری دوست۔

حسن علی۔ کراچی

قمر و شہداء اور شہداء آفتاب کے نام

ریحانہ آبی اور قمر و شہداء! آداب! میں آپ دونوں کی بہت بڑی مین فوٹ قمر و شہداء آبی کے ناولز میں رومانس کا ترکا اچھا لگتا ہے اور خاص کر ان کے ناولز کے ہیرو ہیروئن کی آنکھوں کے کلر بڑھ بڑھ کر خواہ مخواہ مابدولت بھی اب لوگوں کی آنکھوں کے کلر دیکھتے رہتے ہیں (ہا ہا ہا) اور ریحانہ آفتاب آبی کے ناول سے مجھے پتا چلا کہ دراصل محبت ہوتی کیا ہے؟ اکثر ناولز میں بار بار پڑھا تھا میں نے کہ عورت محبت سے زیادہ عزت چاہتی ہے مگر عریشان ولی کی محبت کے انداز دیکھ کر میں نے یہ جانا کہ دراصل کسی مرد کی سچی چاہت اور محبت ہوتی کیا ہے جو محبت عریشان ولی آنسو سے کرتا ہے۔ آنسو کے ساتھ ساتھ اس سے وابستہ رشتوں سے محبت کر کے ان کو مان دے کر اور کوئی بھی لڑکی زندگی کے سفر میں ایک ایسا ہی ہمسفر چاہتی ہے کہ جو اس سے اور اس سے وابستہ

رشتوں سے محبت اور عزت کرے۔ یہ بھانہ آبی آپ کے ناول کے عریشان ولی نے تو دل جیت لیا میرا کاش کہ ایسا ہی شہزادہ میرا ہو، آمین۔

علیہ نور۔ کراچی

ایک بے وفا کے نام
سنو! میں تم سے مخاطب ہوں تم جو کبھی میری دھڑکنوں کا عنوان ہوا کرتے تھے۔ میری صبح میری شام ہوا کرتے تھے، تمہارے ساتھ سے میں نے جانا تھا محبت ہوتی کیا ہے، میں جو ایک ٹوٹی بھری لڑکی تھی تم نے مجھے اندھیروں سے نکال کر روشنی کا عادی بنایا، مجھے ہنسنا سکھایا اور چپ میں تمہارے ساتھ اور پیار کی عادی ہو گئی تھی، میں اپنی زیست کا حاصل سمجھ چکی تو تم اچانک میرا ہاتھ جھٹک کر کسی اور سمت بڑھ گئے۔ تب مجھے بانو میرا آبی کی بات یاد آئی کہ ”مرد دریافت کا پرندہ ہوتا ہے“ تم نے واقعی یہی کیا میرے ساتھ کہ جب میں نے تم سے ملا تو تم مجھے بھول گئے اتنے دھوکے اتنے بھٹ بولے کہ میں لرز کر رہ گئی تم نے مجھے ڈپریشن میں ڈال دیا میرا رونا اور بلکنا تمہارے لیے اپنے معنی کو چکا تھا تم آگے بڑھ گئے اور مجھے تنہا کر گئے مجھے تم سے اس بے وفائی کی امید نہیں تھی مگر یاد رکھنا بقول اشفاق احمد! دھوکے میں بڑی طاقت ہے اسے اپنے مقام

سے بڑی محبت ہوتی ہے اور یہ لوٹ کر واپس اپنے مقام پر آتا ہے سو جو جوتم نے میرے ساتھ کیا تمہارے ساتھ بھی ہوگا۔

حناعلی۔ ملتان

تمام رائٹرز کے نام

ردا کی تمام رائٹرز کو میری جانب سے عید کی خوشیاں بہت بہت مبارک ہوئی، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ تمام رائٹرز ایسی ہزاروں عیدیں دیکھیں، آمین۔ اور زندگی کی تمام خوشیاں اور راحتیں آپ لوگوں کو نصیب ہوں آپ کی تحاریر کی وجہ سے ہماری زندگی میں بہت کچھ آیا اور بہت کچھ سیکھنے کو ملا ہے آپ سب بھت اچھی ہیں اور آپ کی تحاریر نے ہماری زندگی کو مہرگیا ہے۔ خوش رہیے آپ سب کی سب۔

نوشین مدر۔ لاہور

عائشہ و الفقار کے نام

مجھے عائشہ آبی آپ کا ناول ”چل اڑ جا“ ابھی تک یاد ہے اس کے کردار ڈائلاگ اور زندگی میں ایک ماں کا اسٹرگل اور زیرو سے عروج تک پہنچ جانا بہت ہی کمال تھا آپ کا ناول۔ آپ کا یہ ناول بھی اچھا جا رہا ہے۔ اف! مگر آپ کو پڑھنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ آپ کے کچھ ڈائلاگ تو ناولز کے اتنے سپر ہوتے ہیں کہ بے ساختہ دل کھچو جاتے ہیں خوش رہیے اور ایسے ہی ہمارے لیے لکھتی رہیے۔

صباحر۔ ہارون آباد

خالہ جانی کے نام

السلام علیکم خالہ جانی! آپ کو اور خالو جان کو عید کی مبارک باد کے ساتھ ساتھ عمرے کی

سعادت بہت بہت مبارک ہو۔ ہم سب آپ کے لیے بہت خوش ہیں اور اُمی تو بھر پور تیاریوں کے ساتھ آپ کو واپس ملنے کے لیے تیار ہیں اور ابو اور بھائی نے گرینڈ پارٹی پلان کی ہے جس میں پورے خاندان کو بلانے کا ارادہ ہے بس آپ لوگ جلد سے واپس آجائیں تو پھر مل کر خوشیاں منائیں گے اس خوب صورت سعادت کے حاصل ہونے کی۔

رابعہ منیر۔ سرگودھا

امیر حیدر کے نام

جب پہلی وہ نظری تھی

وہ پیار کا پہلا احساس جو تھا

مجھے وہ سناؤ کبھی

مجھے وہ سناؤ کبھی

کیسے بھانجے بھانجے یار کے قصے

وہ ہیں ڈیوار کے قصے

کہ بس وہ لمحے بناؤ

تمہاری ہنسی میں شیاں

اس کی آواز ہوتی تھی

کہ جب تم مسکراتی تھی

دل کی گلی آباد ہوتی تھی

پھر کیا ہوا ایسا کہ تم مجھ کو سناتی ہو

فقط اس کی جدائی کے

اس کی بے وفائی کے

قصے اس ہر جانی کہ سناتی ہو!!!

مریم فیاض۔ پٹنڈی



فرائیڈ چکن

گرین کڑا ہی

اجزاء	اجزاء
چکن ونگز	بکرے کا گوشت
کوکنگ آئل	نمک
لیموں کارس	لہسن کے جوے
مرچیں	ادریک
نمک	پیاز
گرم مصالحہ	ٹماٹر چوپ کیے ہوئے
لہسن اور ادریک کا پانی	ثابت کالی مرچ
اجوائن	سفید زیرہ
تل	ہری مرچیں
بریڈ کریمز	ہرا دھنیا
انڈے	سویا (باریک کٹا ہوا)
	دہی
	کوکنگ آئل
	آدھی پیالی
	آدھی پیالی

ترکیب: ونگز کو اچھی طرح دھو لیں تاکہ ان پر پر نہ لگے رہ جائیں۔ بعد ازاں تل، بریڈ کریمز اور انڈے کے علاوہ تمام مصالحہ جات لگا کر تقریباً دو سے اڑھائی گھنٹے تک فریج میں رکھ دیں۔ اچھی طرح میرینٹ ہو جائیں تو چولہے پر چڑھا کر کچھ دیر تک پکالیں۔ اس کے بعد اتار کر ٹھنڈا کر لیں اور ایک ایک کر کے انڈے میں ڈوبنے کے بعد بریڈ کریمز لگا کر رکھتی جائیں۔ آخر میں سب ونگز کے اوپر تل چھڑک دیں اور کڑا ہی میں ڈال کر فرانی کر لیں۔ مزیدار چکن ونگز تیار ہیں۔

ترکیب: ادریک، نمک، پیاز، کالی مرچ، زیرہ، ہرا دھنیا اور ہری مرچوں کو موٹا مولائیں۔ اس میں دہی اور نمک شامل کر لیں۔ اس مصالحے سے گوشت کو اچھی طرح میرینٹ کر لیں۔ دو سے تین گھنٹوں کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ کڑا ہی میں کوکنگ آئل کو دو سے تین منٹ گرم کریں اور مصالحہ ملا ہوا گوشت ڈال کر ڈھک دیں۔ شروع میں تین سے چار منٹ آنچ تیز رہیں۔ پھر درمیانی آنچ پر اتنی دیر پکائیں کہ گوشت اچھی طرح گل جائے۔ آنچ تیز کر کے اتنی دیر

بھونیں کہ آئل الگ ہو جائے۔ ٹماٹر اور سویا ڈال کر ہلکی آنچ پر ڈھک کر پانچ سے سات منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ نمک کڑا ہی کا مزہ دو بالا کرنے کے لیے آپ اسے گارلک بریڈ کے ساتھ پیش کریں۔

مچھلی کے تنکے

اجزاء

سرمنی مچھلی	ایک کلو (صاف کروا کے)
	چو کو ریکڑے کر والیں
لال مرچ گٹی ہوئی	ایک کھانے کا چمچ
لیموں	چار عدد
سویا ساس	دو کھانے کے چمچ
سفید سرکہ	دو کھانے کے چمچ
سفید زیرہ بھنا اور پسا ہوا	ایک چائے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	چار کھانے کے چمچ

ترکیب: مچھلی کو سرکہ لگا کر دس منٹ بعد دھو لیں۔ پھر سارے مصالحہ جات لیموں کے ذریعے لگا کر ایک سے ڈیڑھ گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پھر تیز پر لگا کر تینوں کو کولوں پر سینک لیں۔ جب سینک جائیں تو برش کے ذریعے ذرا سا تیل لگالیں اور گرم گرم ایل کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔ تیج پر سے اتارنے کے بعد لیموں کا رس دوبارہ ڈال دیں۔

کباب بریانی

اجزاء

گائے کا قیمہ	آدھا کلو
پسا ہوا گرم مصالحہ سفید زیرہ	ایک، ایک چائے کا چمچ
پسا ہوا لہسن اور ریک	ایک کھانے کا چمچ
پیاز (پسی ہوئی)	ایک عدد
پیاز (تلی ہوئی)	دو کھانے کے چمچ
خشخاش، بھجنے ہوئے پنے	دو دو چائے کے چمچ

پسی ہوئی لال مرچ نمک : ایک، ایک چائے کا چمچ
چاول (ایلے ہوئے) : آدھا کلو
مصالحے کے اجزاء :
پسی ہوئی لال مرچ، سفید زیرہ : ڈیڑھ ڈیڑھ چائے کا چمچ
دہی، پیاز (تلی ہوئی) : ایک، ایک پیالی
ناریل کا دودھ، ہرا دھنیا : دو کھانے کے چمچ
جاوڑی، جائفٹل، چھوٹی : پون پون چائے کا چمچ
الائیچی (پسی ہوئی)

زرے کا رنگ : ایک چنگی
ہری مرچیں (باریک کٹی ہوئی) : چار عدد
نمک : ایک چائے کا چمچ
تیل : آدھی پیالی

ترکیب: چوپر میں قیمہ، چکی اور تلی ہوئی پیاز، لہسن اور ریک ملا کر یکجان کر لیں۔ اس آمیزے کے چھوٹے چھوٹے کباب بنالیں۔ دہی میں تیل گرم کریں، اس میں پیاز، لہسن اور تھوڑا سا پانی ملا کر بھونیں۔ مسلسل چمچ چلائے ہوئے لال مرچ، دہی، جائفٹل، جاوڑی، الائیچی، پیاز، دھنیا، ناریل کا دودھ اور نمک ملائیں۔ ابال آئے لگے کباب تہہ کی طرح سے رکھ دیں۔ ایک دہی میں پون پیالی پانی، پون پیالی تیل، آدھا کلو چاول، کباب کا مصالحہ، ہرا دھنیا، ہری مرچیں، باقی چاول، زرے کا رنگ اور کیوڑے کی تہہ لگائیں اور دم پر رکھ دیں۔ اسے احتیاط سے ڈش میں نکالیں اور گرم گرم پیش کریں۔

دال گوشت

اجزاء

بکرے کی بوٹیاں	آدھا کلو
پنے کی دال (ایلی ہوئی)	ایک پیالی

سنگھار

لگانے یا کسی اور وجہ سے پیلے ہو گئے ہیں تو پانی کے ٹب میں ہلکا پلچ ڈال کر اس میں تھوڑی دیر تک پاؤں بھگوئیں۔ ناخنوں کا پیلا پن دور ہو جائے گا۔

☆ موسم گرما کے دوران آئی میک اپ رییمور ہمیشہ اپنے پرس میں رکھیں تاکہ یہ وقت ضرورت آنکھوں کا میک اپ صاف کر سکیں۔

☆ گرمی کے موسم میں زیادہ پسینہ آنے کے باعث چہرے کے مسامات کھل جاتے ہیں اور چہرے پر دانے اور مہاسے پیدا ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ لہذا دن میں کئی بار منہ دھوئیں اور وقتاً فوقتاً ٹھنڈے عرق گلاب کو چہرے پر چھپھپھائیں۔

نیم کے فوائد

☆ نیم کے بے شمار فوائد ہیں یہ ایک سستا اور آسانی سے حاصل کیے جانے والا قدرتی تحفہ ہے جس کے ذریعے کم قیمت میں با آسانی بے شمار فوائد اٹھائے جاسکتے ہیں۔ اس کا کوئی سائیڈ افیکٹ نہیں۔ چند اہم فوائد درج ذیل ہیں:

☆ خون صاف کرتا ہے۔ چہرے کے دانے، جھانیاں، کیل، مہاسے ختم کرتا ہے۔ جسم کے تمام انفیکشن میں مفید ہے۔ شوگر کنٹرول کرتا ہے۔ لی پی کنٹرول کرتا ہے۔ جسم سے یورک ایسڈ ختم کرتا ہے۔

☆ یورین کے ذریعے تمام فاسد مادوں کا اخراج کرتا ہے۔ بہترین ماؤتھ واش ہے۔

بیوتی ٹپس

☆ گرمی کے موسم میں اگر چند گھنٹے باہر گزارنا چاہتی ہیں تو گھر سے نکلنے سے پہلے بالوں میں تھوڑا سا لیموں کا عرق لگا لیں۔ اس سے آپ کے بال ریشمی اور خوب صورت نظر آئیں گے۔ مزید یہ کہ دھوپ کے برے اثرات سے بھی بہت حد تک محفوظ رہیں گے۔

☆ اگر زیادہ دیر باہر دھوپ میں گزارنے کے باعث آپ ”سن برن“ کا شکار ہو گئی ہیں تو متاثرہ جگہ پر ایلو ویرا کا عرق لگا لیں یا ایلو کوئی لوشن لگائیں جس میں ایلو ویرا شامل ہو اس سے بہت جلد صاف آرام آئے گا بلکہ جھلسی ہوئی جلد بھی ٹھیک ہو جائے گی۔

☆ گرمیوں کے موسم میں چونکہ خواتین باریک فیتوں والے سینڈل اور چپلیں پہنتی ہیں جن میں پاؤں زیادہ تر کھلے رہتے ہیں۔ لہذا اس موسم میں پیروں کی صفائی ستھرائی اور دیکھ بھال بہت ضروری ہے۔ گھر پر فٹ اسکرپ تیار کرنے کے لیے دانے دار نمک یا چینی اور زیتون کا تیل ملا لیں اور اسے نرمی کے ساتھ پیروں پر لگائیں۔ اس عمل سے آپ کے پیروں کی مردہ کھال آسانی سے اتر جائے گی اور وہ صاف ستھرے نظر آئیں گے۔

☆ اگر آپ کے پاؤں کے ناخن، نیل پالش

وارچر شائرساس : دو کھانے کے ٹم
کارن فلور (پانی میں گھلا ہوا) : دو کھانے کے ٹم
چلی گارلک ساس : چار کھانے کے ٹم
نمک : حسب ذائقہ
تیل : چار کھانے کے ٹم

ترکیب: مرغی، شملہ مرچ، گاجر، ہری پیاز، گوبھی، ہری مرچیں، ہرے دھننے اور لہسن کو چھوٹا، چھوٹا کاٹ لیں۔ دہی میں تیل گرم کر کے لہسن سنہری کریں۔ اس میں مرغی ملا کر پانچ منٹ تک پکا کر تمام سبزیاں شامل کر دیں۔ مزید پانچ منٹ پکانے کے بعد کالی مرچ، وارچر شائرساس، چلی گارلک ساس، پانی اور نمک ملا لیں۔ پانی اٹھنے لگے تو چھپ چلائے ہوئے کارن فلور ملا لیں اور آٹھ تیز کر کے اسے پانچ منٹ تک بھونیں اور ڈش میں نکال لیں۔

ہرے مصالحے کا راستہ

اجزاء :
دہی : ایک کٹھی
ہرا دھنیا : ایک کٹھی
پودینہ : ایک کٹھی
ہری مرچیں : چھ عدد
کڑھی پتے : چھ عدد
کوکونٹ پاؤڈر : دو کٹھی

ترکیب: تمام اجزاء کو اچھی طرح پیس لیں۔ پھینکے ہوئے دہی میں حسب ضرورت ہرے مصالحے کی چٹائی ڈال کر کس کریں، بقیہ چٹنی بوتل میں ڈال کر فریج میں رکھیں۔ ہرے مصالحے کا ذائقہ دار راستہ تیار ہے۔

پیاز (باریک کٹی ہوئی) : دو عدد
پہا ہوا لہسن اور ک : ایک کھانے کا چمچ
پسی ہوئی ہلدی : ایک کھانے کا چمچ
پسی ہوئی لال مرچ : ایک کھانے کا چمچ
پہا ہوا گرم مصالحہ : ایک کھانے کا چمچ
چٹنی اور پسی دار چینی : ایک چائے کا چمچ
لیموں کا رس : چار پیالی
نمک : حسب ذائقہ
تیل : ایک پیالی

پودینہ، ہری مرچیں، لیموں کا رس، اور ک چھڑکنے کے لیے
ترکیب: دہی میں بھیلان، 172، پیاز، لال مرچ، ہلدی، لہسن اور ک اور نمک ملا کر پکا لیں۔ پانی خشک ہو جائے تو اس میں دال اور باقی پانی شامل کر کے دال اور گوشت یکجان ہونے تک پکائیں۔ اس میں باقی اجزاء ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ مزید دال گوشت پودینہ، ہری مرچیں، لیموں کا رس اور اور ک ڈال کر پیش کریں۔

سبزی اور لہسن والی مرغی

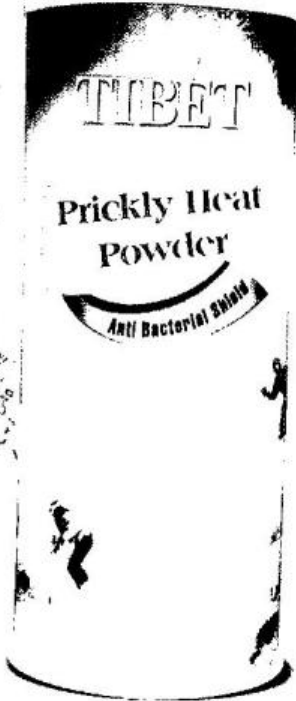
اجزاء :
مرغی کی بوٹیاں (بغیر ہڈی) : تین سو گرام
شملہ مرچ : ایک عدد
گاجر : ایک عدد
ہری پیاز : دو عدد
پانی : ایک پیالی
بند گوبھی : پون عدد
ہری مرچیں : چار عدد
ہرا دھنیا : پون گڈی
لہسن : بارہ جوے
کٹی ہوئی کالی مرچ : ایک کھانے کا چمچ

اب گرمی بھی ہوگئی ٹھنڈی...

تبت

پریکٹ بیٹ

پاؤڈر



تبت پریکٹ بیٹ پاؤڈر

گرمی دھڑوں... بہ نہات اور ٹنڈک کا خوشگوار احساس

TPHP/07.2K17

سے پہلے چہرے کو تمام قسم کے میک اپ سے پاک کر لینا چاہئے چہرے اور گردن پر انڈے کی سفیدی میں چائے کا چھوٹا ہی ایک چائے کا چھوٹا ملا کر چہرے اور گردن پر لگائیں۔ 1 5 منٹ کے بعد نیم گرم پانی سے چہرے اور گردن کو اچھی طرح دھو لیں چند دنوں میں جلد چمکدار ہو جائے گی۔

بالائی سے پاک دہی میں تھوڑا سا خیر ملا کر گالوں پر لگائیں چند منٹ بعد سادے پانی سے چہرے کو دھوئیں جلد سے دانوں کیل مہاسوں کا خاتمہ چند ہی دنوں میں ہو جائے گا۔

اگر آپ کے بالوں میں خشکی بڑھ گئی ہے تو آدھا پاؤ دہی میں ایک انڈا ملا کر بالوں پر لگائیں۔ اس کے بعد تیل سے اپنے بالوں کو لپیٹ لیں ایک گھنٹے کے بعد سر دھو لیں اس طرح سر میں خشکی کی شکایت بھی دور ہو جائے گی۔

دہی میں سے بالائی الگ کر کے اس میں ایک لیسن کا رس ملا کر چند گھنٹوں کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ آدھا تھوڑا تھوڑا اور ناخنوں پر لگائیں۔ تھوڑی دیر بعد ہاتھ دھو کر خشک کر لیں 2 ہفتے تک یہ عمل کرتے ہیں۔ اس طرح آپ کے ہاتھوں کی جلد نرم ملائم اور خوبصورت ہو جائے گی۔

اگر آپ چہرے کو جھریوں سے پاک رکھنا چاہتے ہیں تو ایک ٹی اسپون دہی میں ایک چھوٹا اسپون کیٹوں کا رس یا آدھے لیسن کا رس شامل کر کے چہرے پر 5 منٹ تک لگے رہنے دیں اس کے بعد نیم گرم پانی سے چہرے کو دھو لیں۔ لیسن اور کسی دوسرے ریلے پھل کا رس بھی دہی میں شامل کر سکتے ہیں۔

☆.....

☆ دانوں کو صاف کرتا ہے۔ P/auque کو صاف کرتا ہے۔ کینسر کے خلیوں کو متحرک نہیں ہونے دیتا۔ نیم کے اندر Antioxidents 400 ہوتے ہیں۔ جو جسم سے ریڈیکل کا اخراج کرتے ہیں۔ ریڈیکل وہ عناصر ہوتے ہیں جو اعضا کو تباہ ہونے سے روکتے ہیں۔

☆ بالوں کو لمبا، گھنا، صحت مند اور چمکدار کرتا ہے۔

دہی کے فوائد

دہی اور لسی دیہاتوں کی سب سے زیادہ مقبول غذا ہے اور اس کا درست استعمال نہ صرف کھانے پینے بلکہ خوبصورتی کے لئے بھی اہم ہے۔ دہی کے استعمال سے چہرے پر شادابی اور خوبصورتی پیدا ہوتی ہے۔ ترکہ باشماروں کے سرخی مائل چہروں کا راز بھی دہی کا زیادہ استعمال بتایا جاتا ہے۔ دہی ایک حیرت انگیز کلینزر ہے۔ دہی کا استعمال کیا جاتا ہے اور سر کی جلد کو صحت مند رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ ماہرین جلد کا کہنا ہے کہ دہی کے اندر قدرتی حسن کو برقرار رکھنے کی بے شمار خصوصیات ہوتی ہیں، کیونکہ اس میں موجود عنصر جلد کو پیچ کرنے میں مددگار ہوتا ہے دہی کو جلد پر لگا کر کچھ دیر کے لئے چھوڑ دیں اور ہلکے گرم پانی سے چہرے کو دھو لیں جو آپ کو نہ صرف نکھرا نکھرا بنا دے گا بلکہ چہرے پر موجود دانوں کو بھی ختم کر دے گا۔

بہترین فوائد کے لیے روزانہ چہرے پر دہی لگانے سے جلد کی چمک بحال ہوتی ہے۔ دہی میں شامل زنک تمام قسم کے جراثیم چہرے سے صاف کر کے اسے خوبصورت بناتی ہے مگر دہی لگانے